تصوف

سائنس اور اقبال

ادریس آزاد

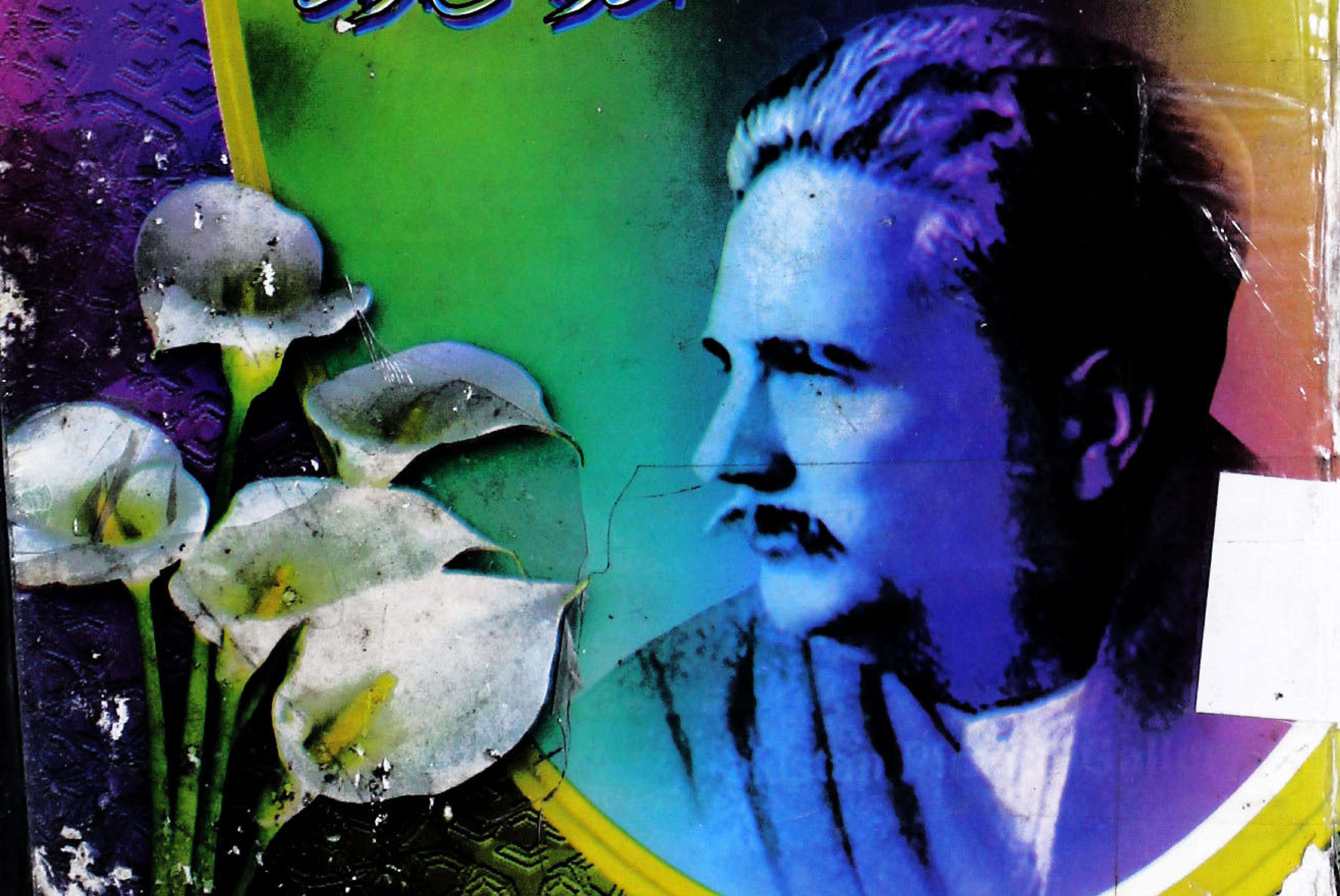

ملنے کے پتے

مکتبہ رحمانیہ اقرأ سنٹر، اردو بازار، لاہور 7355743
مکتبہ العلم ۱۷، اردو بازار لاہور 7211788
اسلامی کتب خانہ، فضل الٰہی مارکیٹ لاہور 7223506
مشتاق بک کارنر لاہور 7230350
علم و عرفان پبلی کیشنز لاہور 7232336
منیر برادرز، مین بازار جہلم، سعید بک بنک اسلام آباد
احمد بک کارپوریشن، اقبال روڈ، راولپنڈی
بنگش بک ڈپو، اردو بازار، سیالکوٹ
چوہدری بک ڈپو، مین بازار، دینہ
ضیاء القرآن پبلشرز، گنج بخش روڈ، لاہور
کتاب گھر، علامہ اقبال روڈ راولپنڈی
نیو الیاس کتب محل کچہری بازار، جڑانوالہ
ادریس کتاب محل، مین بازار، منڈی سمبڑیال
عمر بک سنٹر جی ٹی روڈ سرائے عالمگیر 653057
چغتائی بک ڈپو دھڈیال آزاد کشمیر اتفاق بک ڈپو بھلوال
کوالٹی ڈیپارٹمنٹل سٹور کالج روڈ بوریوالا 3355889
شاہین بک ہاؤس منڈی بہاؤالدین
بختار سنز قصہ خوانی بازار، پشاور، بلال بک ڈپو، گجرات
الفضل کتاب گھر میر پور آزاد کشمیر
مسٹر بکس سپر مارکیٹ اسلام آباد 2278843-5
جہانگیر بک ڈپو لاہور 042-7220897
سعد پبلی کیشنز 1st فلور میاں مارکیٹ لاہور 7122943
مسلم بک لینڈ، بینک روڈ، مظفر آباد
یونائیٹڈ بک ہاؤس کچہری روڈ منڈی بہاؤالدین
نیو وہاڑی کتاب گھر جناح روڈ، وہاڑی 62310
الکریم نیوز ایجنسی گول چوک، اوکاڑہ
شائلہ بک ایجنسی، محلہ چوہدری پارک ٹوبہ ٹیک سنگھ
ڈار برادرز تحصیل بازار، جہلم، فضلی سنز اردو بازار کراچی
کھوکھر بک سٹال مسلم بازار، گجرات
مکتبہ رشیدیہ چکوال

بلال کاپی ہاؤس لیاقت روڈ میاں چنوں 662650
میاں ندیم، مین بازار، جہلم 0544-621126
دار الادب تلمبہ روڈ میاں چنوں، الرحمت سٹیشنری ڈسکہ
اشرف بک ایجنسی، کمیٹی چوک، راولپنڈی
شمع بک ایجنسی، فیصل آباد، رضا لائبریری شاہ کوٹ
ہاشمی برادرز کتب ورلڈ گوردت سنگھ روڈ، کوئٹہ
الیاس بک ڈپو جلال پور جٹاں، کاروان بک سنٹر بہاولپور
الاخوان القادری، مسندی کارنر اندرون بوہڑ گیٹ ملتان
اسلامی کتب خانہ حافظ آباد، خان بک ڈپو حافظ آباد
نظامی کتب خانہ پاکپتن شریف، شکیل بک ڈپو سمندری
خالد کتاب محل اوگرگی، سیالکوٹ روڈ
لاثانی لائبریری ربوہ، زمان لائبریری ربوہ
سلیمی بک ڈپو، احمد پور شرقیہ، جالندھر بک ڈپو ڈسکہ
بک ٹاؤن F-10 مرکز اسلام آباد 2299604
پاکستان بک ڈپو مین بازار جلال پور جٹاں
کارنر سٹیشنری مارٹ مین بازار کھاریاں 510274
کتاب نگر حسن آرکیڈ ملتان کینٹ 061-510444
صابر بک سٹال نسبت روڈ لاہور، 7230780
کارواں بک سنٹر، ملتان کینٹ
گل قریش پبلی کیشنز، لاہور 7320318
علمی بک ہاؤس لاہور
عزیز سٹیشنری مارٹ مین بازار کھاریاں
کتاب سرائے، الحمد مارکیٹ اردو بازار، لاہور
سلطان بک پیلس گجرات، پنجاب بک ڈپو بہر کلر روڈ گجرات
حافظ بک ایجنسی اقبال روڈ، سیالکوٹ
وارث سنز بک ڈپو صرافہ بازار پنڈ دادن خان
(جہلم) 0344-210338
کاروان بک سنٹر بہاولپور۔ زمان لائبریری ربوہ
مکہ بک سنٹر جلالپور جٹاں۔ مکتبہ کشمیر لالہ موسیٰ

Marfat.com

تصوف، سائنس

اور

اقبالؒ

ادریس آزاد

11/3-1665/2

خزینۂ علم و ادب
الکریم مارکیٹ اُردو بازار لاہور
فون: 7211468-7314169

Marfat.com

297.6
ت 32 و
69876

نام کتاب : تصوف سائنس اور اقبال

مؤلف : ادریس آزاد

ناشر : خزینہ علم و ادب

طابع : نذیر محمد

مطبع : افضل شریف پرنٹرز

انتساب:

میں اِس کتاب کا انتساب آقائے نامدار، سید الکونین محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کرتا ہوں---- جنھوں نے شرفِ معراج پایا اور ''مقامِ محمود'' کے مستحق قرار دیے گئے۔

کوئی سالک، کوئی صوفی، کوئی نبی---- اِس سے آگے نہیں جا سکتا۔ جو کوئی بھی مشاہدۂ حق کا طالب ہے، اُسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر ہی چلنا ہوگا۔ اِس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

چنانچہ میں اپنے ''خدا'' سے یہی دعا مانگتا ہوں:-

محمدؐ کی مجھے قربت عطا کر　　مدینے پاک میں تربت عطا کر

اگر دولت سے گھٹتی ہے محبت　　تو پھر مولا! مجھے غربت عطا کر

اور دربارِ رسالتؐ میں جھولی پھیلا کر یہ استدعا کرتا ہوں کہ:-

مری زبان میں تاثیر چھوڑ دے اپنی

میں کوئی بات نہ کر پاؤں تیری بات کے بعد

Marfat.com

''میرے خیال میں یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ قرآن و احادیث صحیحہ میں صوفیانہ نظریہ کی طرف اشارات موجود تھے لیکن وہ عربوں کی خالص عملی ذہانت کی وجہ سے نشو ونما پا کر بار آور نہ ہو سکے۔ جب ان کو ممالکِ غیر میں موزوں حالات میسر آ گئے تو وہ ایک جداگانہ نظریہ کی صورت جلوہ گر ہوئے۔''

علامہ اقبال---''فلسفہ عجم''

Marfat.com

فہرست مضامین

باب ۱	تصوف کا آغاز	۹
	۱- مذاہب عالم کا تصورِ خدا	۹
	۲- اسلام میں تصوف کا آغاز	۲۹
	۳- علامہ اقبالؒ کا مقالہ	۴۶
	۴- تصوف کا ماخذ اور قرآن سے جواز	۶۷
	۵- حقیقت بہ حیثیت نور	۷۷
	۶- وجودیات	۸۳
	۷- کونیات	۸۶
	۹- نفسیات	۹۱
	۱۰ حقیقت بہ حیثیت فکر	۹۹
باب ۲	تصوف اور نظریۂ ارتقاء	۱۱۵
	۱- عقیدہ وحدت الوجود	۱۱۵
	۲- آخرت کا تصور	۱۳۷
	۳- جدید نظریۂ ارتقاء	۱۴۷
	۴- ارتقاء پر کارل ساگان کا دلچسپ تبصرہ	۱۵۹
	۵- نظریۂ ارتقاء پر سیر حاصل گفتگو	۱۹۰
	۶- اسلامی نظریۂ ارتقاء	۲۷۴
	۷- منصور حلاج کا آخری بیان	۳۰۱

Marfat.com

باب۳	**علم الٰہیات اور خدا**	۳۰۵
	۱۔ اشیائے مادی کا فہمِ حقیقی	۳۰۵
	۲۔ مشاہدہ ہے کس حساب میں	۳۲۵
	۳۔ کیا ہئیت ہی خدا ہے؟	۳۳۵
باب۴	**تصوف اور جدید طبیعات**	۳۵۰
	۱۔ آئین سٹائن کا نظریۂ اضافیت	۳۵۰
باب۵	**فزکس اور میٹافزکس**	۳۸۸
	۱۔ ماہیت اشیاء	۴۰۹
	۲۔ نظریۂ کا اثر	۴۱۰
	۳۔ نظریہ کی اہمیت	۴۱۳
	۴۔ مختصر تاریخ	۴۱۵
	۵۔ نظریہ کی کیفیت	۴۱۶
	۶۔ تمثیل	۴۱۷
	۷۔ وقت بُعدِ رابع	۴۱۹
	۸۔ اختتامیہ	۴۲۳

Marfat.com

باب: ۱

تصوف کا ارتقاء

''مذاہب عالم کا تصور خدا''

دنیا کے تمام مذاہب کا..... مقصد ایک ہی ہے۔ اور وہ ہے تصور خدا کی تخلیص۔ انسان اب تک یہی کرتا آیا ہے۔ کرۂ زمین کی پوری داستان یہی ثابت کرتی ہے کہ انسان نے بتدریج اپنے تصور خدا کو خالص (Purify) کرنے کی کوشش کی۔ زمانۂ قدیم میں انسان کے ذہن میں اپنے خدا کا جو تصور تھا وہ بری طرح آلودہ اور کثیف تھا۔ اس میں مٹی، پتھر، دیگر مادوں اور عجیب وغریب چیزوں کی آویزش تھی۔ مذہب کی نظریاتی زبان میں اس دور کو ''تجسیم پرستی'' کہا جاتا ہے۔ اور اسی مناسبت سے توحید کے ضمن میں دو اصطلاحیں استعمال کی جاتی ہیں۔

(۱) توحید تجسیمی

(۲) توحید تنزیہی

دنیا بھر میں جتنے مذاہب ہیں۔ سب تاریخ وار ترتیب کے ساتھ کرۂ زمین پر ظاہر ہوئے۔ ان کی اسی زمانی ترتیب کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ جب زمین کے دوسرے خطوں میں ابھی انسانی شعور نے آنکھ نہیں کھولی تھی، برصغیر میں ''برہما'' کا ظہور ہوا۔ میں ذاتی طور پر ''برہما'' آدم کو سمجھتا ہوں۔ اور ''برہما واد'' کے نظریات سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ لیکن مشہور دیوبندی مورّخ ''سید محمد میاںؒ'' لفظ برہما کی بناوٹ

Marfat.com

دیکھتے ہوئے یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ برہما غالباً ''ابراھیمؑ'' تھے۔ برہما جو کوئی بھی تھے سچ یہ ہے کہ مذہب کا آغاز انہی سے ہوا۔ خط استواء سے مناسب فاصلے پر ہونے کی وجہ سے ہندوستان کا موسم معتدل تھا۔ چنانچہ سائنسدان اس بات پر متفق ہیں کہ اول اول انسان کی شعوری زندگی ہندوستان میں ہی شروع ہوئی۔ آدمؑ سے متعلق بھی تمام مذہبی محققین کی یہی رائے ہے کہ آدمؑ کا ظہور ہندوستان کے پڑوس یعنی ''سری لنکا'' میں ہوا۔ الغرض پہلا مذہب ہندوستان کے علاقے مین نمودار ہوا اور پھر بڑی ٹھیک ٹھیک زمانی ترتیب کے ساتھ دیگر مذاہب ظہور پذیر ہوتے چلے گئے۔ ہندوستان کے بعد ایرانی مذاہب، پھر مغربی ایشیاء میں بنی اسرائیل کا ظہور.......... اسی ترتیب سے عیسائیت اور پھر اسلام کا ظہور ہوا۔ یہ ایک آسانی کے ساتھ سمجھ میں آنے والی زمانی ترتیب ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ انسان نے اپنے مختلف تہذیبی ادوار میں مختلف نگاہوں سے خدا کو دیکھنے کی کوشش کی۔ مذہب کی فطرت میں عمل تخلیص پایا جاتا ہے۔ جوں جوں انسانی شعور ترقی کرتا چلا گیا، وہ اپنے خدا کو مختلف آلودگیوں اور کثافتوں سے پاک دیکھتا چلا گیا۔ یہ سب کچھ خودکار طریقے سے ہوا۔ ایسے خودکار طریقے سے کہ اب، جب ہم اس پر غور کرتے ہیں تو دنگ رہ جاتے ہیں۔ اس دوران ایک محکمہ ہمیشہ موجود رہا۔ جس کے ذمہ تھا اپنے وقت کے تصور خدا پر کڑی تنقید کرنا تاکہ تصور خدا میں ارتقا کا عمل جاری رہ سکے۔ یہ فلاسفہ تھے۔ لیکن اصل ذمہ داری مذہب پیش کرنے والوں کے سپرد تھی۔ یہ انبیاءؑ تھے۔ انبیاءؑ جب تک زندہ رہتے انسانوں کو حقیقی خدا کا تصور سمجھانے کے لیے طرح طرح کی مثالوں سے کام لیتے۔ انبیاءؑ خود حقیقی خدا کا صحیح تصور رکھتے تھے لیکن ان کی ذہنی سطح (فریکوئنسی) اپنے عوام کی سطح سے بہت بلند ہوتی تھی۔ عام عوام ابھی پختگیِ شعور کے ابتدائی مراحل میں تھی۔ فلسفیوں کی طرح انبیاءؑ بحث نہ کیا کرتے تھے۔

Marfat.com

نہ ہی سوال اٹھایا کرتے اور نہ ہی کڑی تنقید ان کا شیوہ ہوتی۔ وہ تو خالص ترین خدا کا حقیقی تصور سمجھانے کے لیے عوام کو طرح طرح کی مثالیں دیتے۔ صدیوں پر صدیاں گزرتی چلی گئیں اور انسانی تاریخ کا سلسلہ یونہی آگے بڑھتا رہا۔ تمام انسانوں کی سمجھ میں خدا کا خالص ترین تصور کیسے آئے گا؟ یہ وہ پریشانی تھی جو ہمیشہ انبیاءؑ کو لاحق رہی۔ لیکن فلسفیوں کو یہ پریشانی لاحق نہیں تھی کہ عام عوام خدا کو کیسے پہچانیں گے۔ البتہ ان کا فریضہ بھی بہت اہم تھا۔ ان کی ذمہ داری تھی کہ وہ عوام کے دلوں میں موجود آلودہ اور کثیف تصور خدا پر کڑی تنقید کرتے رہیں۔ تاکہ ایسے لوگ جو سمجھدار ہوں وہ تجسیمی تصورات سے چھٹکارا پا کر توحید تنزیہی کی طرف مائل ہوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے بعد زمین پر نئے مذاہب پیدا ہونے کا سلسلہ مکمل طور پر ختم کر دیا گیا۔ اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی آخر الزماں اور آپؐ کے پیش کردہ مذہب کو آخری دین اور اسلام کہا جانے لگا۔ چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بالآخر عامۃ الناس کے سامنے خدا کا خالص ترین تصور پیش کر دیا گیا۔ قرآن حکیم نے تمام انسانوں سے مخاطب ہو کر کہا:۔

قل ھو اللہ ھو احد ٥ اللہ الصّمد ٥ لم یلد ولم یولد ٥ ولم یکن لہ کُفواً احد٥

یہ تھا خدا کا خالص ترین تصور۔ یوں گویا تصور خدا کا عمل تطہیر مکمل ہوا۔ خدا کا خالص ترین تصور تو پیش کر دیا گیا، لیکن زمین پر انسانوں کی تعداد لاکھوں، کروڑوں بلکہ اربوں میں تھی۔ چنانچہ لازمی امر تھا کہ تصور خدا کی تخلیص کا یہ عمل عام انسانی سطح پر باقی رکھا جاتا۔ تاوقتیکہ ہر انسان کے ذہن سے خدا کی آلودگیاں اور کثافتیں نکل جاتیں اور وہ اپنے خدا کو اپنے سامنے ایک ''سبحان'' ہستی کی شکل میں دیکھ لیتا، سو یہی ہوا۔ قرآن حکیم کی آمد سے پہلے پہلے تک عامۃ الناس کا ذہن شفاف کرنے کا کوئی معقول طریقہ

Marfat.com

موجود نہیں تھا۔ چنانچہ تصور خدا کے عمل تطہیر کی رفتار سست رہی۔ قرآن حکیم نے تمام انسانوں کو براہ راست پکارا:

''یا ایھا الناس .... اے انسانو!''

قرآن کے پکارنے کی دیر تھی کہ عمل تطہیر کی رفتار کو پر لگ گئے۔ مشرق و مغرب کے بے شمار انسانوں نے اس پکار پر لبیک کہی اور قرآن کریم کے طریقوں کو اختیار کر کے اپنے اپنے تصور خدا کی تطہیر شروع کر دی۔ یہاں تک کہ جدید دور کی جدید سائنس نے بھی بالآخر یہ تسلیم کر لیا کہ ہر انسان کے لیے اس کے خدا کے تصور کی پاکیزگی ضروری ہے۔

خدا آلودہ نہیں، نہ ہی وہ کثیف ہے۔ وہ تو پاک، صاف اور شفاف ہے۔ آلودگی یا کثافت ہماری نظر میں ہے۔ اس نظر میں جس سے ہم اپنے خدا کو دیکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے اپنے الگ الگ خدا ہیں کیونکہ ہمیں وہ بہت سی مادی چیزوں کے ساتھ گھلے ملے دکھائی دیتے ہیں۔ سونا، چاندی، پتھر، گارا..... گھر بار، مال، اولاد، پیشہ، مویشی، کھیت، کھلیان اور باغات۔ ان سب کثافتوں نے ہمارے دلوں میں بت خانے قائم کر رکھے ہیں۔ اب کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اب ہمیں قرآن کریم کی روشنی میں خود اپنے تصور خدا کو شفاف کرنا ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم تصور خدا کی ماہیت پر گفتگو کریں۔ ہمیں فلسفے کے ایک سوال کا جواب دینا ہوگا۔ فلسفے کا ایک مشہور سوال ہے کہ خدا کا تصور کیوں ضروری ہے؟ فلسفے کی ہر کتاب اسی سوال پر مشتمل ہوتی ہے۔ گزشتہ تین ہزار سالہ علمی تاریخ میں اس سوال کے جتنے جواب دیے گئے ہیں ان سب کو جمع کر کے تین دلیلوں (ادلۂ ثلاثہ) میں بند کر دیا گیا ہے اور وہ ہیں۔

Marfat.com

(۱) دلیل غائی

(۲) دلیل کونی

(۳) دلیل وجودی

زیر نظر کتاب فلسفے کی نہیں چنانچہ ہم ادلہٴ ثلاثہ کی تفصیل نہیں لکھیں گے۔ البتہ...... جہاں تک مسلمان فلسفیوں خصوصاً علامہ اقبالؒ کا تعلق ہے تو ان کو...... ان تینوں دلائل میں سے دلیل وجودی قدرے زیادہ پسند تھی۔ دلیل وجودی کی رو سے خالص خدا کو تصور میں لانا اس لیے ضروری ہے کہ یہ تصور ہمارے ذہنوں میں ازل سے موجود ہے۔ ہر انسان کے ذہن میں اس کے اپنے خدا کا تصور موجود ہے۔ آخر کیوں؟ ایسا کیوں ہے؟ ہر شخص کسی نہ کسی خدا کو کیوں مانتا ہے؟ چونکہ ہر بشر کے ذہن میں خدا کے وجود کا کوئی نہ کوئی تصور ہے۔ اور ازل سے ایسا ہی ہے لہٰذا ثابت ہوا کہ خدا ہے۔ یہ ہے دلیل وجودی۔ دوسرے دلائل کے ساتھ اس دلیل پر بھی علامہ اقبالؒ نے اعتراض کیا ہے لیکن یہ اعتراض انہوں نے خود سے قائم نہیں کیا بلکہ اس دلیل پر اعتراض کرتے ہوئے علامہؒ نے جرمنی کے مشہور فلسفی ''کانٹ'' (Kant) کی تائید کی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے لکھا ہے:۔

> ''یہ دلیل بھی ایک حد تک دلیل کونی سے مشابہ ہے۔ جس سے ہم اوپر بحث کر آئے ہیں۔ کیونکہ اس دلیل کو جس رنگ میں بھی پیش کیا جائے اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کسی شے کی ہستی کا تصور اس کے وجود فی الخارج کا ثبوت ہے۔ جیسا کہ کانٹ نے اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ تین سو ڈالر کے تصور سے یہ ماننا کہاں لازم آتا ہے کہ تین سو ڈالر فی الواقعہ میری جیب میں

موجود ہیں۔ اس دلیل سے کچھ ثابت ہوتا ہے تو یہ کہ ایک ہستیِ کامل کے تصور میں اس کے وجود کا تصور بھی شامل ہے۔ لیکن اس ہستی کے تصور اور اسؐ کے وجود فی الخارج میں جو فصل رہ جاتا ہے اسؐ کو دور کرنے کی یہ صورت نہیں کہ فکر اپنی حدود سے تجاوز کر جائے۔ دراصل یہ دلیل وہ مغالطہ ہے جسے منطق کی زبان میں مصادرہ علی مطلوب کہا جاتا ہے۔ اور جس میں ہم اس دعویٰ کو جسے ثابت کرنا مقصود ہوتا ہے، پہلے ہی سے ثابت شدہ تسلیم کر لیتے اور یوں منطق کو حقیقی ٹھہراتے ہیں۔ لہٰذا دلیل غائی اور وجودی سے بھی جیسا کہ بالعموم ان سے استدلال کیا جاتا ہے، کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہوتا۔''

علامہ اقبالؒ نے کانٹ کی تنقید کو دھرایا۔ جبکہ ایک سیدھی اور سامنے کی بات نہ جانے کیوں آپ کی عقابی نظروں سے پوشیدہ رہی۔ بات یہ ہے کہ خدا کے تصور کی دلیل وجودی کی ساخت کا تقاضا ہی یہ ہے کہ تصور خدا ہر انسان کے ذہن میں ازل سے موجود ہے۔ یہ فرد واحد کا تصور نہیں جیسا کہ ''کانٹ'' نے اپنے ذاتی تصور کی مثال دی۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر زمین کے تمام انسانوں کے ذہن میں ازل سے یہ تصور ہوتا کہ جرمن فلسفی کانٹ کی جیب میں تین سو ڈالر ہیں تو یقیناً کانٹ کی جیب سے تین سو ڈالر برآمد ہوتے۔ ایک ایسے تصور کو جو ہر انسان کے ذہن میں فطری طور پر موجود ہوتا ہے، کانٹ کی جیب کے تین سو ڈالروں کی مثال سے رد نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تو اصول منطق کے بھی خلاف ہے۔ منطق کا اصولِ کلی ہے کہ مقدمہ کبریٰ میں موجود غیر جامع حد، نتیجہ میں جامع نہیں لی جا سکتی۔ کانٹ یک جزو ہے جبکہ تصور خدا ''تمام'' انسانوں کے ذہن

Marfat.com

میں ہے۔ جزو سے کل کو رد نہیں کیا جا سکتا' کل سے جزو کو رد کیا جا سکتا ہے۔ دوسرا اعتراض علامہ صاحبؒ نے یہ قائم کیا کہ دلیل وجودی کو مصادرۂ مطلوب کہا۔ حالانکہ مصادرۂ مطلوب کی یہ خاصیت ہے کہ اس میں کسی بھی تصور کا وجود فرض کرنے کے لیے ارادے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مصادرۂ مطلوب اختیار کرنے والا ارادتاً ایسا کرتا ہے۔ جبکہ تمام انسانوں کے ذہن میں خدا کا تصور ازل سے موجود ہے، اور ابد تک رہے گا۔ اور یہ تصور ہمیشہ غیر ارادی ہی رہا ہے۔ عام انسان منطقی نہیں ہیں کہ ہم انہیں مصادرۂ مطلوب کا شکار قرار دیں۔ میری دانست میں دلیل وجودی کا رد ممکن نہیں۔ چنانچہ یہ سوال کہ خالص خدا کا تصور کیوں لازمی ہے، صرف دلیل وجودی کی مدد سے ہی حل کیا جا سکتا ہے اور اس کا جواب یہ ہے کہ خالص خدا کا تصور اس لیے لازمی ہے...... کیونکہ ہر انسان کے دل میں خدا کا کوئی نہ کوئی تصور موجود ہوتا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ انسانی ذہن میں موجود خدا کے تصور کو خالص اور شفاف کرنے کی کوشش جاری رکھی جائے۔ یہ کام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد تک انبیاءؑ کو سونپا جاتا تھا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد عالم اور باعمل صوفیاء کو سونپ دیا گیا۔ جنہیں ہم اہل تصوف کہہ کر پکارتے ہیں۔

اب ہم تصور خدا کی ماہیت پر تاریخی ترتیب سے نظر ڈالتے ہیں۔ جب ہم ماضی بعید میں کسی پہلے باشعور انسان کا کھوج لگاتے ہیں تو ہمیں تمام تر معلوم تاریخ سے ایک ایسی ہستی کا پتا چلتا ہے جس کا تصور خدا خالص ترین تھا۔ یہ دیکھ کر تاریخ کا طالب علم چونک اٹھتا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ انسان، شعور کے آغاز میں تصور خدا کے حوالے سے ناپختہ ہوتا اور اس کے ذہن میں کثیف ترین خدا کا تصور پایا جاتا۔ لیکن آدمؑ یا برہما جی کے عقائد پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ خالص توحید تنزیہی سے واقف تھے۔ اسی

Marfat.com

بات سے پتا چلتا ہے کہ آپ اللہ کے پہلے نبی تھے۔ دراصل ایک چھوٹی سی غلط فہمی ہمیں بعض بڑے بڑے حقائق سمجھنے سے محروم کر دیتی ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ زمین پر موجود دو پاؤں پر چلنے والے تمام حیوانات انسان ہیں اور تمام آدم اور حوا کی اولاد ہیں۔ ایسا نہیں ہے مذہب، سائنس اور تاریخ، تینوں سے ثابت ہے کہ جس وقت آدم اور ان کی بیوی ''حوا'' باغ عدن سے چل کر اپنی تمدنی زندگی کا آغاز کرنے کے لیے زمین پر آئے تو اس وقت دو پاؤں پر چلنے والے، انسانوں جیسی شکل کے مالک لاکھوں حیوانات زمین کے ہر خطے پر موجود تھے۔ مثلاً خط استواء پر بسنے والے حبشی قبائل، جنوبی اور شمالی امریکہ میں موجود برہنہ وحشی دو پائے وغیرہ۔ ان دو پایوں کو قرآن حکیم نے ...... یمشی علی رجلین ...... ''دو پاؤں پر چلنے والے'' کہہ کر پکارا ہے۔ آدم کی اولاد بے شک دور دور تک پھیلی اور آپ کے بیٹوں کے ناموں سے کئی بڑی اقوام کا آغاز ہوا لیکن ہر کہیں دو پاؤں پر چلنے والے ان کے ہم شکل حیوانات اور ان کی اولادیں بھی موجود رہیں۔ بائبل میں لکھا ہے کہ وہ جنت زمین پر ہی تھی جس میں سے آدم اور حوا ہجرت کر کے آئے۔ بائبل میں یہ بھی لکھا ہے کہ جنت سے نکلنے والی نہریں دریائے فرات، دریائے جیحون وغیرہ ہیں۔ بالکل اسی طرح کی بات ہندو بھی کہتے ہیں کہ دریائے گنگا اور جمنا سورگ سے آئے ہیں۔ اور بائبل میں یہ بھی لکھا ہے کہ آدم اور حوا نے نیکی اور بدی کی پہچان ...... یعنی شعور کے درخت کا پھل کھا لیا تھا۔ قرآن حکیم نے تو پوری کہانی ہی واضح کر دی' جب یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں زمین کا خلیفہ بنا دیا ہے۔ اس مضمون کی مزید وضاحت آئندہ صفحات میں دیکھی جا سکتی ہے۔ چنانچہ مذہب کے بعد ہمیں تاریخ اور سائنس سے دریافت کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔

تاریخ، علم عبر و بصائر کا دوسرا نام ہے۔ ہم زمین پر قدیم ترین خزانوں کے

Marfat.com

کھنڈرات دیکھتے ہیں۔ پتھروں کے مجسمے، پتھروں میں کندہ عبارتیں آگ میں پکی ہوئی مٹی کی تختیاں اور بیل کی بڑی بڑی کھالوں پر ''خط میخی'' اور ''ھیروغلفی'' میں لکھی ہوئی باتوں سے تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ اس سے ماقبل کا زمانہ، زمانۂ قبل از تاریخ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ زمانۂ قبل از تاریخ کا کھوج پہاڑی غاروں، چٹانوں، ترشے ہوئے پتھروں، ڈھانچوں، ہڈیوں اور فاسلز کی مدد سے لگایا جاتا ہے۔ ان سب حقائق کو ملا کر تاریخ نگار اپنی عبارتیں رقم کرتا ہے۔ اور تاریخ نے یہی لکھا ہے کہ زمین پر قدیم ترین مذہب ہندوستان کا ''برہما واد'' ہے۔ بائبل بھی ایک تاریخی دستاویز کا درجہ رکھتی ہے۔ بائبل میں بھی یہی لکھا ہے کہ مذہب کا آغاز آدمؑ سے ہوا۔ جبکہ ہم یہ جان کر حیران رہ جاتے ہیں کہ آدمؑ...... خدا کے خالص تصور سے آگاہ تھے۔

سائنسی اعتبار سے ہمیں اس کا ثبوت یوں ملتا ہے کہ ہم، علم جغرافیہ، علم ارضیات اور خاص طور پر علم حیاتیات کی مدد سے انسانی آبادیوں کا اچھی طرح جائزہ لیتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ زندگی کیلئے حرارت کی ضرورت ہے۔ برف کے علاقوں میں انسان کی پیدائش اور زندگی کا باقی رہنا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ لامحالہ خط استواء کے آس پاس کے تمام خشک ٹکڑے زندگی سے لبریز ہو گئے۔ جہاں پانی کے چشموں ندی نالوں اور دریاؤں کی کثرت تھی۔ جہاں وسیع سبزہ زار اور انواع واقسام کے پھلوں سے لدے لاکھوں گھنے پیڑ تھے۔ جہاں خوش رنگ مویشی سبزہ زاروں میں قلانچیں بھرتے اور رنگا رنگ کے خوش آواز پرندے شاخ در شاخ چہچہاتے پھرتے۔ زندگی کو آگے بڑھنے کے لیے کسی ایسے ہی معتدل ماحول کی ضرورت تھی۔ جہاں برف سے ڈھکے پہاڑ نہ ہوں۔ بلکہ آئے روز کی شفاف بارش میں نہاتے سبزہ زار ہوں۔ چنانچہ سائنس کا یہ کہنا ہے کہ ایسی زندگی کے لیے...... زمین پر گرین بیلٹ کا یہی حصہ جہاں اب ہندوستان واقع ہے،

مناسب ترین تھا۔

آدمؑ نے خالص خدا کا تصور پیش کیا تو آپؑ کا علم آپؑ کی اولاد میں منتقل ہونا شروع ہو گیا۔ لیکن آپ کے گردونواح میں آباد ایسے دو پائے جن کی کھوپڑیاں شعور کی دولت سے خالی تھیں، آپؑ کے اور آپؑ کی اولاد کے دشمن ہو گئے۔ چنانچہ آدم کی اولاد اپنے علم اور شعور کی روشنی کی وجہ سے اپنے باقی ہم شکلوں کے مقابلے میں ممتاز ہو گئی۔ آدمؑ کی یہی اولاد آگے چل کر ''بنی اسرائیل'' اور ''بنی اسماعیل'' کے ناموں سے موسوم ہوئی لیکن اس سے بھی پہلے اُنہیں سامی، حامی یا آریائی کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ آدمؑ یا برہما نے خالص توحید کا تصور پیش کیا تھا۔ لیکن ناپختہ شعور کے مالک انسانوں نے ایسے خدا کو ماننے سے انکار کر دیا۔

خوگر پیکر محسوس تھی انساں کی نظر
مانتا پھر کوئی ان دیکھے خدا کو کیونکر

عام لوگوں کا شعور اتنا پختہ نہیں تھا کہ وہ اپنے ذہن میں خالص خدا کا تصور لا سکتے۔ لہٰذا انہوں نے خدا کو دیکھنے کی خواہش شروع کر دی۔ ہم جس قوم کی لکھی ہوئی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں، ہمیں یہی ثبوت ملتے ہیں۔ یونانیوں نے ''پرومیتھوس'' کے بارے میں یہی عقیدہ قائم کیا کہ اس نے سب سے پہلے انسان کو آگ کا راز بتایا تو زیوس نے اُسے ویران پہاڑوں میں قید کر دیا۔ یہ آتش نہ تھی الوہیت کا مظہر تھی۔ ایرانیوں نے یہی عقیدہ (ہوشنگ) کے بارے میں قائم کیا۔ اسی طرح کی روایات ہندوؤں کی قدیم ویدوں میں بھی جا بجا ملتی ہیں۔ انسان نے خدا کو دیکھنے کی طلب کی تو ان کی یہ طلب بے جا نہ تھی۔ کیونکہ ابھی انسانی شعور اپنے ابتدائی مرحلے میں تھا اور انسان کا ذہن صرف اس چیز پر یقین کر سکتا تھا جو اسے اپنی آنکھوں کے سامنے نظر آتی۔

چنانچہ اس وقت کے انسانوں نے آگ کو خدا کہنا شروع کر دیا۔ شروع شروع میں خدا کے برگزیدہ انسانوں اور خدا کے اوتاروں نے ہی آگ کو وحدت کی ایک علامت کے طور پر پیش کیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس کسی نے بھی سب سے پہلے آگ کو خدا کی علامت قرار دیا وہ کوئی بہت بڑا دانا شخص یا کوئی نبی ہی تھا کیونکہ آگ ہی وہ محسوس مظہر فطرت ہے جسے اُس زمانے میں خدا کی مثال کے طور پر ناپختہ شعور کے سامنے رکھا جا سکتا تھا۔ خدا کی کوئی مثال نہیں۔ قرآن حکیم کی آیت ہے:۔

لیس کمثلہ شئی .... اس کی مثال کوئی شے نہیں۔"

لیکن یہ آیت تو اس وقت نازل ہوئی جب انسانی ذہن میں تصور خدا کی شفافیت کا عمل مکمل کیا جا رہا تھا۔ تصور خدا تمام آلودگیوں اور کثافتوں سے پاک ہو کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی عام انسانوں کے سامنے پیش کر دیا گیا تو اس کے بعد یہ کہہ دیا گیا......... الیوم اکملت لکم دینکم ۔ ترجمہ: آج کے دن میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا۔

لیکن ابتدائے شعور میں آگ کے شعلے کو خدا کی مثال کے طور پر پیش کرنے والے شخص کی دانائی اور مرتبے کو شک کی نگاہ سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ آگ ہی وہ چیز ہے جو زمین کے کسی بھی خطے پر جلائی جائے ہمیشہ ایک جیسی ہی جلتی ہے۔ اس کا شعلہ مادی وجود کا حامل نہیں۔ اور سائنس اس بات پر متفق ہے کہ آگ کا شعلہ نہ تو ٹھوس ہے، نہ مائع اور نہ گیس۔ سائنسدان اسے "پلازمہ" کہتے ہیں۔ لیکن وہ "خود نہیں جانتے کہ پلازمہ کیا ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کے پاس شعلۂ آتش کے سوا پلازمہ کی اور کوئی مثال موجود نہیں۔ آگ کا شعلہ بھڑکتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے وہ کوئی زندہ چیز ہے۔ اس کی حرکت اور لپک آج بھی انسان کو حیران کر دیتی ہے۔ اور پھر جب ختم ہوتا ہے۔ تو یوں

Marfat.com

غائب ہو جاتا ہے جیسے وہ کوئی مافوق الفطرت ہستی تھا۔ اس کے وجود کا کوئی حصہ بھی پیچھے باقی نہیں رہتا۔ پرانے لوگوں نے دیکھا کہ آگ کا شعلہ اچانک ظاہر ہوتا ہے اور جس چیز پر ظاہر ہوتا ہے بالآخر اس چیز کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ شعلہ ختم ہونے کے بعد، پیچھے رہ جانے والی راکھ وہ کثافت اور آلودگی تھی جو حقیقی خدا کے وجود پر طاری تھی۔ جب کوئی چیز آگ سے جل جاتی تو وہ سوچتے کہ خدا نے اس چیز کو قبول کر لیا ہے۔ ہندوستان میں چیزوں کو جلایا جانے لگا۔ گھوڑے انسان، قیمتی اشیاء اور غلے کے بڑے بڑے ڈھیر محض یہ سوچ کر آگ کی نظر کر دیے جاتے کہ اگر خدا نے انہیں قبول کر لیا تو وہ قہر خداوندی سے محفوظ رہیں گے۔ ہندی زبان میں ''یگیا'' اس عبادت کو کہا جاتا ہے جس میں بہت زیادہ آگ جلا کر دیو ہیکل شعلوں کی پرستش کی جاتی ہے۔ یگیا کا آغاز اسی زمانے میں ہوا۔ کسی بھی شخص کی جو چیز جل جاتی وہ اس کے جلنے پر خوش ہوتا۔ یہ سوچ کر کہ اسے خدا نے قبول کر لیا ہے۔ جب کوئی انسان مر جاتا تو اس کی لاش کو لکڑیوں کے ڈھیر پر رکھ کر جلا دیا جاتا۔ لکڑیوں کے اس ڈھیر کو ''چتا'' کہا جاتا ہے۔

آدمؑ نے تو خالص خدا کا تصور پیش کیا تھا۔ لیکن بعد میں کسی نے انسانوں کو خدا کی مثال کے طور پر آگ دکھائی اور آتش پرستی کے کام پر لگا دیا۔ آتش پرستی بت پرستی سے بدر جہا بہتر تھی۔ کیونکہ آگ ہر جگہ ایک جیسی ہونے کی وجہ سے اپنے اندر یکتائی کا ایک بے مثال عنصر رکھتی ہے لیکن انسان کا ناپختہ شعور اتنی جلد توحید کے تجسیمی تصور سے چھٹکارا پانے والا نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے آتش پرستی کے ساتھ ساتھ بت پرستی شروع کر دی۔ آگ کی آنکھیں نہیں تھیں۔ لیکن وہ چاہتا تھا کہ اس کے سامنے کوئی ایسا خدا ہو جس کی آنکھیں ہوں، جو دیکھ سکتا ہو۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے عجیب الخلقت بت تراشنے شروع

Marfat.com

کردیے۔

ہندوستان کے بعد ایران میں انسانی تہذیب کا دوسرا دور شروع ہوا۔ ایران ہندوستان کا پڑوسی تھا۔ لہٰذا ہندی تہذیب وتمدن، مذہب، ثقافت، رسم ورواج حتیٰ کہ زبان...... دھیرے دھیرے ہندوستان کی مغربی سرحد عبور کر کے ایران میں داخل ہوگئی۔ یہ عقل ودانش اور مذہب کا پہلا سفر تھا جو مشرق سے مغرب کی جانب شروع ہوا۔ گویا ہندوستان کا تصورِ خدا ایران منتقل ہوگیا۔ یہاں کے داناؤں نے مذہب آتش پرستی کو زیادہ منظم طریقے سے جاری رکھا۔ اور دنیا کی پہلی منظّم اور دانا قوم ایک عظیم طاقت کے طور پر دنیا کے سامنے ظاہر ہوئی۔ ''جمشید'' ''ذوالقرنین'' اور ''داریوش اعظم'' وہ عظیم حکمران تھے۔ جن کے ادوار میں ایران کی دانائی زمین کے ہر خطے سے زیادہ تھی۔ ایران میں بھی دانائی کا یہ سفر جغرافیائی لحاظ سے مغرب کی طرف ہی جاری رہا۔ ''پارساگرد'' کی دانش مشرقی ایران سے مغربی ایران میں منتقل ہوئی۔ اور پھر عظیم ایران کی آخری مغربی سرحد یعنی بحر روم کے ابتدائی جزائر میں منتقل ہوگئی۔ ''ساموس'' کا جزیرہ جہاں ''فیثاغورث'' اور ''اینیگزاغورث'' جیسے دانا پیدا ہوئے، اپنے دور میں سلطنت ایران کا حصہ تھا۔ لیکن ساموس کے باشندے نسلاً یونانی تھے۔ کیونکہ ساموس سے اگلا قدم، مغرب کی جانب یونان ہی تھا۔ ایران کی طاقت اور دانش نے مغرب کی طرف اپنا سفر جاری رکھا۔ یہاں تک کہ یونان ایک زمانے میں علوم ودانش کا مرکز بن گیا۔ یہ سفرِ عقل ودانش کا سفر نہیں تھا۔ یہ سفر تو تصور خدا کا سفر تھا۔ جس زمانے میں یونان اپنے تصور خدا کو بڑے جوش وخروش کے ساتھ شفاف کرنے میں مصروف تھا۔ اسی زمانے میں اہل یونان دنیا کی عظیم ترین طاقت بن گئے۔ یہ سقراط ارسطو اور افلاطون کا زمانہ تھا۔ ایک بات بڑی قابل غور ہے کہ جب کبھی کسی خطے میں تصور خدا کی

Marfat.com

شفافیت کا عمل تیز تر ہوا۔ تو اس عمل کی مخالف قوتیں بھی تیز تر ہو گئیں۔ ہندوستان سے لے کر یونان تک جہاں جہاں بھی تصور خدا کو خالص کرنے کی ضرورت پیش آئی، فی الحقیقت اسی لیے پیش آئی کہ ان علاقوں میں خدا کا تصور بری طرح مسخ ہو چکا تھا۔ تمام تر مادی آلودگیاں اور کثافتیں تصور خدا میں شامل ہو چکی تھیں۔ اہل یونان سینکڑوں دیوتاؤں کے بت بنا کر ان کی پوجا کرتے تھے۔ ''سقراط'' کو اسی لیے سزائے موت دی گئی تھی کہ اس نے ان بتوں کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔

اس تمام عرصہ میں آدمؑ اور حواؑ کی خالص اولاد عقائد کے اعتبار سے دنیا کی تمام اقوام پر سرفراز رہی۔ یہ بنی اسرائیل تھے۔ جن کے پاس، بے پناہ حوادث کے باوجود خدا کے خالص تصور کے بہت سے عناصر ابھی باقی تھے۔ بنی اسرائیل کو انہی ایام کی یاد دلاتے ہوئے قرآن حکیم نے یوں مخاطب کیا ہے:۔

''انی فضلتکم علی العالمین .... میں نے تمہیں عالمین پر فضیلت دی۔ لیکن تا حال مجموعی طور پر اہل زمین کا تصور خدا بے حد کثیف تھا۔ اگرچہ آغاز تاریخ سے لیکر اب تک بتدریج اس میں لطافت کے عناصر بڑھتے چلے آئے تھے اور کثافت کے عناصر کم ہوتے چلے گئے تھے۔ لیکن ابھی تک یہ تصور عام انسان کے ذہن میں پوری طرح شفاف نہیں تھا۔ اسے مزید لطافت کی ضرورت تھی۔ اور پھر عیسیٰؑ کا ظہور ہوا تو خدا کا تصور ماضی کے تمام مذاہب سے بڑھ کر شفاف ہو گیا۔ لیکن عام انسانوں کو ابھی بھی بے پناہ وقت درکار تھا۔ اور پھر جب وادیِ فاران سے قل ھو اللہ احد ० اللہ الصمد ० لم یلد ولم یولد ० ولم یکن لہ کفواً احد ० .... کی صدا بلند ہوئی تو پہلی مرتبہ خدا کا خالص ترین تصور عام انسانوں کے سامنے بھی پیش کر دیا گیا۔ اب یہ عام انسانوں کی ذہنی استعداد پر منحصر تھا کہ وہ سلامتی کے آخری ضابطے اور خدا

64876

Marfat.com

کے حتمی تصور کو کس طرح اپناتے ہیں۔ بالفاظ دیگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان کے بعد تمام تر ذمہ داری خود انسانوں پر آ پڑی۔ کیونکہ نبوت کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا تھا۔ اب کرۂ زمین کے ہر انسان کو کھلی دعوت تھی کہ وہ اپنے من میں موجود......... اپنے خدا کے تصور کو قرآن حکیم کے بتائے ہوئے کلیات کی مدد سے خود شفاف کرے۔ یہ گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں پر اعتماد کا اظہار تھا۔ ختم نبوت عام انسانوں پر اللہ کے اعتماد کا ثبوت ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے سلسلہ نبوت کو ختم کر کے عام انسانوں سے کہہ دیا کہ ''اب تم بچے نہیں رہے۔ اب تم نادان اور معصوم نہیں ہو کہ تمہارے لیے مزید کسی استاد کو بھیجا جائے''۔ گویا اسلام کی آمد نسل انسانی کی بلوغت کا اعلان تھی۔ اب ہر کسی کے لیے آسان تھا کہ وہ علم تاریخ، انفس و آفاق اور قرآن کریم کے علوم کی مدد سے اپنے اپنے ذہن میں خدا کا تصور شفاف کر لے۔ عام زبان میں یوں کہہ لیجیے کہ اب ہر کوئی اپنا قبلہ درست کرنے کا اہل ہو گیا۔

ہم سب کے ذہن میں خدا کا ایک اپنا الگ تصور ہے۔ اس بات کو ہم چھوٹی چھوٹی مثالوں سے سمجھتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص زید ایک ایسے ماحول میں پیدا ہوا جہاں اسے بچپن میں ہی یہ بتا دیا گیا کہ خدا ایک اونچی کرسی پر بیٹھا ہے۔ خدا کی آنکھیں بہت بڑی ہیں۔ پوری دنیا کا نظام اس کے ہاتھ میں ہے......... زید جوان ہوا تو اس کے ذہن میں خدا کا تصور ایک طاقتور انسان کے تصور سے مشابہ تھا۔ خدا کو اونچی کرسی پر بیٹھا ہوا سوچ کر زید جب بھی خدا کو پکارنا چاہتا آسمان کی طرف سر اٹھا لیتا۔ گویا سچ مچ کہکشاؤں کے نزدیک کہیں خدا کا آشیانہ ہے۔ اس مثال کے بعد ہم ایک عیسائی شہری کے خدا کا منظر دیکھتے ہیں جو بائبل کے پہلے صفحے پر ہی بتا دیا گیا کہ:

''اور انہوں نے خداوند خدا کی آواز......... جو ٹھنڈے وقت

Marfat.com

> باغ میں پھرتا تھا، سنی اور آدم اور اس کی بیوی نے اپنے آپ کو
> خداوند خدا کے حضور سے باغ کے درختوں میں چھپایا۔''

اس عیسائی کو بچپن ہی میں یہ بتا دیا گیا کہ خدا کی ایک بیوی بھی ہے۔ جس کا نام ''مریم'' ہے۔ اور خدا ایک بیٹے کا باپ بھی ہے جس کا نام ''عیسیٰؑ'' ہے۔ گویا عیسائی شہری کے ذہن میں خدا کا تصور ایک عام انسان جیسا تھا۔ ان دو مثالوں کے بعد اب ہم ایک تیسری مثال پر غور کرتے ہیں........ ایک ہندو شہری رام داس کو عہد طفولیت میں ہی اس کے ماں باپ نے دیوتاؤں کی کہانیاں سنا کر گویا یہ بتا دیا کہ آسمانوں پر بہت بڑی بڑی طاقتور ہستیاں ہیں جو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ انسانوں کی طرح رہتی ہیں۔ یہ دیوی اور دیوتا ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے بھی ہیں اور عشق و محبت کے عمل سے بھی گزرتے ہیں۔ ان سب پر ایک نگران بھی ہے جس کا نام ایشور ہے۔ اور جو ان کے ساتھ ایسے رہتا ہے جیسے بہت سے بچوں کے ساتھ باپ۔

ہر تین مثالوں میں ہم نے دیکھا کہ خدا کا تصور شفاف نہیں تھا۔ کہنے کو تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک مسلمان شہری کے دل میں عیسائیوں اور ہندوؤں کی نسبت زیادہ خالص توحید ہوتی ہے۔ لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ خدا کے وجود کا تصور خارج میں نہیں بلکہ داخل میں موجود ہوتا ہے جو ملت اسلامیہ کے ہر شہری کے ذہن میں الگ ہوگا۔ ایک مشہور حکایت ہے کہ کوئی شخص خدا سے ناراض ہو گیا اور اس نے غصے میں آ کر آسمان کی طرف خنجر پھینکنے شروع کر دیے۔ اس طرح گویا وہ خدا کو ہلاک کرنا چاہتا تھا۔ ایک مسلمان بڑھیا کا قصہ بھی مشہور ہے کہ وہ خدا کی یاد میں روتی اور اکثر یہ کہتی:۔

> ''ہائے میرے اللہ! تو تو ایک اکیلا ہے۔ تیرے ہاتھ منہ کون
> دھلاتا ہوگا۔ تیرے بالوں میں کنگھی کون کرتا ہوگا۔ تیری آنکھوں

Marfat.com

میں سرمہ کون ڈالتا ہوگا"..........

اسی طرح کی باتیں کر کر کے وہ یادِ خدا میں روتی رہتی۔ یہی نہیں، اچھے خاصے پڑھے لکھے اور دانا لوگوں کے ذہن میں بھی ابھی تک توحید تجسیمی راسخ ہے۔ وہ جب بھی خدا کے بارے میں سوچتے ہیں تو انہیں اپنے چشم تصور میں ایک ایسی ہستی دکھائی دیتی ہے جس کا جسم ہے، جسکی آنکھوں میں باقاعدہ اس کے دیدے حرکت کر رہے ہیں۔

ان تصورات کے حامل خدا کے ماننے والوں کو برا نہیں کہا جا سکتا۔ نہ ہی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے دل میں خدا کی محبت کم ہے۔ لیکن اس طرح کے تصورات سے خدا کی ذات، زمان و مکان میں محدود و محصور ہو کر رہ جاتی ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ساتویں آسمان کے بعد عرش ہے، وہاں پانی کے ایک بہت بڑے تالاب میں پانی کی سطح پر خدا کی کرسی ہے۔ جو یاقوت کی بنی ہوئی ہے اور اس کرسی کو ہزاروں فرشتوں نے اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا ہے۔ تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے خدا سے زیادہ پابند سلاسل کوئی نہیں۔ اور پھر اس کی کرسی کے مقام کا تعین کرنے کے بعد ہم خدا کے وجود کو اپنی زمین سے بہت دور بہت ہی دور تصور کر لیتے ہیں۔ قرآن حکیم کو اس طرح کے تمام تصورات پر اعتراض ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں خدا کے لیے "اللہ" کا لفظ استعمال ہوا ہے جو محض اسم ذات ہے۔ تاریخ انسانی میں یہ پہلی مرتبہ ہوا کہ خدا کے لیے اسم ذات استعمال کیا گیا۔ ورنہ اس سے پہلے جس قدر بھی نام خدا کو دیے گئے سب صفاتی نام تھے۔ کسی کا مطلب تھا زندگی دینے والا، کسی کا مطلب تھا موت۔ کسی لفظ کا معنی رزق دینے والا تھا، تو کسی کا معنی اشیاء کو تخلیق کرنے والا۔

یونان کے دیوتا ہوں یا ہندوستان کے، سب کے سب الگ الگ صفات رکھنے والے خدا تھے۔ کوئی بارش برساتا، کوئی غلہ اگاتا۔ کوئی جنگ کرواتا، کوئی امن لاتا، کوئی

زلزلے کا دیوتا تھا تو کسی کے ذمے اولاد عطا کرنے کا کام تھا۔ محبت کی دیوی الگ تھی اور نفرت و غصے کی دیوی الگ .... لیکن اب جب ہم خدائے واحد کا تصور کرتے ہیں تو یہ تمام صفات ہم اسی ایک خدا میں یکجا دیکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام ننانوے ہیں اور ذاتی نام ایک۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بحیثیت مجموعی مسلمانوں کا تصور خدا دیگر تمام اقوام سے بہتر ہے۔ البتہ مغربی اقوام میں بعض لوگ انفرادی سطح پر کسی عام مسلمان کے تصور خدا سے بہتر تصور کے مالک ہو سکتے ہیں۔ عام مسلمان سے مراد وہ نام نہاد مسلمان ہے جسے توحید حقیقی کا فہم نہیں۔

تصوف کی سب سے بڑی ذمہ داری انسان کی قلبی تطہیر ہے۔ تزکیہ، تقویٰ ایسی اصطلاحات ہیں جو اہل تصوف کی روزمرہ کی گفتگو کا حصہ ہیں۔ لیکن دلچسپ سوال یہ ہے کہ کیا تصوف...... اسلامی طریقہ تخلیص ہے یا دیگر مذاہب میں بھی پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم گزشتہ صفحات میں دیکھ آئے ہیں کہ وقت کے ساتھ ساتھ انسان کا تصور خدا شفاف ہوتا چلا آیا۔ چنانچہ ان تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ تصوف قبل از اسلام کی چیز ہے اور یہ کہ تمام انبیاء اور صلحا کا مقصد زندگی۔ حضرت عیسیٰؑ نے باقاعدہ عملی تصوف کی داغ بیل ڈالی۔ آپ نے بہت سی دنیاوی آلائشوں کو مسترد کر کے پرہیزگاری کو ترجیح دی اور اپنے رفقاء کو بھی اسی طرح کی تربیت دی۔ لیکن عیسیٰؑ کا تصوف وقت کے ساتھ ساتھ رہبانیت کا رنگ اختیار کر گیا۔ ہندو فارس کی حالت تو ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں۔ الغرض چھٹی صدی عیسوی تک خط استواء کے نزدیکی ممالک میں بصیرت انسانی اتنی ترقی کر چکی تھی کہ وادیِ حجاز میں عملی تصوف نے جنم لیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عمر کے چالیس سال تک اپنے تصور خدا کی ہی نگہداشت کی تھی۔ آپؐ نے حقیقتِ اشیاء کا علم اللہ تعالیٰ سے طلب فرمایا تو آپؐ پر طبق کے بعد طبق روشن ہونا شروع

Marfat.com

ہو گئے۔ یہاں تک کہ ایک روز آپؐ کے تصور میں حقیقت کی تصویر روشن ہو گئی۔ یہ تصویر سہ جہتی (3D) ادراک سے ماوراء تھی۔ چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی نازل ہوئی۔

ہندوؤں اور یونانیوں یا دیگر بت پرست مذاہب کے دیوتاؤں کا تصور ایک لحاظ سے عقل انسانی کا فطری تقاضا تھا۔ یہ تقاضا ظہور اسلام کے بعد بھی باقی رہا۔ لیکن اب دیوتاؤں کو الگ الگ طاقت کا مالک خدا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ بلکہ اب انہیں خدا کے فرستادہ یعنی فرشتوں کا نام دے دیا گیا۔ جبرائیل، اسرافیل، میکائیل اور عزائیل، ہندوؤں میں ذرخیزی کا دیوتا الگ تھا، اور موت کا الگ۔ ''ماں لکشمی'' رحمت کی دیوی تھی اور ''درگا'' قہر و غضب کی۔ ''یمراج'' موت دینے والا تھا۔ اور بجرنگ بلی (ہنومان) جنگ کا دیوتا۔ یونانیوں میں ''ہرکولیس'' طاقت کا دیوتا تھا اور پرومیتھوس آگ کا۔ وینس محبت کی دیوی تھی اور زیوس ان سب کا سردار یعنی خدا۔ یہی تصورات ظہور اسلام کے بعد اللہ کے فرشتے بن گئے۔ ہندو، یونانی یا دیگر بت پرست اقوام اپنے ان دیوتاؤں کے سامنے سجدہ کرتی تھیں۔ ان کے الگ الگ مندر اور الگ الگ کاہن تھے۔ لیکن اسلام نے ایک انوکھا کام کیا۔ اس نے ان دیوتاؤں کو اللہ کے فرشتے کہنے کے بعد انسان کو بتایا کہ یہ فرشتے خدا، یا خدا کے بیٹے نہیں بلکہ انسان سے بھی کم رتبہ ہیں۔ اسلام نے طاقت، رحمت، موت، بارش اور ذرخیزی کے ان دیوتاؤں کو حکم دیا کہ وہ انسان کے سامنے سجدہ ریز ہو جائیں.......... و اذقلنا للملئکة السجدو .... اللہ نے اپنے بعد کائنات کی سب سے برگزیدہ ہستی انسان کو قرار دیا۔ یہ ایک سرانوکھی بات تھی۔ قرن ہا قرن سے انسان کی فطرت پر چھائے ہوئے آہن مثال عقائد جن کی رو سے انسان نہ جانے کتنے خداؤں کو پوجتا تھا یک سر باطل

ہو گئے۔ سب سے بلند رتبہ خود انسان کے حصے میں آیا۔ گویا تاریخ کی ساری کہانی نے یک لخت یو (U) ٹرن لے لیا۔ اس سے پہلے کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ یہود و نصاریٰ تک اس بات کے قائل تھے کہ خدا کے بیوی بچے ہیں۔ لیکن اسلام نے لم یلد و لم یولد .... کا نعرہ بلند کر کے گویا اب تک کے تمام باطل عقائد کی تنسیخ کر دی اور ایک خالص ترین تصور الٰہ انسانیت کے سامنے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پیش کر دیا۔

Marfat.com

اسلام میں تصوف کا آغاز

اس سے پہلے کہ ہم اسلام میں تصوف کے آغاز پر ایک اجمالی نظر ڈالیں، ہمیں لفظ ''تصوف'' کو رائج الوقت اصطلاحات کے تناظر میں سمجھ لینا چاہیے۔ کیونکہ علامہ غلام احمد پرویز جیسے بے شمار جدت پسندوں نے نادانی سے تصوف کو جادو ٹونے اور کرامات یا شعبدہ بازیوں کے مترادف سمجھ لیا ہے۔ پرویز کی کتاب ''تصوف کی حقیقت'' کا مطالعہ کرنے کے بعد قاری اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ پرویز صاحب تصوف کو محض گدی نشینوں کا مکر و فریب تصور کرتے ہیں اور علامہ اقبالؒ جیسے متصوف شخص کی شاعری سے جا بجا تصوف کے خلاف استدلال کرتے ہیں۔ بعض متشدد مذہبی فرقے بھی تصوف پر جاہلانہ تنقید کرتے ہوئے اسے ایک غیر اسلامی چیز قرار دیتے ہیں ان فرقوں میں اہلحدیث فرقہ سرفہرست ہے جو منصور حلاجؒ اور شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ جیسے عظیم صوفیاء کو علی الاعلان ملحد کہہ کر پکارتے اور لکھتے ہیں۔ ایسے تمام معترضین پر فی الحقیقت تصوف کا اصل مفہوم ہی واضح نہیں۔ یہ لوگ تصوف کو بعض جہلاء کا کھیل تماشہ سمجھتے ہیں۔ دراصل تصوف کے خلاف اس طرح کے اعتراضات روز اول سے ہی موجود ہیں۔ ماسوائے عہد نبویؐ کے، لگ بھگ ہر دور میں دو حریف جماعتیں موجود رہیں۔ ایک اہل تصوف اور دوسرے ان کے مخالف۔ لیکن ماضی اور موجودہ زمانے کی طرز مخالفت میں ایک بہت بڑا فرق ہے۔ ماضی میں ملت اسلامیہ خود سپر پاور تھی۔ اور حال میں تمام اسلامی ممالک مغربی حکمرانوں کے غلام ہیں۔ وہ فرق جو ایک آزاد قوم کی مخالفت اور ایک غلام قوم کی مخالفت میں ہو سکتا ہے، فی زمانہ واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اَب عہد رفتہ کی شان و شوکت اور بصیرت تو رہی نہیں، ایک غلام ذہن کی پست اور

Marfat.com

قابل مذمت سوچ موجود ہے۔ چنانچہ اب تصوف کو بھی گھٹیا اور غیر معقول مخالفت کا سامنا ہے۔

تصوف علم معرفت کا دوسرا نام ہے۔ معرفتِ حق یعنی سچائی کی طلب سے بڑھ کر دنیا میں دوسری کون سی چیز درست ہو سکتی ہے۔ تصوف علم معرفت ہے۔ اور معرفت کا مطلب ہے جاننا۔ سچائی کو جاننا۔ یہ جاننا کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے یہ جاننا کہ حقیقت کیا ہے اور افسانہ کیا ہے۔ ہم دنیا میں پیدا ہوتے ہیں تو ہمارا گھر ہمارا ماحول ہماری تعلیم و تربیت، ہمارا معاشرہ ہمیں بہت سی باتیں بہت سے عقائد سکھانا شروع کر دیتا ہے۔ ہم جوان ہوتے ہیں تو ہمارے ذہن میں عقائد کا ایک انبار ہوتا ہے اور اشیاء کے بارے میں اس وقت تک ہماری اپنی ایک مخصوص رائے قائم ہو چکی ہوتی ہے۔ یہ سوالات کہ ہم کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ زمیں پر ہمارا مقصد کیا ہے؟ کائنات کیا ہے؟ اور ہمارا کائنات سے کیا تعلق ہے؟ جوان ہونے تک ہم اپنے تئیں حل کر چکے ہوتے ہیں۔ ہمارا مذہب، ہماری تعلیم، ہمارا گھر...... ہمیں ان سوالات کے اپنی استطاعت کے مطابق جواب دے چکا ہوتا ہے۔ اب باقی زندگی ہمیں یہ پرکھنا ہوتا ہے کہ آیا جو کچھ ہمیں بچپن سے اب تک بتایا گیا تھا وہ جھوٹ تھا یا سچ؟........... اگر ہمیں اپنی زندگی میں ایسے شواہد ملتے ہیں کہ جو کچھ ہمیں ماں باپ اور استادوں نے بتایا تھا وہ سچ ہے تو ہمارے دل میں اپنے عقائد کے لیے احترام کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر ہمیں ایسے شواہد نہ ملیں بلکہ اس کے برعکس ہمیں یہ پتہ چلے کہ جو کچھ ہمارے ماں باپ ہمارے اساتذہ اور ہمارے مذہبی پیشواؤں نے ہمارے ذہنوں میں ڈالا تھا وہ درست نہیں ہے تو ہمارے دل میں اپنے ہی عقائد کی وجہ سے ندامت اور شرمندگی کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ہم اپنے ماں باپ، اساتذہ اور پیشواؤں کے عقائد سے

Marfat.com

برگشتہ ہو جاتے ہیں۔ اب جس شخص میں جتنا اضطراب یا جوش ہوتا ہے۔ اتنا ہی وہ اپنے سابقہ عقائد کی مخالفت کرتا ہے۔

معرفتِ حق یہ ہے کہ ہم مظاہر فطرت کی زبان کو سمجھنے کے اہل ہو سکیں۔ اور آفاق کے بالغ نظر مشاہدہ کے بعد ہم اپنے انفس کے ہونے کی توجیح پیش کر سکیں۔ ہم کیوں ہیں؟ ہمارا مقصد کیا ہے؟ اس کائنات کے ساتھ ہمارا کیا تعلق ہے؟ یہ سب باتیں صرف اپنے آپ کو پہچاننے کے لیے ہم جاننا چاہتے ہیں۔ ہم عمر بھر جتنے سوالات کرتے ہیں ان سب کا مقصد ایک ہی ہوتا ہے۔ فی الحقیقت ہم اپنے آپ کے بارے مین جاننا چاہتے ہیں۔ یہ مظاہر فطرت یہ چاند ستارے اور کہکشائیں ہم سے اتنے دور نہیں جتنے ہم خود اپنے آپ سے دور ہیں۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا (اقبالؒ)

زندگی مختلف کیفیتوں کا مجموعہ ہے۔ ہر کیفیت ہمیں اپنے بارے میں ایک نئی بات بتاتی ہے۔ ہمیں اپنے ثبات اور بے ثباتی کے مختلف احساسات سے گزرنا پڑتا ہے۔ زندگی میں ایسے دن بھی آتے ہیں کہ ہم اپنے وجود کو بے معنی تصور کرتے اور مایوسی کے جذبات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہمارا دل ڈوبنے لگتا ہے اور ہم سوچتے ہیں کہ کاش ہم پیدا ہی نہ ہوئے ہوتے۔ اور بعض اوقات طبیعت پر ایسی کیفیت کا غلبہ ہو جاتا ہے جو ہمارے رگ و ریشے میں جوش و خروش بھر دیتی ہے، ہمیں زندگی سے زیادہ بامعنی اور حسین چیز کوئی دکھائی نہیں دیتی۔ اور ہم جینا چاہتے ہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ جینا چاہتے ہیں۔ اگر ہم علم معرفت کے راستے پر چل پڑیں تو اول الذکر کیفیت یعنی زندگی کی بے معنویت کا احساس کبھی طاری نہیں ہوتا۔ کیونکہ جوں جوں ہم معرفت حق یعنی انفس و

Marfat.com

آفاق کا علم حاصل کرتے چلے جاتے ہیں ہماری طبیعت کا جوش وخروش اور ہماری طلب وجستجو......اور بڑھتی چلی جاتی ہے۔ آفاق کا علم سائنس ہے۔ جبکہ انفس وآفاق دونوں کا علم، علم معرفت ہے۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "ہم نے اپنی نشانیاں انفس و آفاق میں بیان کر دی ہیں۔ (سَنُرِیھِم اٰیٰتِنَا فی الْآفاق وفی اَنْفُسِھِمْ ٥)...... جو چاہے ان نشانیوں کو دیکھتا ہوا قدم بہ قدم ہم تک آپہنچے۔ یہ ہے علم معرفت۔

اور پھر اللہ تعالیٰ کا وعدہ بھی تو ہے...... کہ جو کوئی اُس کی ذاتِ کریمہ کو تلاش کرنے کی جستجو کرے گا اللہ تعالیٰ اُسے اپنی ذات تک پہنچنے کا راستہ بھی دکھائیں گے۔ اللہ باری تعالیٰ ہے:

الذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا

وہ لوگ جو کوشش کرتے ہیں ہم (کو تلاش کرنے) میں، ہم اُن کو اپنا راستہ کھا دیتے ہیں۔

گویا معرفت کا راستہ، خدا تک پہنچنے کا راستہ ہے اور یہ خود قرآنِ کریم کا دعویٰ ہے۔

معرفت کا مطلب ہے جاننا۔ تعارف حاصل کرنا اور سمجھنا۔ اس لحاظ سے یہ لفظ محض شعوری طور پر واقفیت حاصل کرنے کے مترادف دکھائی دیتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اللہ کو پہچاننے کے لیے محض تعارف یا واقفیت حاصل کرنے سے کام نہیں چلے گا۔ دراصل اللہ کو پہچاننا"......... بذاتِ خود ایک غلط اصطلاح ہے۔ قرآن حکیم نے جگہ جگہ اس مقصد کے لیے "اللہ کو دیکھنے" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ نبوت سے پہلے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ یہ دعا کرتے تھے۔

"اللھم ارنی حقائق الاشیاء کماھی"۔

Marfat.com

''اے اللہ مجھے اشیاء کی حقیقت دکھا، جیسی وہ ہے۔''

یہی لفظ ''اَرِنی'' جس کے معنی ہیں مجھے دکھا اصل لفظ ہے۔ ہمیں اللہ کی معرفت...... کی جگہ اللہ کے دیدار کی اصطلاح استعمال کرنی ہوگی۔ اسی مادے کے دیگر الفاظ بھی کئی جگہ قرآن مجید میں استعمال ہوئے ہیں۔ زیادہ مقامات پر اللہ سے ملاقات کرنے، اللہ کے روبرو ہونے، اللہ کا دیدار کرنے کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ چنانچہ اللہ کو دیکھنے کے لیے معرفتِ حق کی اصطلاح بھی ناکافی ہے۔ ہوسکے تو رویتِ حق کی اصطلاح استعمال کی جانی چاہیے۔ اسی طرح لفظ تصوف بھی قدرے مختلف معنی کا حامل ہے۔ اس لفظ میں دیدارِ حق کا مفہوم تو پایا ہی نہیں جاتا۔ یہ زیادہ سے زیادہ تزکیہ، تقویٰ اور پرہیزگاری کے معانی کا تصور قائم کرتا ہے۔ لیکن اپنے بے پناہ استعمال کی وجہ سے ہم اس لفظ کو رویت حق کی جگہ استعمال کرتے ہیں اور یہ فرض کر لیتے ہیں کہ تصوف کے معانی ہیں ''دیدارِ الٰہی'' کا طریقہ۔ کیونکہ تصوف سے متعلق تمام بڑے اور معتبر، برگزیدہ لوگوں نے اپنے مشاهدات پیش کرتے ہوئے یہی رائے قائم کی ہے کہ علم تصوف دراصل دیدارِ الٰہی کا دوسرا نام ہے۔

ہم لفظ تصوف استعمال کرتے ہوئے اپنے تئیں یہی بیان کریں گے کہ انفس و آفاق (سائنس اور روحانیت) دونوں کا علم تصوف کہلاتا ہے اور یہی دیدارِ الٰہی ہے۔ اس کے علاوہ تصوف کے دیگر کوئی معانی ہمارے پیش نظر نہ ہوں گے۔ دیدارِ الٰہی، تجلی، مشاہدۂ حق، رویت حق اور اللہ کو دیکھنا........... ہمارے نزدیک زیادہ قرین قیاس اصطلاحات ہیں۔ ان کے برعکس معرفت حق، روحانیت یا تصوف........... اسلامی تصوف کو بیان کرنے کے لیے کمزور اصطلاحات ہیں۔

(اسلام میں تصوف کا آغاز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے ہی ہوگیا

تھا۔ نبوت سے پہلے آپؐ، اپنے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح مضطرب اور بیقرار دل کے مالک تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اصل سچائی کو جاننے کے لیے اتنے بیقرار تھے کہ بالآخر براہ راست اللہ کو پکار اٹھے۔ قرآن کریم میں اس واقعہ کی تفصیل موجود ہے:۔

"و اذ قال ابراهیم لا بیه آزر اتتّخذ اصناماً الٰهةً انی ارائک و قومک فی ضلالٍ مبینٍo و کذالک نری ابراهیم ملکوت السّمٰوٰتِ والارض و لیکون من الموقنینo فلما جنّ علیه الیل راکو کباً قال هذا ربی فلمّا افل قال لا احب الافلینo فلمّا رالقمر بازغاً قال هذا ربی فلما افل قال لئن لم یهدنی ربی لا کونن من القوم الضالینo فلمّا را لشمس بازغة قال هذا ربی هذا اکبر فلما افلت قال یقوم انی بری ء مما تشرکونo انی وجهت وجهی لِلّذی فطر السموات والارض حنیفاً وما انا من المشرکینo

ترجمہ: اور جب ابراھیم نے اپنے باپ آزر سے کہا کہ تم بتوں کو کیا معبود بناتے ہو۔ میں دیکھتا ہوں کہ تم اور تمہاری قوم صریح گمراہی میں ہو۔ اور ہم اس طرح ابراھیمؑ کو آسمانوں اور زمین کے عجائبات دکھانے لگے تاکہ وہ خوب یقین کرنے والوں میں ہو جائیں۔ جب رات نے ان کو ڈھانپ لیا تو ایک ستارا نظر پڑا...... کہنے لگے "یہ میرا پروردگار ہے" جب وہ غائب ہو گیا تو کہنے لگے "مجھے غائب ہو جانے والے پسند نہیں"۔ پھر جب چاند کو دیکھا کہ چمک رہا ہے تو کہنے لگے یہ "میرا پروردگار ہے"۔ لیکن جب وہ بھی چھپ گیا تو بول اٹھے کہ "اگر میرا پروردگار مجھے سیدھا رستہ نہیں

Marfat.com

دکھائے گا تو میں ان لوگوں میں سے ہو جاؤں گا جو بھٹک رہے ہیں"۔ پھر جب سورج کو دیکھا کہ جگمگا رہا ہے تو کہنے لگے "میرا پروردگار یہ ہے، یہ سب سے بڑا ہے"۔ لیکن جب وہ بھی غروب ہو گیا تو کہنے لگے "لوگو! جن چیزوں کو تم شریک بناتے ہو، میں ان سے بیزار ہوں۔ میں نے سب سے یک سو ہو کر اپنے تئیں اس ذات کی طرف متوجہ کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے۔ اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔" (سورۃ انعام)

یہ تڑپ، یہ بے چینی، یہ اضطراب کس لیے تھا؟......... آپ سچائی جاننا چاہتے تھے۔ حقیقت کے متلاشی تھے۔ آپ یہ جاننا چاہتے تھے کہ آخر انسان کی حیثیت کیا ہے؟ یہ کائنات کیوں ہے؟ انسان کا مقصد اور فطرت کا مطمع نظر کیا ہے؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابراھیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ آپؐ کو بھی اپنے دادا کی طرح اشیاء کی اصلیت اور حقیقت جاننے کا شوق تھا۔ آپؐ نے کم عمری میں طویل سفر کیے۔ تنہائیوں میں پہروں کے پہر گزارے۔ آپؐ کی روشن اور مبارک آنکھوں میں تجسس کی چمک اور ارتقائی جوش، دیدار الٰہی کے لیے ٹھاٹھیں مارتا رہا۔ یہاں تک کہ آپ کو اشیاء کی حقیقت دکھا دی گئی۔ آپؐ پر سب کچھ روشن ہو گیا تو آپؐ کی جستجو پہلے سے سوا ہو گئی۔ اب اس سے بڑھ کر دیدار حق کا شوق لاحق ہوا جو بالآخر معراج پر منتج ہوا۔ آپؐ نے اللہ کا دیدار حاصل کر لیا اور دنیاوی زندگی میں رہتے ہوئے جس قدر مشاہدہ حق ممکن تھا، تمام تر آپ پر ظاہر ہو گیا۔ اب اگلی زندگی میں اس سے بھی بڑھ کر دیدار الٰہی آپ کو نصیب ہونے والا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی وعدہ فرما دیا۔

"ومن الیل فتھجد بہٖ نافلۃً لک عسیٰ ان یبعثک ربک مقاماً محمودا"۔

Marfat.com

اور رات کے بعض حصے میں تہجد پڑھا کیجیے پس وہ آپؐ کے لیے نفل ہیں۔ قریب ہے کہ آپؐ کا رب آپؐ کو مقام محمود عطا کرے۔

گویا دیدار الٰہی کا عمل جاری تھا اور آئندہ زندگی میں پہلے سے بڑھ کر جاری رہنے والا تھا۔

لیکن ظاہری زندگی میں تاج نبوت سجا لینے کے بعد آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اضطراب اور بے چینی صبر و قرار میں بدل گئی۔ چہرۂ اقدس پر طمانیت قلب کا احساس غالب آ گیا۔ لیکن پھر بھی ایک لہر تھی جو درد، لگن، جستجو اور طلب کی عکاس دکھائی دیتی۔ ''سید محمد میاںؒ'' نے لکھا ہے کہ آپؐ اکثر غمگین اور سنجیدہ رہتے۔ ایک روایت میں ہے کہ رسول اکرمؐ پر جب کبھی وحی کا سلسلہ رک جاتا تو آپؐ اتنے آزردہ خاطر ہوتے کہ فرماتے:

''میرا دل چاہتا ہے کہ خود کو پہاڑ پر سے گرا لوں''۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کائنات کی سب سے منفرد اور ممتاز ہستی ہیں۔ آپؐ ہر لحاظ سے مکمل تھے۔ آپؐ کی طبیعت کا اضطراب یا بیقراری دنیاوی اشیاء کے لیے نہ تھی۔ یہ وہی بے قراری تھی جو کسی جویائے حق کے روشن چہرے پر جستجو کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک شخصیت کا اس پہلو سے خاص طور پر جائزہ لیا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے لکھا ہے:

> ''مذہبی مشاہدات کے حقائق بھی ویسے ہی حقائق ہیں، جیسے ہمارے دوسرے مشاہدات کے حقائق اور جہاں تک کسی حقیقت کی تعبیر سے حصول علم کا امکان ہے تو ہمارے لیے سب حقائق یکساں طور پر اہم ہیں۔ لہٰذا اس نوع کے مشاہدات کی تحقیق و

Marfat.com

تنقید کو بے ادبی پر محمول کرنا ٹھیک نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے نفسی مظاہر کو تحقیق و تنقید کی نگاہوں سے دیکھا۔ صحیح بخاری اور دوسری کتب حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مشاھدے کی پوری تفصیل درج ہے جس کا تعلق ابن صیاد ایسے وارفتہ نفس یہودی نوجوان سے تھا۔ اور جس کی وجدانی کیفیتوں نے حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ اپنی طرف منعطف کر لی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی آزمائش کی۔ طرح طرح کے سوالات پوچھے اور مختلف حالتوں میں اس کا معائنہ کیا۔ ایک مرتبہ آپؐ ایک درخت کے پیچھے کھڑے ہو گئے تاکہ وہ الفاظ سن سکیں جو ابن صیاد آپ ہی آپ بڑبڑا رہا تھا لیکن اس کی ماں نے اسے حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی موجودگی سے متنبہ کر دیا۔ جس پر اس کی وہ حالت کافور ہو گئی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اگر اس کی ماں اسے متنبہ نہ کر دیتی تو ساری حقیقت کھل جاتی۔ بایں ہمہ اصحاب رسولؐ جو اس موقع پر جسے گویا تاریخ اسلام میں نفسیاتی تحقیقات کا پہلا واقعہ تصور کرنا چاہیے، موجود تھے۔ علیٰ ھذا حضرات محدثین بھی، جنہوں نے آگے چل کر یہ ساری روایت باحتیاط نقل کی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرز عمل کی صحیح اہمیت سمجھنے سے قاصر رہے۔ اور اس کی تشریح اپنے معصومانہ انداز میں کی۔ بعینہٖ پروفیسر میکڈانلڈ نے بھی، جو معلوم ہوتا ہے اس حقیقت سے بالکل

بے خبر تھے کہ شعور نبوت اور شعور ولایت کا اساسی فرق کیا ہے؟ اس واقعہ سے بڑا لطف اٹھایا ہے۔ پروفیسر مذکور کے نزدیک اس کا مطلب گویا یہ ہے کہ کہ نبی کریم صلعم مجلس تحقیقات نفسیات کے طور طریق پر ابن صیاد کی پیشگویانہ صلاحیتوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ حالانکہ پروفیسر میکڈانلڈ کو اگر منشائے قرآنی کا علم ہوتا اور وہ سمجھتے، اس کی روح کیا ہے جس سے اس ثقافتی تحریک کی ابتداء ہوئی جو آگے چل کر عصر حاضر کی اختباری روش کا، جیسا کہ میں اپنے کسی خطبے میں ثابت کروں گا، سبب بنی، تو انہیں اندازہ ہو جاتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس وارفتہ نفس یہودی کی واردات کا معائنہ فرمانا کس قدر معنی خیز تھا۔ بہرحال یہ ابن خلدون تھا جس نے عالم اسلام میں سب سے پہلے یہ سمجھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرز عمل کے معنی فی الحقیقت کیا ہیں۔ پھر اس کی قدر و قیمت کا اندازہ کرتے ہوئے بڑی حد تک وہ مفروضہ قائم کرلیا جس کو آجکل نفوس تحت الشعور سے منسوب کیا جاتا ہے۔ پروفیسر میکڈانلڈ لکھتے ہیں.......... ''ابن خلدون کے بعض نفسیاتی افکار بڑے دلچسپ ہیں وہ اگر آج زندہ ہوتا تو مسٹر ولیم جیمز کی کتاب ''مشاہدات مذہب کی گونا گونی'' کو بہ نظر استحسان دیکھتا۔'' (تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقاء رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول اور فعل کو ہماری نسبت بہت اچھی طرح سمجھ سکتے تھے۔ لیکن علامہ اقبال کو یہ الفاظ استعمال

کرنے پڑے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین یا محدثین اس واقعہ کی اہمیت کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ دراصل علامہ اقبالؒ مختلف افراد کی ذہنی استعداد کو سامنے رکھ کر ایسا فرما رہے تھے۔ کیونکہ آپ کا یہ لکھنا کہ ''وہ صحابہؓ جو اس وقت وہاں موجود تھے، سمجھ نہیں پائے''...... یہی ثابت کرتا ہے کہ علامہ اقبالؒ ذہنی استعداد کے حوالے سے بات کر رہے ہیں۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو علامہ اقبالؒ اصحاب صفہ کی اہمیت کو بھی خاطر میں نہ لاتے۔ حالانکہ خود علامہ محترم اس بات کو جا بجا تسلیم کرتے ہیں کہ صحیح اسلامی تصوف کی پہلی جماعت وہی تھی جس کے ارکان بوذرؓ، سلمانؓ، وحیدرؓ جیسے عظیم صوفیاء تھے۔

اسلام میں تصوف کا باقاعدہ آغاز اصحاب صفہ کی صورت میں ہوا۔ ''محمد میاںؒ'' نے اپنی معروف کتاب ''سیرت مبارکہ''...... میں لکھا ہے:

> ''تبدیلی قبلہ کے بعد نماز جنوب کی طرف رخ کر کے پڑھی جانے لگی تو اس طرف کی دیوار میں جو دروازہ تھا وہ بند کر دیا گیا۔ اور پہلی دیوارِ قبلہ (شمالی دیوار) میں دروازہ کھول دیا گیا۔ اس سے متصل چبوترہ بنا دیا گیا۔ اور اس پر سائبان ڈال دیا گیا۔ اس کو ''صفہ'' کہا جاتا تھا۔ نادار مسلمان جن کے اہل و عیال نہیں ہوتے تھے ان کا مسکن یہی ہوتا تھا۔ توکل ان کا سرمایہ ہوتا تھا۔ سوال کرنا ممنوع، تعلیم، روحانی تربیت اور رضا کارانہ خدمات ان کے فرائض اور مشاغل ہوتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے ستر اصحاب صفہؓ کو دیکھا کہ ان کے پاس چادر تک نہ تھی فقط تہہ بند تھا۔ یا صرف کمبل، جس کو اپنی گردنوں میں باندھ لیتے تھے۔ کمبل بھی اس قدر چھوٹا کہ کسی کی آدھی پنڈلیوں تک پہنچتا تھا،

کسی کے ٹخنوں تک۔ نماز میں ستر کھلنے کا خطرہ رہتا تو ہاتھ سے تھامے رکھتے۔ (بخاری) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھانے کی چیز صدقہ میں آتی تو ان کو دے دیتے۔ خود تناول نہیں فرماتے تھے کیونکہ صدقہ آپؐ کے لیے حرام تھا۔ جو چیز بطور ہدیہ آتی تو ان (یعنی اصحاب صفہ) کو بلا لیتے اور ان کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے۔ یہ حضرات فاقہ سے نہیں گھبراتے تھے۔ کیونکہ خود اپنے آقا (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دیکھتے کہ کئی کئی وقت گزر جاتے اور فاقہ نہیں ٹوٹتا۔ بھوک سے کبھی اتنا ضعف ہو جاتا کہ نماز کی حالت میں گر پڑتے۔ لوگوں کو خیال ہوتا کہ دورہ پڑ گیا ہے۔ حالانکہ دورہ فاقہ کا ہوتا۔

کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان (یعنی اصحاب صفہ) کو انصار پر تقسیم فرما دیتے کہ اپنے مقدور کے بموجب ہر شخص ایک ایک دو دو کو لے جائے اور ان کو کھانا کھلائے۔ (یہ بھی صورت ہوتی کہ آپؐ فرما دیتے کہ جن کے یہاں دو کھانے والے ہوں وہ تیسرے کو لے جائے اور جس کے یہاں چار ہوں وہ دو کو لے جائے اور ساتھ کھانا کھلائے۔ ایک روز آپؐ نے اسی طرح اصحاب صفہ کو تقسیم فرما دیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے یہاں چار کھانے والے تھے۔ خود حضرت ابوبکرؓ ان کے صاحب زادے اور اہلیہ اور ایک خادم......... مگر آپؓ اپنے ساتھ تین کو لے گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سات اصحاب کو لے

Marfat.com

گئے۔ مسجد مبارک کے دو ستونوں میں ایک رسی بندھی رہتی۔ کھجوروں کے موسم میں حضرات انصار کھجوروں کے گچھے (خوشے) اپنے باغات سے لا کر لٹکا دیتے تھے۔ جو کھجور پک جاتا اس کو لکڑی سے جھاڑ کر کھا لیا کرتے۔ ان بہادر و جانباز فقراء اور درویشان باوقار کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بشارت دیا کرتے تھے کہ

"لو تعلمون مالکم عنداللہ لاَ حببتم ان تزو دوا فقراً و حاجةً۔

اگر تم جان جاؤ کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں تمہارے لیے کیا تیار ہے تو تم آرزو کرو کہ ہمارا یہ فقر و فاقہ اور بڑھ جائے۔"

ان حضرات کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔"

(سیرت مبارکہ از محمد میاں صفحہ نمبر 431)

آج ہم اگر چشم تصور میں دیکھیں کہ کھجور کے پتوں سے بنی مسجد نبوی میں مٹی کا ایک چبوترہ...... جس پر سائبان تان دیا گیا تھا، چار سو بہادر، جانثار، مرد طالبعلموں سے ہمہ وقت آباد ہے تو ہم حیران رہ جائیں گے۔ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی ازواج مطہرات کے حجروں کے تمام دروازے مسجد نبوی میں کھلتے تھے۔ کیا عجب منظر ہوگا۔ مسجد نبوی گویا ایک ایسا مدرسہ تھی جہاں چار سو درویش ہمہ وقت مقیم رہتے۔
"عارف سہروردیؒ نے عوارف میں لکھا ہے کہ اصحاب صفہ کی تعداد چار سو تک پہنچی۔ حافظ ابونعیم نے حلیۃ الاولیاء میں سب کا تذکرہ کر دیا ہے۔"

(فتح الباری صفحہ نمبر 215، جلد 11)

مسجد نبویؐ کی فضائیں اچھی طرح سے جانتی ہیں کہ وہ سماں کیسا ہوگا۔

Marfat.com

بیچ میں آقا بیٹھے ہوں گے
گرد اصحاب کا حلقہ ہوگا

یہ وہ لوگ تھے جنہیں آغاز اسلام کے ساتھ ہی تصوف کی تعلیم دی گئی۔ یاد رہے کہ ہم تصوف کو علمِ انفس و آفاق کے مترادف تصور کرتے ہیں۔ اسی جماعت میں وہ لوگ تیار ہوئے جو مشاہدۂ حق کے ماہرین تھے۔ خصوصاً حضرت ابوذر غفاریؓ، سلمان فارسیؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابوھریرہؓ اور اسی درجہ کے سینکڑوں جید صحابہ کرام۔ حضرت علیؓ کی شادی ہوئی تو آپؐ مکان لے کر رہنے لگے۔ اصحاب صفہ کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ اصحاب صفہ کے فقر و درویشی کا ذکر ہم محمد میاںؒ کے مضمون میں دیکھ چکے ہیں۔ اس سلسلے میں حضرت ابوہریرہؓ ایک دلچسپ واقعہ بیان فرمایا کرتے تھے۔

”آپ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے کہ میں بھوک کی وجہ سے اپنے جگر کو زمین پر ٹیک دیا کرتا تھا۔ (پیٹ کو زمین سے لگا دیا کرتا تھا) اور میں بھوک کی وجہ سے پتھر پیٹ پر باندھ لیا کرتا تھا۔ ایک روز سرِ راہ جا کر بیٹھ گیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اس طرف سے گزرے سوال کرنا ممنوع تھا۔ تو میں نے ایک لطیف طریقہ اختیار کیا کہ حضرت ابوبکرؓ سے ایک آیت دریافت کرلی کہ جب میری طرف متوجہ ہوں تو شاید میرے فاقہ کا بھی ان کو اندازہ ہو جائے مجھے لے جا کر کھانا کھلا دیں۔ مگر حضرت ابوبکرؓ نے وہ آیت بتا دی اور تشریف لے گئے۔ پھر عمر فاروقؓ تشریف لائے۔ میں نے ان سے بھی وہی آیت دریافت کی۔ حضرت عمرؓ نے بھی آیت بتا دی اور روانہ ہو گئے۔ اس کے

Marfat.com

بعد وہ آئے جن کی کنیت ''ابو قاسم'' تھی۔ (جن کی شان ہی یہ تھی کہ وہ خیر و برکت کے قاسم (تقسیم کرنیوالے) اور فطرت انسان کے نبض شناس تھے۔ آپؐ نے جیسے ہی نظر ڈالی آپؐ پہچان گئے۔ مجھ سے فرمایا ساتھ آؤ۔ میں ساتھ ہو لیا۔ آپؐ مکان پر تشریف لے گئے۔ وہاں ایک قدم (بادیہ) میں دودھ رکھا ہوا تھا جو کسی نے ہدیہ میں بھیجا تھا۔ آپؐ نے فرمایا ابو ہریرہؓ اصحاب صفہ کو بلاؤ۔ آپ کا یہ حکم میرے نفس پر شاک گزرا کہ تھوڑا سا دودھ، جس کو میں تنہا پی سکتا ہوں اس کے لیے اصحاب صفہ کو بلایا جا رہا ہے۔ پھر مجھ سے ہی کہا جائے گا کہ پلاؤ۔ یہ وسوسہ ذہن میں آ رہا تھا مگر مجبور تھا، تعمیل حکم کرنی تھی۔ چنانچہ اصحاب صفہ آئے۔ مجھے حکم ہوا۔ میں نے یکے بعد دیگرے ہر ایک کو دودھ پلایا۔ جب سب کو پلا چکا تو مجھے حکم ہوا کہ تم پیو، میں نے پیا۔ فرمایا.......... اور پیو! پھر فرمایا.......... اور پیو! میں نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اب بالکل گنجائش نہیں رہی۔ تب آپؐ نے یہ بادیہ خود لیا۔ اور بسم اللہ پڑھ کر باقی کو نوش فرمایا۔'' (بحوالہ بخاری شریف ص مبر ۹۵۵)

ایسے تمام لوگ جو اپنی نام نہاد جدت پسندی کی وجہ سے تصوف کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ شاید اصحاب صفہ کے کردار اور حالات سے واقف نہیں۔ ریٹائرڈ بیوروکریٹ اور جدت پسند مفکر قرآن غلام احمد پرویز کا یہی انداز ہے۔

اصحاب صفہ کے معمولات دیکھ کر اور بھی یہ یقین پختہ ہو جاتا ہے کہ آغاز اسلام

Marfat.com

کے ساتھ ہی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تصوف کی تعلیم کے لیے با قاعدہ ایک ادارہ کھولا تھا۔ علامہ شاطبیؒ نے بہت دلچسپ بحث کی ہے کہ صفہ سے خانقاہ کا استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ان حضرات کا یہ قیام اور قیام گاہ ضرورت کی بنا پر تھی۔ یہ کوئی مستقل ادارہ نہیں تھا۔ (بحوالہ الاعتصام)۔ بے شک یہ ادارہ ضرورت کی بنا پر تھا لیکن سچائی اپنی جگہ قائم ہے کہ یہ ادارہ تھا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چار سو کے قریب درویشوں کو اپنی نگاہوں کے سامنے انفس و آفاق کے علوم کی تعلیم دی کم از کم اس سے اتنا تو ثابت ہوتا ہے کہ جب کبھی ضرورت یا حالات کا تقاضا ہو تو اس طرز کے ادارے کا قیام عین سنت ہوگا۔ اور بے شک کوئی ادارہ نہ بھی ہو لیکن علوم تصوف کا سلسلہ جاری رکھنے کا ایک بڑا ثبوت صفہ سے ملتا ہے۔

اس چبوترے پر جو لوگ انفس و آفاق کے علوم حاصل کرتے رہے انہوں نے آگے چل کر صحیح اسلامی تصوف کی ایسی شاندار عمارت قائم کی کہ ایک صدی کے اندر اندر دنیا پر چھائے ہوئے مہیب افلاطونی تصوف کا محیر العقول جال ٹوٹنے لگا۔ یہاں تک کہ امام غزالیؒ کے دور میں افلاطونی تصوف کی عمارت پر آخری کاری ضرب لگا دی گئی۔ یہ بات قرآن و حدیث سے پوری طرح ثابت ہے کہ اسلام کا آغاز حقیقی تصوف کا ہی آغاز ہے۔ بشرطیکہ تصوف کے عجمی معانی نہ لیے جائیں جو فی الحقیقت ہندو ویدانت کے مماثل ہیں۔ قرآن حکیم نے سب سے پہلے جدید نفسیات کی بنیاد ڈالی اور انسان کو یہ باور کرایا کہ علم انفس و آفاق ہر دو طرح کے علوم کو کہا جاتا ہے۔ صرف آفاق یعنی سائنس کا علم بھی گمراہ کر دیتا ہے اور صرف باطنیت کا علم بھی راہ راست پر نہیں رہنے دیتا۔ قرآن کریم نے بار بار اپنے مقاصد کا اعادہ کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ گردش لیل و نہار، ستاروں، سیاروں چوپایوں، درختوں یہاں تک کہ کیڑے مکوڑوں کے بارے میں

Marfat.com

جاننے کی کوشش کرو اور ان سے جو نتیجہ نکلے اس کی روشنی میں اپنے وجود کا سبب تلاش کرو۔ تم کون ہو؟ تم کیوں ہو؟ اللہ نے تمہیں کیوں پیدا کیا۔ یہ کائنات کیا ہے؟ تمہیں بالآخر کہاں جانا ہے۔ کچھ لوگ کہہ سکتے ہیں کہ اس طرح کا تصوف تو فلسفہ ہوا۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ ہر سچا فلسفی صوفی اور ہر سچا صوفی فلسفی ہوتا ہے۔ سقراط کو سب فلسفی کہتے ہیں لیکن اس کے اور منصور حلاجؒ کے انجام میں سرمو فرق نہیں۔ البتہ ہم ایک صوفی اور فلسفی کا فرق جاننے کے لیے یوں کہہ سکتے ہیں کہ صوفی وہ ہوتا ہے جو سچا فلسفی ہو اور فلسفی وہ ہوتا ہے جو نہ تو سچا صوفی ہو اور نہ سچا فلسفی۔ تکنیکی اعتبار سے فلسفی اور صوفی کا فرق تسلیم شدہ ہے۔ یہاں ہم نے صرف جذباتی اعتبار سے اس کی وضاحت کی ہے۔

Marfat.com

علامہ اقبالؒ کا مقالہ

گزشتہ مضمون میں ہم نے اسلام میں تصوف کے آغاز کا جائزہ لیا۔ اس سے پہلے ہم تصوف کو قبل از اسلام کی تمام تاریخ کی روشنی میں دیکھ آئے ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ مذاہب عالم کا تصور خدا کس طرح ارتقاء کرتا ہوا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شاگردانِ رشید، اصحاب صفہ تک آ پہنچا۔ اصحاب صفہ یہ جان چکے تھے کہ دنیا کی تمام آلائشیں جن کے لیے ایک انسان ترستا اور لڑتا جھگڑتا ہے دراصل بت خانہ دل میں سجے وہ اصنام باطلہ ہیں جنہیں مسترد کر کے ہی خدا کے حقیقی تصور تک پہنچا جا سکتا ہے۔ یہی وہ آلودگیاں اور کثافتیں ہیں جو ہم نے اپنے اپنے ضمیر پر ڈال رکھی ہیں۔ جوں جوں ہم اپنے ضمیر کو صاف اور شفاف دیکھتے چلے جاتے ہیں فی الحقیقت ہم اپنے خدا کو صاف اور شفاف دیکھتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہمارا ہر اختیار ہی مظاہرہ اللہ کے اختیار کا مظاہرہ بن جاتا ہے:

؎ ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ

لیکن اس موضوع پر ہم آئندہ صفحات میں تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالنے والے ہیں۔ یہاں ضرورت ہے تصوف کے ارتقاء کا وہ مرحلہ بیان کرنے کی جو اسلام کے بعد شروع ہوا اور تا حال جاری ہے۔ (اس تمام عہد پر تصوف کے حوالے سے علامہ اقبالؒ نے بڑی گہری نظر ڈالی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ اسی ڈگری کی وجہ سے آپ کو علامہ یا ڈاکٹر کہا جاتا ہے۔ لیکن بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ پی۔ ایچ۔ ڈی میں علامہ اقبالؒ کے مقالے کا عنوان کیا تھا۔ علامہ اقبالؒ کے مقالے کا عنوان تھا:

"The Development of Metaphisics in Persia"

''ایران میں مابعد الطبیعات کا ارتقاء۔''

چند سال قبل مجھے طلب ہوئی کہ میں علامہ محترم کے اس مقالہ کا مطالعہ کروں۔ تب میں نے ''بزم اقبالؒ'' لاہور سے رابطہ کیا تو پتا چلا کہ وہ ایک عرصہ سے کتابی شکل میں دستیاب نہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ چاہیں تو ریکارڈ میں محفوظ صفحات کی فوٹو کاپی کروالیں۔ مجھے اس پیش کش پر خوشی ہوئی جس کے لیے میں ''بزم اقبال'' کا شکر گزار ہوں۔ بعد ازاں میں نے چاہا کہ انگریزی کے اس مقالہ کا مطالعہ کرتے ہوئے اگر میرے سامنے اس کا کوئی ترجمہ بھی رہے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ چنانچہ بے پناہ تگ ودو کے بعد ''میر حسن الدین'' بی اے۔ ایل ایل بی، (عثمانیہ) کا ترجمہ میرے ہاتھ لگا۔ جو ''فلسفہ عجم'' .... کے عنوان سے ہے۔ یہ کتاب حاصل کرنے کے لیے میں نے کون کون سے پاپڑ بیلے یہ ایک الگ داستان ہے۔ فلسفہ عجم، علامہ اقبال کی زندگی میں ہی ''نفیس اکیڈمی، حیدر آباد دکن'' .... سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کا ترجمہ 1928ء میں مکمل ہوا۔ اور اشاعت کی نوبت 1936ء میں آئی۔

علامہ اقبالؒ کا یہ مقالہ بڑا دلکش اور جامع ہے۔ اگرچہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں اس مقالہ کی بعض باتوں سے علامہ مطمئن نہ تھے۔ لیکن مجموعی طور پر یہ ایک ایسی نایاب دستاویز ہے جس میں ظہور اسلام سے لے کر ایران کے بابی مذہب تک تصوف اور مابعد الطبیعات کی مکمل تاریخ بیان کردی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اس مقالے کا خلاصہ یہاں پیش کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے۔ علامہ اقبالؒ کا یہ مقالہ مندرجہ ذیل الفاظ سے شروع ہوتا ہے:

''ایرانِ قدیم کے برگزیدہ حکیم زرتشت کو ایرانی آریوں کی عقلی

Marfat.com

تاریخ میں ہمیشہ پہلی جگہ دی جانی چاہیے۔ اس زمانے میں جبکہ وسط ایشیاء میں ابھی ویدی بھجن تصنیف کیے جا رہے تھے ان آریوں نے مسلسل خانہ بدوشی سے بیزار ہو کر زرعی زندگی اختیار کرلی۔ دوسرے آریائی قبائل جنہوں نے ابھی تک اپنی ابتدائی خانہ بدوشی کے خصائل کو ترک نہیں کیا تھا اور جو کبھی کبھی اپنے سے زیادہ مہذب ہمسایوں کو لوٹا کرتا تھے، اس نو آباد قبیلہ کی اس جدید طرز زندگی اور ادارۂ جائیداد کے استحکام کو دیکھ کر اس سے تنفر کرنے لگے۔ اس طرح زندگی کے ان دو طریقوں میں ایک پیکار و تنازعہ شروع ہوگیا۔ جو ابتداء میں ایک دوسرے کے ارباب ''دیوا'' اور آہورا'' کی تحقیر میں رونما ہوا۔ یہ درحقیقت ایک طویل عمر تفرید تھا جس نے ایرانی شاخ کو دوسرے آریائی قبائل سے الگ کردیا۔ اور بالآخر پیغمبر ایران زرتشت کے مذہبی نظام میں نمودار ہوا۔ (فلسفۂ عجم)

اور اس طرح علامہ اقبالؒ نے دور قدیم سے اپنے مقالے کا آغاز کیا۔ چونکہ ان کے پیش نظر ایران میں مابعد الطبیعات کا ارتقاء تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ملک فارس کے قدیم دور کو سامنے رکھا اور ماضی پر ایک گہری نظر ڈالتے ہوئے آغاز اسلام تک پہنچے۔ یہاں سے علامہ اقبالؒ کا مقالہ ایک نیا رنگ اختیار کرلیتا ہے۔ دراصل عربوں کے حصے میں اسلامی حکومت کی راہنمائی کا اعزاز بہت کم عرصہ کے لیے ہی آیا۔ عرب کے پڑوس میں ایران کی جابر اور قدیم تہذیب تھی۔ خلفائے راشدین کے عہد میں ایران مکمل طور پر فتح ہو کر عربی پرچم کے زیر تسلط آ گیا۔ ایرانیوں کے نزدیک

Marfat.com

عربوں کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ شہنشاہ ایران کے دربار میں عربوں کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ ظہور اسلام سے قبل کسریٰ کے دربار میں ''نعمان بن منذر'' کا مکالمہ .... اس حوالے سے بہت مشہور ہے۔ اور پھر سب سے بڑا واقعہ تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوب مبارک کے چاک ہونے کا ہے۔ خسرو پرویز نے یہ گستاخی کرتے وقت یہی تو کہا تھا کہ ..... بکریوں کے چرواہے ہماری رہنمائی کریں گے؟ .... الغرض، ایرانیوں کے دل میں عربوں کی تضحیک کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اور پھر جب عربوں نے ایران کو تسخیر کیا۔ تو ایران کے طبقۂ امراء کے دل میں بغض و حسد کی آگ اور بھی بھڑک اٹھی۔ جس کا سب سے بڑا ثبوت ایرانی شاہی خاندان کے فرد ''ابولوء لوء فیروز'' نے حضرت عمرؓ بن خطابؓ کو شہید کر کے دیا۔ امویوں کے عہد حکومت تک خلافت اسلامیہ میں ایرانیوں کا دخل نہیں تھا۔ ابو مسلم خراسانی وہ پہلا ایرانی ہے جس نے پہلے عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور کی عسکری طور پر مدد کی اور یوں خلافت اسلامیہ میں ایرانیوں کا عمل دخل شروع ہوا۔ عباسیوں خصوصاً ''ہارون الرشید'' کے دور میں ایرانی ''البرامکہ'' پوری طرح قصر خلافت پر چھا چکے تھے۔ اگرچہ یہی دور تہذیبی اعتبار سے اسلامی تاریخ میں شاندار ترین ہے لیکن یہی وہ دور ہے جب ایران کے نظریات اور جمود طاری کر دینے والا فلسفۂ حیات جو سراسر ثنویت پر مبنی تھا، جنگجو عربوں میں بھی سرایت کر گیا۔

ایرانیوں کے عمل دخل کے بعد تصوف کا وہ سلسلہ جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صفہ کے چبوترے پر شروع کیا تھا اپنا راستہ بدل کر عجمی رنگ اختیار کر گیا۔ ایران میں حسن بن صباح تک پہنچتے پہنچتے اسلامی تصوف عجمی تصوف بن چکا تھا۔ برصغیر میں عجمی تصوف نے ویدانت کا رنگ اختیار کر لیا۔ ہندوؤں کے سادھو سنت اور مسلمانوں کے

Marfat.com

درویشوں میں مطلق فرق باقی نہ رہا۔ چنانچہ سچل سرمستؒ اور لال شاہؒ جیسے درویش پیدا ہوئے۔ علامہ اقبال یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ایرانی اثرات نے روح اسلامی کے جوش ارتقاء پر جمود طاری کر دیا۔ اسلامی تصوف جو ہر لحظہ بدلتی ہوئی کائنات پر غور کرنے کا درس دیتا تھا، ایران کے مردہ نظریات کی زد میں آ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبالؒ ایسے تصوف کو اسلام میں ایک عجمی پودے کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

> ''ایران پر عربوں کے تسلط کے بعد سے ایرانی تفکر کی تاریخ میں ایک جدید عہد کا آغاز ہوتا ہے۔ لیکن صحرائے عرب کے جنگجو فرزند جنگی شمشیر نے اس قدیم قوم کی سیاسی آزادی کا ''نہاوند'' پر خاتمہ کر دیا تھا، ان نومسلم زرتشتیوں کی عقلی آزادی میں مزاحم نہ ہوسکے۔
>
> عربوں کی فتوحات سے جو سیاسی انقلاب رونما ہوا وہ آریائی اور سامی اقوام کے باہمی عمل واثر کی ابتداء کا باعث تھا۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ایرانی کی سطح زندگی پر اگرچہ زیادہ تر سامی رنگ چڑھ جاتا ہے لیکن وہ خاموشی کے ساتھ اسلام کو اپنی آریائی عاداتِ فکر میں تبدیل کر لیتا ہے۔ مغرب میں یونانیوں کے سنجیدہ ذہن نے ایک اور سامی مذہب ''مسیحیت'' کی شرح وتفسیر کی۔ دونوں جگہ اس شرح وتفسیر کے نتائج میں ایک عجیب وغریب مشابہت پائی جاتی ہے۔ شرح کرنے والے ذہن کا یہ مقصد تھا کہ اس اطلاقی قانون کی شدت وسختی کو رفع کیا جائے جو فرد پر خارج

Marfat.com

سے عائد کیا گیا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ خارجی نقطۂ نظر کو باطنی میں منتقل کرنے کی کوشش تھی۔ یونانی تفکر کے مطالعہ سے یہ عملِ تفسیر شروع ہوا جس نے اور دوسرے اسباب سے متحد ہو کر ذاتی تفکر کے نشو ونما کو روک دیا۔''

مذکورہ صدر پیرے میں ہم نے دیکھا کہ دونوں جگہ پہنچنے والا مذہب سامی تھا۔ یعنی محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے دین اور بنی اسرائیل کے مذہب کو علامہ اقبالؒ سامی قوم کے مذاہب کے طور پر جانتے ہیں۔ بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل دونوں ابراہیمؑ کی اولاد تھے۔ مزید اس پیرے میں ہم نے یہ دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے فطرت کا عمل کچھ اس طریقے سے جاری رکھا کہ مختلف ادوار میں بڑے توازن کے ساتھ خارج اور داخل کی قوتیں ایک دوسرے کے روبرو ہوئیں۔ خارج اور داخل، ظاہر اور باطن، علم آفاق اور علم انفس، یا مادی اور روحانی کے الفاظ ہمیشہ سے یونہی استعمال ہوتے چلے آئے ہیں۔ دنیا کی تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ کبھی وہ اقوام غلبہ پالیتی ہیں جن میں خارج کی طرف میلان بڑھا ہوا تھا۔ اور کبھی وہ اقوام غلبہ پالیتی ہیں جو باطن کی طرف میلان طبع رکھتی تھیں۔

دراصل علامہ اقبالؒ کا مقالہ تصوف کی تاریخ پر تو ہے نہیں۔ یہ بنیادی طور پر تو فلسفۂ ایران کا بیان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ترجمے کا نام فلسفہ عجم رکھا گیا......... لیکن کیا کریں؟ ہمیں تصوف کے فکری ارتقاء پر اور کوئی کتاب نہیں ملتی۔ علامہ اقبالؒ نے غالباً اسی ضرورت کے پیش نظر یہ مقالہ منتخب کیا تھا۔ ہمیں صوفیا کی تاریخ پر بے شمار مبسوط کتب نظر آتی ہیں۔ لیکن تصوف کا ارتقاء کس طرح ہوا؟ وہ کون سے عناصر تھے جو اس میں شامل رہے؟ فلسفیانہ نقطہ نگاہ سے روحانیت اور مادیت کے اثرات اسلامی فکر

پر کیونکر پڑے؟ ان سوالوں کے جوابات ہمیں حکایتوں اور قصے کہانیوں سے لبریز کتب مشائخ میں نہیں ملتے۔ علامہ اقبالؒ نے ایرانی ثقافت کی بالادستی کو تسلیم کیا ہے۔ ظاہر ہے یہ ایک قدرتی امر تھا۔ ایسا کیونکر ہو سکتا تھا کہ ہزاروں سال سے ایک بھرپور قسم کی تہذیب و ثقافت کے زیر اثر رہنے والے افراد معاشرہ کسی ایسی قوم کی عادات کو اپنا لیتے جس کی تہذیبی تاریخ نہ ہونے کے برابر تھی۔ ایرانیوں کی ثقافت' یا مسیحیت کے بعد یونانیوں کی ثقافت کا اثر سامی اقوام پر ہونا لازمی اَمر تھا۔ کیونکہ تہذیبی اعتبار سے ایرانی یا یونانی اپنے سامی بھائیوں کی نسبت بے پناہ ترقی یافتہ تھے۔ اس عمل کا اعادہ.......... ہم ''چنگیز خان'' کی اولاد میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔

چین کے ایک شمالی سرد صحرا ''منگولیا'' سے آ کر عظیم اسلامی سلطنت کے دل..... ''بغداد'' پر حملہ کرنے والے تاتاری جو بعد میں منگول یا مغل کہلائے اپنی تہذیب و ثقافت کو شمال کے سرد صحراؤں میں ہی چھوڑ آئے تھے۔ وہ مسلمانوں کو مفتوح بنانے کے لیے آئے تھے۔ انہوں نے تلوار چلائی، شہروں کے شہر چھین لیے لیکن چشم فلک نے ایک بار پھر یہ نظارہ دیکھا کہ تاتاری خود پوری طرح مغلوب ہو گئے۔ انہیں یہ یاد ہی نہ رہا کہ وہ کون تھے۔ سب کے سب مسلمان ہو گئے۔ یہاں تک کہ انہوں نے عربوں اور ایرانیوں کی ثقافت کو اپناتے ہوئے ذرا بھی برا محسوس نہ کیا۔

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے (اقبالؒ)

عربوں کا بھی یہی حال تھا۔ وہ صحرائی تھے، بدو تھے، جنگجو تھے، غیرت مند اور شجاع تھے لیکن کسی قدیم تہذیب کے ساتھ وابستہ نہ تھے۔ کسی ایسی تہذیب کے ساتھ جو ہزاروں سال میں دھیرے دھیرے تانا بانا بنی گئی ہوتی۔ وادیِ حجاز کا ہر قبیلہ آزاد تھا۔

Marfat.com

جبکہ اہل ایران رسم و رواج اور تہذیب و تمدن کی بندشوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے عربوں کا نعرۂ توحید سنا تو ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ مسلمان بھی ہو گئے لیکن اپنی ہزاروں سالہ پرانی عادات کبھی ترک نہ کر سکے۔

سچ تو یہ ہے کہ اسلام .... ہر خطے کے لیے ہے۔ ایسے لوگ جو محض ''عربیت'' کو اسلام کا نام دیتے ہیں ٹھیک نہیں کرتے۔ اسلام کسی وطن، قوم، تہذیب زبان اور ثقافت کو نہ تو رد کرتا ہے اور نہ ہی اسے نظر انداز کرتا ہے۔ اسلام کا خمیر ہی ایسے مادے سے بنایا گیا ہے جو ہر تہذیب، ہر ثقافت، ہر وطن اور ہر زبان میں یوں گھل مل جاتا ہے جیسے یہیں کا باسی ہو۔ ہم اسلامی تہذیب کو جب مختلف خطوں میں دیکھتے ہیں تو یہ دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں کہ چشم فلک نے کیسے کیسے مناظر دیکھے۔ جن کا عام طور پر ہم تصور بھی نہیں کرتے۔ مثلاً چند لمحوں کے لیے تصور کی آنکھ وا کیجیے اور دیکھیے! یورپ کے انتہائی اندرون بلکہ آخری ملک اندلس میں غرناطہ اور قرطبہ جیسے شہر آباد ہیں۔ جہاں کے مسلمان میزوں اور کرسیوں پر بیٹھ کر چھری کانٹے سے کھانا کھاتے ہیں۔ جہاں رہن سہن چال ڈھال اور زندگی کا رنگ و آہنگ یورپ کے مخصوص مزاج میں رنگا ہوا ہے۔ افکار کی بے باکی، فلسفے کا زور، ثقافت کا غرور، تعمیرات کا ذوق الغرض قدم قدم پر ہمیں اسلام اور یورپ یا یورپ اور اسلام ایک دوسرے میں گڈمڈ دکھائی دیتے ہیں۔ ہم اپنی چشم تصور کے دیدے گھماتے ہوئے استنبول پر نظر کرتے ہیں۔ تو ہمیں ایشیائے کوچک کے قدیمی باشندوں کی تمام تر روایات اپنی جگہ قائم و دائم دکھائی دیتی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ترک افواج درفش کاویانی (قدیمی پرچم) استعمال کرتی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے پاشا اپنی قدیمی تہذیب کے ساتھ پوری طرح چپکے ہوئے ہیں، استنبول سے آگے بڑھ کر ہم مغل اعظم اکبر کے دربار میں آ پہنچتے ہیں۔ یہ ہندوستان کی سرزمین ہے۔

Marfat.com

یہاں رام سیتا اور رادھا کشن کے افسانے زبان زد عام ہیں۔ اسلام موجود ہے لیکن زبان، ثقافت یا وطن پر کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ اسلام نے صرف ان چیزوں سے منع کر رکھا ہے جو بنیادی سلامتی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ یہ سمرقند ہو یا بخارا، دمشق ہو یا بغداد، دلی ہو یا لاہور، قرطبہ ہو غرناطہ اور تہران ہو یا استنبول، اسلام جہاں بھی گیا اس نے کسی ملک پر کوئی ثقافتی یا لسانی پابندی نہ لگائی۔ عرب، عرب رہے اور ایرانی اپنی مخصوص فطرت کے ساتھ ایرانی......... لیکن سب نے سلامتی کا راستہ قبول کر لیا جب کبھی بھی ''عربیت'' نے اپنی حدود سے تجاوز کر کے مفتوحہ ممالک میں غلبہ پانا چاہا ان ممالک کی اندرونی ثقافتی قوتیں عربیت کے خلاف برسرپیکار ہو گئیں۔

یہی وہ تصور ہے جو اپنے مقالے میں علامہ اقبالؒ ہمیں دکھاتے ہیں۔ لیکن علامہ اقبالؒ کی تحقیق کا میدان ایران کی سرزمین ہے۔ عربوں نے جب یہ محسوس کیا کہ ان کے قومی تشخص پر ایرانی ثقافت کی بے پناہ یلغار ہو چکی ہے تو انہوں نے اسلام کی اولین مخاطب قوم ہونے کے ناطے اپنی مفتوح قوم کو دبانے کی کوشش کی۔ وہ خود کو اسلام کا وارث سمجھتے تھے۔ نتیجتاً ایران میں ایسے مذاہب تصوف کا سلسلہ شروع ہو گیا جو عربوں سے متنفر تھے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے مقالے میں اسماعیلیہ تحریک کے بارے میں ایک جگہ یہ الفاظ لکھے ہیں:۔

> ''بدقسمتی سے اس تحریک کو اس زمانے کی سیاسیات سے جو تعلق تھا اس کی وجہ سے اکثر علماء کو غلط فہمی ہوئی۔ ان کو (مثلاً میکڈونلڈ) اس میں صرف یہی نظر آتا ہے کہ ایران سے عربوں کی سیاسی قوت کو مٹانے کی یہ ایک زبردست سازش تھی۔ انہوں نے اسماعیلیہ مذہب پر جس کے پیروؤں میں بعض اچھے دماغ اور مخلص

Marfat.com

دل کے لوگ بھی تھے، یہ الزام لگایا کہ یہ سنگدل قاتلوں کی ایک جماعت تھی جو ہمیشہ اپنے شکار کی تاک میں رہتی تھی۔ ان لوگوں کی سیرت کا اندازہ کرتے وقت ہم کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ انہوں نے نہایت ہی وحشیانہ ظلم و تعدی سے مجبور ہو کر اس خونریز تعصب کا انتقام لیا۔ مذہبی اغراض کے لیے قتل و خون ناقابل اعتراض سمجھا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ کل سامی نسل میں یہ جائز قرار دیا گیا تھا۔''

(فلسفۂ عجم)

تو گویا یہ ایک ردعمل تھا اس وحشیانہ ظلم و تعدی کے خلاف جو عرب، ایرانیوں پر روا رکھتے تھے۔ اسماعیلیہ تحریک تو اپنی شدت کے لحاظ سے ایک الگ حیثیت کی حامل ہے۔ ہم تصوف پر اس تحریک کے اثرات دیکھنے کی بجائے اسی موضوع کے ضمن میں ایرانی تفکر کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ اور اس لحاظ سے جو شخصیت ہمیں سب سے نمایاں نظر آتی ہے وہ ''ابو حامد امام غزالیؒ ہیں۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں

''اگر ہم الغزالی (المتوفی ۱۱۱۱ء) کے کارناموں کو نظرانداز کر دیں تو اشاعرہ کی مابعد الطبیعات کا ذکر بالکل نامکمل رہ جائے گا۔ غزالی کے متعلق اکثر راسخ العقیدہ متکلمین کو غلط فہمی ہوئی۔ ان کا شمار ہمیشہ اسلام کی عظیم الشان شخصیتوں میں ہوگا۔ اس مشکک نے جس کی قابلیت نہایت زبردست تھی اپنے فلسفیانہ اسلوب میں ڈیکارٹ کی پیش بینی کی تھی۔ (الغزالیؒ کی تصنیف ''احیاء العلوم الدین'' .... ڈیکارٹ کی ''ڈسکورس آن متھڈ'' سے ایسی عجیب و غریب مشابہت رکھتی ہے کہ اگر ڈیکارٹ کے زمانے میں

Marfat.com

اس کا کوئی ترجمہ ہوتا تو ہر شخص اس پر سرقہ (چوری) کا الزام لگا دیتا۔ بحوالہ لیوس، تاریخ فلسفہ، جلد دوئم۔ صفحہ 50) ہیوم نے علیت کی گرہ کو جدلیات کی دھار سے کاٹ دیا تھا۔ لیکن غزالی اس سے بھی پہلے شخص ہیں جنہوں نے فلسفہ کا ایک باقاعدہ رد لکھا۔ اور راسخ العقیدہ لوگوں پر عقلیت کا جو رعب چھا گیا تھا اس کو کامل طور پر زائل کر دیا۔ انہی کا یہ خاص اثر تھا کہ لوگ تحکمی عقائد کے ساتھ ساتھ مابعد الطبیعات کا مطالعہ کرتے تھے۔ اور اس سے ایک ایسا نظام تعلیم وجود میں آ گیا کہ جس سے شہرستانی، الرازی اور الاشراقی جیسے مفکرین پیدا ہوئے۔“

علامہ اقبالؒ ہمیشہ سے امام غزالیؒ کو فلسفۂ یونان کے خلاف شاہسوار اوّل سمجھتے ہیں۔ دراصل فلسفہ اور مذہب کے درمیاں یہ پیکار قدیمی ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ جب کبھی انبیاءؑ یا اولیاء کے زمانی ورود میں طویل وقفہ پڑ جاتا ہے تو بعض عقل پرست اپنی چرب زبانی اور نقطہ دانی کے زور پر عامۃ الناس کو انبیاء یا اولیاء کے بتائے ہوئے راستے سے ہٹانا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ عقل پرست فلسفی ہوتے ہیں۔ تمام تر اسلامی تاریخ میں اس طرح کی مثالیں جابجا موجود ہیں۔ امام غزالیؒ نے اپنے دور میں محسوس کیا کہ مسلمان مکمل طور پر یونانی فلسفہ کے زیر تسلط ہیں۔ انہوں نے دیکھا کہ علماء قرآن وحدیث کی تشریح یونانی عقائد کی روشنی میں کرتے ہیں تو وہ بے حد مغموم ہو گئے۔ تب امام غزالیؒ نے اپنی خداداد بصیرت سے یہ ثابت کر دکھایا کہ اسلام اور فکر اسلامی، یونانی یا ایرانی افکار سے بالاتر ہے۔ عرب، سامی النسل تھے۔ ایک جنگجو اور جسمانی طور پر فعال قوم۔ ان کے برعکس ایرانی آریائی تھے۔ جیسا کہ ایران کے نام سے ظاہر ہے۔ یہ عیش

وآرام کے دلدادہ اور ذہنی طور پر بے حد فعال تھے۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے عرب ایک ایسی زبان بولنے والے تھے جو صدیوں سے بدوی قبائل میں نسل درنسل پروان چڑھ رہی تھی، اور اس لحاظ سے ایک اُمّی یا فطری زبان تھی۔ اس میں شہریت کی آویزش نہ ہونے کے برابر تھی۔ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ نے آپ کو حضرت حلیمہؓ کے ہمراہ بھیج دیا تھا۔ جہاں رواج کے مطابق آپ کو خالص دیہی یا فطری زبان اپنانا تھی۔ یہی وجہ تھی کہ عربی زبان کے ایک ایک لفظ میں حقیقی، عملی تاثیر موجود تھی۔ یہاں یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ شہریت زدہ زبان ہمیشہ عملی تاثیر سے محروم ہوتی ہے۔ یہ عمل قدرتی طور پر وقوع پذیر ہوتا ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ شہروں کے لوگ جو مختلف علاقوں سے آ کر شہروں میں آباد ہوتے ہیں، مختلف زبانیں بولتے ہیں۔ لیکن جب وہ ایک دوسرے کے ساتھ کلام کرتے ہیں تو ایسے الفاظ کا سہارا لیتے ہیں جو سننے والے کے لیے آسان ہوں۔ نتیجتاً اہل زبان کے الفاظ کی حقیقی شکل میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ انسان کی زبان سے بولا جانے والا ہر لفظ اپنے ماخذ کے اعتبار سے بدوی، دیہاتی، امّی، ٹھیٹھ ہوتا ہے۔ کیونکہ اپنی پیدائش کے روز اول...... وہ لفظ کسی ہیت یا صوت کے لیے بولا گیا تھا۔ اپنی پیدائش کے پہلے روز وہ لفظ مادی معنویت کا حامل نہیں تھا۔ مثلاً کسی شخص کے گرنے پر ہم کہتے ہیں وہ ''دھڑام'' سے گر پڑا۔ دھڑام ایک امی لفظ ہے۔ جو محض ہیئت یا صوت کو سامنے رکھ کر وضع کیا گیا۔ اور وضع کرنے والے نے بھی غیر شعوری اور غیر ارادی طور پر ایسا کیا۔ لیکن تاثیر کے لحاظ جملے کی جو وضاحت دھڑام کا لفظ استعمال کرنے کے بعد ہوتی ہے وہ کسی اور لفظ سے نہیں ہوتی۔ گویا امی الفاظ عملی تاثیر کے حامل ہوتے ہیں۔ عرب قرن ہا قرن سے بدوی زندگی گزار رہے تھے۔ پورے عرب میں ممفس، پارساگرد ٹیکسلا، ایتھنز یا روما کی ٹکر کا کوئی شہر نہ تھا۔ یہی وجہ تھی

Marfat.com

کہ عربی زبان چھٹی صدی عیسوی تک ایک مکمل ''امی''، یعنی عملی تاثیر رکھنے والی زبان رہی۔ عربی زبان کا یہی کمال دنیا کی عظیم ترین کتاب کی آمد کا سبب ہوا۔ اور یقیناً عربوں میں عملی جوش وخروش یا عسکریت بھی اسی وجہ سے باقی تھی۔ لیکن جب اموی اور عباسی ادوار میں عربوں کے پاس دولت کی ریل پیل ہوگئی تو انہوں نے بھی بڑے بڑے شہر آباد کر لیے۔ اگر قرآن کریم باقی نہ رہتا تو عربی زبان بھی دوسری زبانوں کی طرح اپنی عملی تاثیر کھو دیتی۔ لیکن قرآن کریم وعدۂ الٰہی کے نتیجے میں باقی رہا۔ اور ہر دور میں اسے سمجھنے کے لیے عربی زبان کی ضرورت بالاتر رہی۔ گویا قرآن کی صورت میں عربی زبان یا عربوں کو بھی حیات جاوداں مل گئی۔ لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ بڑے بڑے شہر آباد کرنے اور اپنی اصلیت کو کھو دینے کے بعد بھی عرب دنیا پر اپنی حکمرانی کا حق جتاتے۔ چنانچہ عربوں کا یہ حق دوسری اقوام نے تسلیم نہ کیا اور ہر قوم نے اپنا قومی تشخص برقرار رکھنے کے لیے مسلسل جدوجہد کی۔ یہ تنازعہ بجائے خود فطرت کا ایک کرشمہ تھا۔ یوں گویا فطرت اسلام کے عالمگیر معانی ہر قوم پر واضح کرنا چاہتی تھی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے......... ''اچھی بات مومن کی گم شدہ پونجی ہے۔ یہ جہاں سے ملے حاصل کرلو''......... رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے کہ......... علم حاصل کرو چاہے تمہیں چین جانا پڑے''......... یوں گویا اسلام نے ہر قوم کی ثقافتی اہمیت، تسلیم کی۔ دراصل اس دنیا میں کچھ بھی اچانک درست نہیں ہوا اور نہ ہی ہوتا ہے۔ آدم یا برہما سے لے کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک طبق کے طبق اور منزل کے بعد منزل ہے۔ سگمنڈ فرائڈ نے کہا تھا......... ''انسانی تہذیب استوار ہی اس وقت ہوئی جب انسانوں نے اپنے جذبات کی عظیم قربانیاں پیش کیں''.........
آج کوئی مذہب یا کوئی فرقہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اسے اچانک ہدایت عطا کردی گئی ہے۔

Marfat.com

سب کے سب ایک دوسرے کے مرہون منت ہیں۔ غالباً فطرت کا مقصود ہر خطے میں اس کے فطری تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اسلام نافذ کرنا تھا۔ یہ گویا انسانیت کو امت واحدہ بنانے کی کوشش تھی۔ وادیِ فاران میں نعرۂ توحید گونجا تو گویا خاک کا ذرہ ذرہ جاگ اٹھا۔ یہ نعرہ آخری نعرہ تھا۔ جس کی گونج ابھی تک سنائی دے رہی ہے اور تا قیام بہشت سنائی دیتی رہے گی۔

علامہ اقبالؒ نے اپنے مقالہ میں ایک جگہ امام غزالیؒ کے اپنے الفاظ اس طرح نقل کیے ہیں۔:۔

''میں اپنے بچپن ہی سے اشیاء پر بطور خود غور و فکر کرنے کی طرف مائل تھا۔ اس میلان کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں نے سند کے خلاف بغاوت کی۔ اور ان تمام عقائد کی ابتدائی اہمیت زائل ہوگئی جو بچپن ہی سے میرے ذہن میں راسخ ہوگئے تھے۔ میں نے خیال کیا کہ ایسے عقائد جو محض سند پر مبنی ہوں، یہودیوں، عیسائیوں اور دیگر مذاہب کے پیروئین میں بھی پائے جاتے ہیں۔ حقیقی علم کا فرض ہے کہ تمام شکوک کی بیخ کنی کردے۔ مثلاً یہ بالکل بدیہی ہے کہ دس تین سے بڑی عدد ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے خلاف ثابت کرنا چاہے اور اس کی تائید میں عصا کو سانپ بنا دے تو یہ عمل محیر العقول ضرور ہوگا لیکن اس سے زیر بحث قضیہ کے متعلق ذرا بھر بھی تیقن پیدا نہ ہوگا۔

اس کے بعد انہوں نے علم الیقین کے تمام دعویداروں کا امتحان لیا اور بالآخر تصوف میں اس (علم الیقین) کو پالیا۔ اشاعرہ توحید کے زبردست حامی تھے۔ لیکن ماہیت جوہر کے اس تخیل کے ساتھ روح انسانی کی ماہیت پر محفوظ [illegible] نہیں کر سکتے تھے۔ صوفی [illegible]

Marfat.com

سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلے کو اٹھایا اور صحت کے ساتھ یہ بیان کرنا آج تک دشوار ہے کہ ماہیت خدا کے متعلق ان کا کیا خیال ہے۔ جرمنی کے ''بوربگر'' اور ''سولگر'' کی طرح ان میں بھی صوفیانہ وحدت الوجود اور اشاعرہ کا عقیدۂ شخصیت گھل مل گیا ہے۔ یہ ایسا امتزاج ہے کہ اس کی وجہ سے یہ بتلانا نہایت دشوار ہے کہ یہ محض وحدت الوجود کے قائل ہیں یا لوٹزے کی طرح شخصی وحدت الوجود کو مانتے ہیں۔ الغزالی کے خیال کے مطابق روح اشیاء کا ادراک کرتی ہے لیکن ادراک بحیثیت ایک عرض کے ایسے جوہر یا ذات میں قائم رہ سکتا ہے۔ جو جسمانی صفات سے کلیتاً پاک ہو۔''

امام غزالیؒ کے آخری الفاظ قابلِ غور ہیں........ ''جو جسمانی صفات سے کلیتاً پاک ہو'' .... یہ الفاظ اسی طرف اشارہ کرتے ہیں جس کا ذکر گذشتہ صفحات میں ہم نے کیا ہے۔ علامہ اقبالؒ عمر بھر اپنی شاعری میں چیونٹی اور شاہین کا موازنہ اسی لیے پیش کرتے آئے کہ آپ بھی جسمانی صفات سے کلیتاً پاک ہونے کا درس دینا چاہتے تھے۔ جو جس قدر زمین کے نزدیک ہے جسمانی صفات اسی قدر اس پر حاوی ہیں۔ شاہین فضا کی بلندیوں میں اپنا رزق تلاش کرتا ہے۔ گویا وہ زمینی آلودگیوں میں کم سے کم ملوث ہے۔ علامہ اقبالؒ کی نظم چیونٹی اور عقاب کا یہی موضوع ہے:

''چیونٹی''

میں پائمال و خوار و پریشان و دردمند
تیرا مقام کیوں ہے ستاروں سے بھی بلند

''عقاب''

تو رزق اپنا ڈھونڈتی ہے خاک راہ میں
میں نُہ سپہر کو نہیں لاتا نگاہ میں

Marfat.com

علامہ اقبالؒ کی تقریباً تمام شاعری اسی ایک درس پر مشتمل ہے۔ یہاں بہت اچھا لگے گا اگر ہم علامہ اقبالؒ کی ایک اور نظم ''ابوالعلاء معرّی'' کو دیکھ لیں۔

ابوالعلا معرّی

کہتے ہیں کبھی گوشت نہ کھاتا تھا معرّی
پھل پھول پہ کرتا تھا ہمیشہ گزر اوقات

اک دوست نے بھونا ہوا تیتر اسے بھیجا
شاید کہ وہ شاطر اسی ترکیب سے ہو مات

یہ خوانِ تر و تازہ معرّی نے جو دیکھا
کہنے لگا وہ صاحبِ غفرانؔ و لزومات

اے مرغکِ بیچارہ ذرا یہ تو بتا تو
تیرا وہ گنہ کیا تھا؛ یہ ہے جسکی مکافات

افسوس! صد افسوس! کہ شاہیں نہ بنا تو
دیکھے نہ تیری آنکھ نے فطرت کے اشارات

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

معرّی نے اپنے ہاتھ میں بھونے ہوئے تیتر کو تھام کر ایسا اس لیے کہا کہ وہ تیتر کے مقام سے واقف تھا، جو زمین سے جتنا قریب ہوگا، موت اس سے اتنی ہی قریب

ہوگی۔ جسمانی صفات سے کلیتًا پاک ہونا گویا سفلی یا زمینی احتیاجات سے پاک ہونا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے خطباب میں اس کے لیے (ارضی پیوستگی) "Earth Rootedness" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یعنی وہ.......... جس کی جڑیں زمین میں پیوست ہوں۔ اب ہم امام غزالیؒ کے الفاظ دوبارہ ملاحظہ کرتے ہیں:۔

''روح اشیاء کا ادراک کرتی ہے، لیکن ادراک بحیثیت ایک عرض کے ایسے جوہر یا ذات میں قائم رہ سکتا ہے جو جسمانی صفات سے کلیتًا پاک ہو۔''

علامہ اقبالؒ کو ایسا لگا کہ امام غزالیؒ نے اپنے تصور خدا کی وضاحت نہیں کی۔ حالانکہ امام غزالیؒ کے الفاظ سے ہی ان کے منفرد تصور خدا کی واضح جھلک دکھائی دیتی ہے۔ امامؒ چاہتے ہیں کہ جو ہر یا ذات جسمانی صفات سے کلیتًا پاک ہو گویا اسے اس بات کا فہم حقیقی حاصل ہو کہ جسمانی حاجات اس کی ہلاکت کا باعث بنتی ہیں۔ اور جسمانی حاجات سے بچتے ہوئے ذات مطلق کا ادراک کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک خالصتاً متصوفانہ راستہ ہے لیکن مجبوری یہ ہے کہ یہی راستہ انبیاءؑ نے اپنایا، یہی راستہ اصحاب صفہؓ کو بتایا گیا اور یہی راستہ ہی بقائے حقیقی کا ذریعہ ہے۔ امام غزالی نے آدمیوں کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے اس کا ذکر یوں کیا ہے:۔

''آدمیوں کی دو قسمیں ہیں، عوام اور مفکرین۔ اول الذکر (عوام) مادیت کو وجود کی شرط سمجھتے ہیں۔ وہ غیر مادی جوہر کا تعقل کرنے سے قاصر ہیں۔ اور آخر الذکر اپنی منطق کے ذریعہ سے روح کا ایسا تصور قائم کرتے ہیں۔ جو خدا اور انفرادی روح کے باہمی فرق کو بالکل مٹا دیتا ہے۔

الغزالیؒ نے محسوس کر لیا تھا کہ ان کی تحقیقات کا رخ وحدت الوجود کی طرف ہے۔ اور اسی وجہ سے روح کی انتہائی ماہیت کے متعلق انہوں نے سکوت اختیار کیا۔'' (فلسفہ عجم)

علامہ اقبالؒ نے امام غزالیؒ کے بارے میں یہ رائے قائم کی کہ انہوں نے قرآن کریم کی آیت، اللہ نور السموات والارض.......... کی تشریح کرتے ہوئے ایرانی تصور کی تائید کی۔ علامہ اقبالؒ نے امام غزالیؒ کی کتاب ''مشکوۃ الانوار'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس کتاب میں ان کی یہ تعلیم ہے کہ حقیقی وجود صرف نور ہی ہے اور عدم سے بڑھ کر کوئی ظلمت نہیں۔ لیکن نور کی حقیقت یا اقتضا، ظہور ہے۔ نور.......... ظہور کی صفت سے متصف ہے۔ جو ایک نسبت ہے۔ کائنات ظلمت سے خلق کی گئی ہے۔ جس پر خدا نے خود اپنا نور ڈالا۔ اس کے مختلف حصے کم یا زیادہ مرئی اس لیے ہیں کہ ان پر کم یا زیادہ روشنی پڑتی ہے۔ جس طرح اجسام تاریک مبہم یا منور ہونے کی حیثیت سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں اسی طرح انسانوں میں بھی فرق واختلاف ہے۔ بعض ایسے لوگ ہیں جو دوسری انسانی ہستیوں پر اپنی روشنی ڈالتے ہیں اور اسی لیے قرآن میں پیغمبر اسلام کو شمع منور کہا گیا ہے۔

مادی آنکھ ہستی مطلق یا نور حقیقی کے صرف خارجی مظہر کو دیکھ سکتی ہے۔ انسان کے دل میں ایک باطنی آنکھ بھی ہے۔ جو برخلاف مادی آنکھ کے اپنے آپ کو بھی اسی طرح دیکھ سکتی ہے جس طرح

Marfat.com

کہ دوسری اشیاء کو۔ یہ ایسی آنکھ ہے جو محدود سے آگے بڑھ کر مظاہر کا پردہ چاک کر دیتی ہے۔'' (فلسفۂ عجم)

تھوڑا سا آگے چل کر علامہؒ یوں لکھتے ہیں:۔

''یہ خیالات محض جراثیم تھے جو 'الاشراقی' کے فلسفہ اشراک میں نشو ونما پا کر بار آور ہوئے۔ اشاعرہ کے فلسفہ کا یہ ماحاصل تھا۔ اس ردعمل کا ایک کلامی نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے اس آزاد خیالی کے نشو ونما کو روک دیا جو مذہب کی اصابت کو منہدم کرنے کی طرف مائل تھا۔''

ابتدائی عیسوی صدیوں میں جب مسیحیت کو عروج کامل نصیب تھا اور ابھی عیسیٰ کی نورانیت قائم تھی.......... اسکندریہ میں علوم و دانش کا گلستان تیزی کے ساتھ پھل پھول رہا تھا۔ اسکندریہ کی لائبریری کو دنیا کی پہلی باقاعدہ لائبریری ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اسی لائبریری میں عظیم فلسفیوں اور سائنسدانوں نے ناقابل فراموش کارنامے سرانجام دیے۔ زمین گول ہے، کائنات افلاک و اجرام پر مشتمل ہے، مادے کا جوہر کائنات کی اکائی ہے..........وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کی سائنسی تحقیقات کا آغاز اسی لائبریری میں ہوا۔ لیکن موجودہ اسلام کی طرح ابتدائی عیسوی صدیوں کی مسیحیت بھی اپنا حقیقی رنگ کھو بیٹھی ہے۔ عیسائیت کے پاس تو قرآن کریم کی طرح کوئی محفوظ و مامون قانون بھی نہیں تھا۔ چنانچہ بہت جلد عظیم عیسائی سلطنت پر مذہبی پیشواؤں نے غلبہ پا لیا۔ اور پھر وہی ہوا جو ہمیشہ سے پیشوائیت کے غلبہ کے نتیجہ میں ہوتا آیا تھا۔ علوم و فنون کی نشو ونما رک گئی۔ اور سلطنت روما پوپ کے گھر کی لونڈی بن کے رہ گئی۔

Marfat.com

بغداد کی تباہی کے بعد بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ علامہ اقبالؒ نے اس ضمن اپنی زندگی کی آخری عظیم تصنیف

"The Reconstruction of Religious thougt in Islam"

میں مندرجہ ذیل حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے۔

''اس پر قیامت یہ ہوئی کہ تیرھویں صدی کا وسطی زمانہ آیا تو اسلامی دنیا کا ذہنی مرکز ''بغداد'' تباہ و برباد ہو کر رہ گیا۔ یہ ایسی شدید ضرب تھی کہ اس عہد کے جن مورخوں نے تاتاری حملوں کی تاریخ لکھی ہے، وہ بغداد کی تباہی کا حال بیان کرتے ہیں تو اس سے اسلام کے مستقبل کے بارے میں بڑی مایوسی ٹپکتی ہے۔ لہٰذا یہ ایک طبعی امر تھا کہ سیاسی زوال و انحطاط کے اس دور میں قدامت پسند مفکرین اپنی ساری کوششیں اس بات پر مرتکز کر دیتے کہ مسلمانوں کی حیات ملی ایک...... یک رنگ اور یکساں صورت اختیار کر لے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح ان میں مزید انتشار پیدا نہیں ہوگا۔ انہوں نے اس کا تدارک اس طرح کیا کہ فقہائے متقدمین نے قوانین شریعت کی تعبیر جس طرح کی تھی اس کو...... جوں کا توں برقرار اور ہر قسم کی بدعات سے پاک رکھا۔ وہ چاہتے تھے کہ جیسے بھی ممکن ہو اسلام کی ہیئتِ اجتماعیہ محفوظ رہے اور یہ اس لیئے کہ قوائے انحطاط کا سدِ باب نظم و ربط ہی سے ہوتا ہے۔ لیکن وہ نہیں سمجھے اور ہمارے زمانے کے علماء نہیں سمجھتے تو یہ کہ قوموں کی تقدیر اور ہستی کا دارومدار اس امر پر نہیں کہ ان کا وجود کہاں تک منظم ہے۔ بلکہ اس بات پر ہے کہ افراد کی ذاتی خوبیاں کیا ہیں۔ قدرت اور صلاحیت کیا ہے۔ یوں بھی جب معاشرہ حد سے زیادہ منظم ہو جائے تو اس میں فرد کی ہستی سرے

سے فنا ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش کے اجتماعی افکار کی دولت سے تو مالا مال ہو جاتا ہے، لیکن اپنی حقیقی روح کھو بیٹھتا ہے۔ اندریں صورت اگر قوم کے زوال و انحطاط کو روکنا ہے تو اس کا یہ طریق نہیں کہ ہم اپنی گزشتہ تاریخ کو بے جا احترام کی نظر سے دیکھنے لگیں، یا اس کا احیاء خود ساختہ ذرائع سے کریں۔ زمانۂ حال کے ایک مصنف نے کیا خوب کہا ہے.......... ''تاریخ کا فیصلہ ہے کہ جن فرسودہ خیالات کو خود کسی قوم نے فرسودہ کر دیا ہو، ان کی تجدید پھر اس قوم میں نہیں ہو سکتی۔'' لہٰذا قوائے انحطاط کے سدباب کا اگر کوئی ذریعہ فی الواقع موثر ہے تو یہ کہ معاشرے میں اس قسم کے افراد کی پرورش ہوتی رہے جو اپنی ذات اور خودی میں ڈوب جائیں۔ کیونکہ ایسے ہی افراد ہیں جن پر زندگی کی گہرائیوں کا انکشاف ہوتا ہے اور ایسے ہی افراد، وہ نئے نئے معیار پیش کرتے ہیں، جن کی بدولت اس امر کا اندازہ ہونے لگتا ہے کہ ہمارا ماحول سرے سے نا قابل تغیر و تبدل نہیں۔ اس میں اصلاح اور نظر ثانی کی گنجائش ہے۔ یوں بھی ماضی کا غلط احترام، علیٰ ھٰذا ضرورت سے زیادہ تنظیم کا وہ رجحان جس کا اظہار تیرھویں صدی اور بعد کے فقہاء کی کوششوں سے ہوتا ہے، اسلام کی اندرونی روح کے منافی تھا۔''

تصوف کا ماخذ اور قرآن سے جواز

نوٹ: یہاں سے لے کر ''حقیقت بحیثیتِ فکر'' کی سرخی تک تمام مواد حضرت علامہ اقبالؒ کے نایاب مقالہ ''ایران میں مابعد الطبیعات کا ارتقاء'' کے باب پنجم سے لیا گیا ہے۔ اس حصہ میں علامہؒ صاحب نے نہایت خوبی سے تصوف کی تاریخ کا وسطی عہد بیان کیا ہے۔ قارئین کو اس سے فائدہ ہوگا' یہی سوچ کر علامہ صاحب کے مقالہ کا ترجمہ کا ایک مختصر حصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

''جدید مستشرقین کی عادت ہوگئی ہے کہ وہ اثرات کی کڑیاں ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ یہ عمل یقیناً تاریخی حیثیت کا حامل ہے۔ لیکن اس صورت میں' جب ہم اس حقیقت کو نظر انداز نہ کر دیں کہ انسانی ذہن اپنی ایک مستقل اور آزاد انفرادیت رکھتا ہے۔ اور عمل کے لیے وہ خود اپنی ذات کے اندر ہی تحریک رکھتا ہے جو بتدریج اپنی تہہ سے سچائی کو نمو دیتی ہے۔ ایسی سچائی جس کی پیشگوئی مدتوں پہلے دوسرے اذہان کر چکے ہوں۔ کوئی نظریہ کسی قوم کی روح کو گرفت میں نہیں لے سکتا جب تک وہ بعض پہلوؤں سے اس قوم کا اپنا نظریہ نہ ہو۔ خارجی اثرات اس قوم کے نظریہ کو خواب غفلت سے بیدار کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ اسے عدم سے وجود میں نہیں لا سکتے۔

ایرانی تصوف کے ماخذ کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس دلچسپ

Marfat.com

میدان تحقیق کے محققین نے ان راستوں کی تلاش میں اپنی قابلیت صرف کر دی جن سے گزر کر تصوف کے بنیادی تصور نے ایک جگہ سے دوسری جگہ تک سفر کیا اور تقریباً ہر کسی نے ایسا ہی کیا ہے۔ ان محققین نے اس اصول کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے کہ کسی قوم کے عقلی ارتقاء کے مظہر کی کما حقہٗ تحقیق اسی صورت ممکن ہے جب ہم اس قوم کے گزشتہ، عقلی، سیاسی اور سماجی حالات کی روشنی میں اس پر نظر ڈالتے ہیں۔ وان کریمر اور ڈوزی نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ایرانی تصوف ''انڈین ویدانت'' کے بطن سے پیدا ہوا۔ مرکس (Merx) اور مسٹر نکولس نے اسے ''نوفلاطونیت'' سے ماخوذ قرار دیا ہے۔ اور پروفیسر براؤن نے اسے ''آریائی ردِعمل'' قرار دیا ہے جو ''خشک سامی مذہب'' کے خلاف پیدا ہوا۔ بہرحال مجھے یوں لگتا ہے جیسے یہ تمام نظریات ایک ایسے تصور تعلیل کے تحت معرض وجود میں آئے جو سراسر غلط ہے۔ اور وہ تعلیل یہ ہے کہ ایک معینہ مقدار ''A''...... ایک اور، معینہ مقدار ''B'' کو پیدا کرتی.......... یا اس کی وجہ بنتی ہے۔ یہ ایک ایسا قضیہ ہے جو سائنسی مقاصد کے لیے تو مناسب ہو سکتا ہے لیکن جب اس کی رہنمائی میں ہم ان کثیر التعداد حالات و واقعات کو نظر انداز کر دیتے ہیں.......... جو واقعہ یا حادثے کی وجہ ہوتے ہیں۔ تو اس سے ہماری کل تحقیقات کو صدمہ پہنچتا ہے۔ مثلاً یہ کہنا ایک تاریخی غلطی ہوگی کہ بربروں کے حملے سلطنت روما کے انتشار کا سبب تھے۔ اس بیان میں ان قوتوں کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے جن کی نوعیت بالکل مختلف تھی، اور جو اس سلطنت کے سیاسی اتحاد کے انتشار کا باعث تھیں۔ بربروں کے حملوں کو سلطنت روما کے زوال کی عِلّت قرار دینا، حالانکہ یہ سلطنت اس نام نہاد علت کو اپنے اندر جذب کر سکتی تھی اور ایک حد تک اس نے ایسا کیا بھی تھا.......... ایک ایسا طرز استدلال ہے جس کو کوئی منطق جائز نہ رکھے گی۔ لہٰذا ہم ایک صحیح نظریۂ تعلیل کی روشنی میں اسلامی زندگی کے ان

خاص خاص سیاسی، اجتماعی اور عقلی حالات کو پیش کریں گے جو آٹھویں صدی کے اختتام اور نویں صدی کے نصف اول میں پائے جاتے تھے۔ اس زمانہ میں زندگی کا صوفیانہ نصب العین، صحیح معنوں میں وجود میں آیا اور اس کے بعد ہی اس نصب العین کا فلسفیانہ جواز بھی پیش کیا گیا۔

(۱) جب ہم اس زمانہ کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم کو یہ کم وبیش سیاسی بے چینی کا زمانہ نظر آتا ہے۔ آٹھویں صدی نصف آخر میں اس سیاسی انقلاب کے باوجود جس نے سلطنت امیہ (749ء) کو الٹ دیا تھا......... اور بھی واقعات ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ جیسے ''زنادقہ'' پر ظلم و تعدی۔ ایرانی ملحدین کی بغاوت وغیرہ (سندیہ 755 تا 756، استہ دس...... 776 تا 768، خراسان کا نقاب پوش پیغمبر 777 تا 778) ان لوگوں نے عوام کی مذہب پسند طبیعت سے فائدہ اٹھا کر اپنے سیاسی منصوبوں کو مذہبی تصورات کے بھیس میں پیش کیا۔ اس کے بعد نویں صدی کے آغاز میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہارون الرشید کے بیٹے (مامون اور امین) سیاسی اقتدار کے لیے ایک زبردست جنگ میں مصروف ہیں۔ اس کے کچھ زمانہ بعد ہی اسلامی ادبیات کے عہد زریں کو بابک کی مسلسل بغاوت سے ایک سخت صدمہ پہنچتا ہے (816 تا 838)۔ مامون کی حکومت کے ابتدائی زمانے میں ایک دوسرا اجتماعی واقعہ ظہور میں آتا ہے جس کی سیاسی اہمیت بہت بڑی ہے...... یعنی بعض آزاد ایرانی خاندانوں کے آغاز واستحکام کے ساتھ (طاہریہ، صفاریہ، سامانیہ) شعوبیہ کی چپقلش شروع ہو جاتی ہے۔ الغرض یہ اور اسی قبیل کے دیگر حالات کی متحدہ قوت نے ایسے لوگوں کو......... جن کی سیرت زاہدانہ واقع ہوئی تھی، اس مسلسل بے چینی کے منظر سے ہٹا کر ایک پرسکون مراقبہ کی زندگی کی طرف مائل کر دیا۔ ان ابتدائی مسلمان مرتاضین کی حیات و

Marfat.com

فکر کی سامی نوعیت کے ساتھ ساتھ وحدت الوجود کا ایک وسیع نظریہ بتدریج وجود میں آ گیا۔ جس پر کم وبیش آریائی رنگ چڑھا ہوا تھا۔ اس نظریہ کا ارتقاء ایران کی سیاسی آزادی کے نشو ونما کے متوازی تھا۔

(۲) اسلامی عقلیت کے شک وشبہ کے رجحانات میں ابتدا ''بشار ابن برد'' کی نظموں میں رونما ہوئے۔ یہ ایک نابینا ایرانی متشکک تھا۔ جس نے آگ کو الوہیت کا درجہ دیا تھا۔ اس کو فکر کے تمام غیر ایرانی طریقوں سے نفرت تھی۔ عقلیت میں شکوک و شبہات کے جو جراثیم پوشیدہ تھے انہوں نے بالآخر ایک ایسے مبدء علم کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کر دیا.......... جو فوق العقل ہے۔ سب سے پہلے اس کا اثبات رسالہ ''تشیری'' میں کیا گیا (986)۔ خود ہمارے زمانے میں ''کانٹ'' کی ''تنقید عقل خالص'' (Critique of pure reason) کے سلبی (منفی) نتائج نے ''جاکوبی'' اور ''شلائر ماخر'' کو مجبور کر دیا کہ مذہب کو حقیقت مثالی کے احساس پر مبنی کر دیں۔ انیسویں صدی کے متشکک کے لیے ''ورڈس ورتھ'' نے ذہن کی اس پر اسرار حالت کو منکشف کر دیا، جس میں ہم بالکل روحانی ہستی بن کر اشیاء کی حیات کا راز معلوم کر لیتے ہیں۔

(۳) اسلام کے مختلف فرقوں جیسے حنفی (ابو حنیفہ المتوفی 767ء)، شافعی (الشافعی المتوفی 820ء)، مالکی (المالک المتوفی 795ء)، اور مذہب تشبیہ کے پیرو حنبلی (ابن حنبل المتوفی 795ء) کا خشک تقدس، جو آزاد خیالی کا سخت ترین دشمن تھا.......... ''المامون'' کے بعد عوام پر اسی کی حکومت رہی۔

(۴) مختلف فرقوں کے نمائندوں کے مابین مذہبی مناظرے جو المامون کی سرپرستی میں ہوا کرتے تھے، اور خاص کر...... وہ تلخ دینیاتی چپقلش، جو اشاعرہ اور علم

Marfat.com

برداران عقلیت کے مابین واقع ہوئی تھی۔ اس کا نتیجہ نہ صرف یہ ہوا کہ مذہب کو انہی فرقوں کی حد تک محصور کر دیا گیا بلکہ ان معمولی چپقلشوں سے بالاتر ہونے کی روح بھی بیدار ہوگئی۔

(۵) دور عباسیہ کے ابتدائی زمانے میں عقلیت کے میلان کے اثر سے مذہبی جوش بتدریج ٹھنڈا ہونے لگا دولت کی روز افزوں فراوانی سے اخلاقی احساس دبتا گیا، اور اسلام کے اعلیٰ طبقوں میں مذہبی زندگی سے بے اعتنائی برتی جانے لگی۔

(۶) مسیحیت زندگی کے ایک قابل عمل، نصب العین کی حیثیت سے موجود تھی۔ خاص کر عیسائی راہبوں کی اصل زندگی نہ کہ ان کی مذہبی تصوریت .... نے ابتدائی اسلامی اولیاء کے اذہان پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ دنیا سے ان کی بے تعلقی .... گو وہ بذات خود بہت ہی دلکش ہے، لیکن میرے خیال میں یہ اسلامی روح کے بالکل منافی ہے۔

تصوف کا خاص طور پر یہی ماحول تھا .... جن حالات کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ ان کے متحدہ عمل ہی میں ہم کو صوفیانہ تصورات کے ماخذ و نمو کا سراغ لگانا چاہیے۔ ان حالات کی واقفیت سے اور یہ معلوم کر لینے کے بعد کہ ایرانی ذہن میں توحید کی طرف باطنی میلان تھا، تصوف کی پیدائش اور نشوونما کے واقعہ کی پوری توجیہہ ہو سکتی ہے۔ اگر ہم ان حالات کا مطالعہ کریں جو نو فلاطونیت کے وجود میں آنے سے پہلے موجود تھے .... تو ہم کو معلوم ہو جائے گا کہ ایک قسم کے حالات ایک ہی قسم کے نتائج مرتب کرتے ہیں۔ بربروں کے حملوں نے، جو محلات کے شہنشاہوں کو خیموں کے شہنشاہ بنا رہے تھے .... تیسری صدی کے اوائل میں ایک بالکل سنجیدہ حیثیت اختیار کر لی۔ خود ''فلاطینوس'' اپنے زمانے کی سیاسی بے چینی کا ذکر ایک خط میں کرتا ہے جو ''فلیکس''

Marfat.com

کا موسومہ [1] ہے۔ جب وہ اپنے وطن اسکندریہ پر نظر ڈالتا ہے تو اس کو رواداری اور مذہبی زندگی سے بے اعتنائی کی علامات ہر جگہ دکھائی دیتی ہیں۔ اس کے بعد روما کی' جو مختلف اقوام کا اکھاڑہ بن گیا تھا؟.......... زندگی میں اسی طرح سنجیدگی کا فقدان پایا جاتا اور سوسائٹی کے اعلیٰ طبقوں کی سیرت میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ میں فلسفہ کا مطالعہ فلسفہ کی خاطر نہیں بلکہ ادبیات کے ایک شعبہ کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ Antiochus کے اس میلان سے کہ ارتیابیت اور رواقیت کو مخلوط کر دیا جائے ''سکس ٹس امپریکس'' متاثر ہوکر ''پرہو'' کی قدیم مخلوط ارتیابیت کی تعلیم دے رہا ہے۔ اسی عقلی مایوسی نے فلاطینوس کو مجبور کر دیا کہ صداقت کو الہام میں تلاش کرے، جو فکر سے بالاتر ہے۔ اس کے سوا...... رواقی اخلاق جن کی نوعیت خشک اور غیر جذبی تھی اور عیسیٰؑ کے پیروئین کا تقدس جو طویل اور خونخوار ظلم وتعدی سے بے خوف ہوکر دنیائے روما کو امن ومحبت کا پیغام دے رہے تھے.......... ایسی چیزیں تھیں' جن کی وجہ سے یہ لازمی تھا کہ بت پرستوں کے تفکر کی اس طرح تفسیر کی جائے کہ اس سے زندگی کے قدیم نصب العین کا احیاء ہو سکے۔ اور لوگوں کی جدید روحانی ضروریات کی تشفی ہو جائے۔ لیکن مسیحیت کی اخلاقی قوت بہت ہی زبردست تھی۔ ''نوفلاطونیت'' زیادہ تر مابعد الطبعی [2] تھی۔ عوام کے لیے اس کا کوئی خاص پیغام بھی نہ تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ غیر مہذب

۱- ''ہم کو یہ خبر ملی ہے کہ ''ولیرین'' کو شکست ہوگئی اور وہ ''سیپر'' کے ہاتھ قید ہوگیا ہے، فرنک، المائی گاتھ اور ایرانیوں کی دھمکیاں روما کے لیے خطرناک ہیں۔'' فلاطینوس کا خط فلیکس کے نام۔ اس کا حوالہ Vaughan نے اپنی کتاب ''نصف گھنٹہ صوفیا کے ساتھ'' میں دیا ہے''

۲- وجد کا عنصر جو بعض اذہان کو متاثر کر سکتا تھا اس کو نوفلاطونیت کے متاخر معلمین نے پس پشت ڈال دیا، اسی وجہ سے وہ محض نظام فکر بن کر رہ گیا اور اس میں کوئی انسانی دلچسپی نہ رہی۔'' ''وناکر'' کہتا ہے:۔ ''صوفیانہ وجد اس مکتب کے متاخر معلمین کیلئے نہ صرف ناقابل حصول بلکہ نہایت دشوار تھا، اور یہ میلان ترقی کرتا گیا کہ اس دنیا میں ناقابل حصول ہے''۔ ''نوفلاطونیت'' ص ۱۰۱۔

بربروں کی اس تک رسائی نہ ہو سکی۔ ان بربروں نے مظلوم عیسائیوں کی واقعی زندگی سے متاثر ہو کر مسیحیت کو قبول کر لیا اور قدیم سلطنت کے کھنڈروں میں سے ایک جدید سلطنت تعمیر کرنی شروع کی۔

ایران میں بھی مختلف تہذیبوں اور مختلف تصورات کے نشو ونما کے اثر نے بعض اذہان میں یہ مبہم سی خواہش پیدا کر دی کہ اسلام کی بھی اسی طرح تفسیر کی جائے۔ اس میلان نے مسیحی نصب العین اور مسیحی تفکر کو بتدریج اپنے اندر جذب کر لیا تھا اور قرآن میں اس کو مستحکم بنیاد بھی مل گئی۔ مسیحیت کی پھونکوں کے آگے یونانی تفکر کا پھول مرجھا گیا۔ لیکن ''ابن تیمیہ'' کی ہجو آمیز آتش نفسی ایرانی پھول کی تازگی کو چھو تک نہ سکی۔ اول الذکر کو بربروں کے حملوں کا سیلاب بہا لے گیا، اور آخر الذکر نے تاتاری انقلاب سے غیر متاثر رہ کر اپنے آپ کو برقرار رکھا۔

صوفیاء نے اسلام کی جو تفسیر کی ہے اس کی غیر معمولی قوت کی توجیہہ اسی وقت ممکن ہے، جبکہ تصوف کی جامع اور محیط تشکیل پر غور کیا جائے۔ سامی قوم کے ہاں نجات کا جو اصول تھا اس کو مختصراً ان الفاظ میں بیان کر سکتے ہیں .... ''اپنے ارادہ کو متبدل کر دو۔'' جس کے معنی یہ ہیں کہ سامی قوم ارادہ کو روح انسانی کا جوہر خیال کرتی تھی اس کے برعکس ہندی ویدانت یہ تعلیم دیتی ہے کہ آلام کی وجہ یہ ہے کہ ہم کائنات کے متعلق غلط نقطۂ نظر اختیار کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ ہماری عقل کو متبدل کرنے کا حکم دیتی ہے۔ یہ لازم آتا ہے کہ انسان کی اصل، ماہیت فکر پر مشتمل ہے نہ کہ فعلیت یا ارادہ پر۔ لیکن صوفی کا دعویٰ ہے کہ محض ارادہ یا عقل کو متبدل کر دینے سے طمانیت حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہم کو چاہیے کہ احساس کی مکمل تبدیلی کے ذریعہ عقل و ارادہ دونوں کو تبدیل کر دیں، کیونکہ عقل و ارادہ محض دو مخصوص صورتیں ہیں احساس کی۔ فرد کے لیے اس کا یہ

Marfat.com

پیغام ہے.......... ''سب سے محبت کر، دوسروں کی بہبود میں اپنی شخصیت کو بھول جا۔''
''مولانا رومؒ'' فرماتے ہیں:۔

دل بدست آور کہ حج اکبر است
از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

لیکن اس اصول کے متعلق ''کیوں'' اور ''کس طرح'' جیسے سوالات اٹھانے پڑتے ہیں۔ یعنی اس نصب العین کو مابعد الطبیعی جواز کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاکہ اس سے عقل کی تشفی ہو سکے، اور ایسے قواعدِ فعل دریافت ہو جائیں جن سے ارادہ کی رہنمائی ہو سکے۔ تصوف میں یہ دونوں باتیں موجود ہیں۔ سامی مذہب کردار کے قواعد کا ایک ضابطہ ہے لیکن اس کے برعکس ہندی ویدانت ایک خشک نظام فکر ہے۔ تصوف ان کی ناقص نفسیات سے گریز کرتا ہے اور محبت کے اعلیٰ کلیہ کے تحت سامی اور آریائی اصولوں کو متحد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک طرف تو وہ بدھ مت کے تصور ''نروان'' (فنا) کو اپنے اندر جذب کر کے اس تصور کی روشنی میں ایک مابعد الطبیعی نظام تعمیر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور دوسری طرف وہ اسلام سے بے تعلق ہونا نہیں چاہتا، اور کائنات سے متعلق اپنے نقطۂ نظر کا جواز قرآن سے پیش کرتا ہے۔ وہ اپنے مقام پیدائش کے جغرافیائی موقع و محل کی طرح خود بھی آریائی و سامی مذاہب کے اثرات کے وسط میں واقع ہے۔ اور دونوں طرف سے وہ تصورات کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ لیکن خود ان پر بھی اپنی شخصیت کا رنگ چڑھا دیتا ہے۔ اس کی نوعیت زیادہ تر آریائی ہے نہ کہ سامی۔ لہٰذا یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ تصوف کی قوت کا راز اس بات میں پوشیدہ ہے کہ فطرت انسانی کے متعلق اس کا نقطۂ نظر بہت ہی جامع اور مکمل ہے۔ اور اسی نقطۂ نظر پر وہ مبنی بھی ہے۔ یہ راسخ العقیدہ لوگوں کے ظلم و تعدی اور سیاسی انقلابات میں صحیح و

Marfat.com

سلامت نکل آیا۔ کیونکہ یہ فطرت انسانی کے تمام پہلوؤں کو متاثر کرتا ہے۔ وہ اپنی دلچسپی تو ایسی زندگی پر مرتکز کر دیتا ہے جو انکار خودی پر مشتمل ہے اور ساتھ ہی ساتھ آزاد خیالی کے میلان میں مزاحمت بھی نہیں کرتا۔

میں اجمالی طور پر یہ بتاؤں گا کہ صوفی مصنفیں اپنے اپنے خیالات کو قرآن کے نقطۂ نظر سے کس طرح جائز قرار دیتے ہیں۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کوئی تاریخی شہادت موجود نہیں ہے کہ پیغمبرؑ عرب نے فی الواقع حضرت علیؓ یا حضرت ابو بکرؓ کو کوئی باطنی علم سکھلایا تھا۔ بہر صورت صوفیاء کا یہ دعویٰ ہے کہ پیغمبر علیہ السلام نے قرآن کی تعلیم کے علاوہ ایک باطنی تعلیم (حکمت) بھی دی تھی۔ اس دعویٰ کی تائید میں وہ قرآن کی حسب ذیل آیت پیش کرتے ہیں۔

"کما ارسلنا فیکم رسولاً منکم یتلو علیکم ایاتنا ویزکّیکم و یُعَلِّمُکُم الکتاب و الحکمة و یعلمکم مالم تکونوا تعلمون ٥"[۴۲]

(سورۃ البقرہ۔ آیت نمبر 151)

جس طرح ہم نے تم میں سے ایک رسول بھیجے ہیں جو تم کو ہماری آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے اور تمہیں پاک بناتے اور کتاب اور دانائی (حکمت) سکھاتے ہیں اور ایسی باتیں بتاتے ہیں جو تم پہلے نہیں جانتے تھے۔ (سورۃ بقرہ آیت نمبر ۱۵۱)

ان کا یہ خیال ہے کہ "حکمت" کا جو ذکر اس آیت میں کیا گیا وہ ایسی چیز ہے جس کو قرآن کی تعلیم میں بیان نہیں کیا گیا۔ خود پیغمبر علیہ السلام نے بارہا فرمایا ہے کہ قرآن کی تعلیم آپ سے پہلے کے پیغمبروں نے بھی دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر اس "حکمت" کو قرآن میں بیان کر دیا گیا ہے، تو اس آیت میں "حکمت" کا جو لفظ آیا ہے وہ حشو و

زوائد ہوگا۔ میرے خیال میں یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ قرآن و احادیث صحیحہ میں صوفیانہ نظریہ کی طرف اشارات موجود تھے۔لیکن وہ عربوں کی خالص عملی ذہانت کیوجہ سے نشو ونما پا کر بار آور نہ ہو سکے۔ جب ان کو ممالک غیر میں موزوں حالات میسر آ گئے تو وہ ایک جداگانہ نظریہ کی صورت میں جلوہ گر ہوئے۔قرآن نے ایک مسلمان کی حسب ذیل تعریف کی ہے۔

الذین یومنون بالغیب و یقیمون الصلوٰۃ و مما رزقنا ھم ینفقون۔(سورۃ بقرہ آیت نمبر۲)

ترجمہ: جو غیب پر ایمان لاتے ہیں اور صلاۃ قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں عطا فرمایا ہے اُس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

(سورۃ بقرہ آیت نمبر۲)

لیکن اس غیب کے متعلق ''کیا'' اور ''کیوں'' جیسے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔اس کا قرآن نے یہ جواب دیا ہے کہ یہ ''غیب'' تمہاری ہی روح کے اندر ہے۔

وفی الارض ایات للموقنین و فی انفسکم افلاتبصرون۔

اور یقین کرنے والوں کے لیے زمین میں نشانیاں ہیں اور خود تمہارے نفوس میں تو کیا تم دیکھتے نہیں۔ (آیت نمبر ۲۱،۲۰ سورۃ الذاریٰت)

اور پھر کہتا ہے:

ونحن اقرب الیہ من حبل الورید (سورۃ ق۔ آیت ۱۶)

اور ہم اُس کی رگِ جاں سے بھی اُس سے زیادہ قریب ہیں۔

اس طرح قرآن کی تعلیم ہے کہ اس ''غیب'' کی اصل ماہیت خالص نور ہے۔

اللہ نور السموات والارض (سورۃ النور۔ آیت ۳۵)

Marfat.com

ترجمہ: اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔

اس سوال کے متعلق کہ آیا...... نور اولیٰ شخص ہے۔ قرآن نے شخصیت کے تصور کو مختلف عبارتوں میں پیش کرنے کے باوجود مختصر الفاظ میں یہ جواب دیا ہے کہ......

لیس کمثله شیئی (سورۃ شوریٰ۔ آیت ۱۱)

ترجمہ: ''اُس جیسی کوئی چیز نہیں''۔ (سورۃ شوریٰ آیت نمبر ۱۱)

یہ چند خاص آیات ہیں، جن کی بناء پر صوفی مفسرین نے کائنات کے ایک وحدت الوجودی نقطۂ نظر کو نمود دیا ہے، یہ لوگ روحانی تربیت کے حسب ذیل چار منازل پیش کرتے ہیں۔ روح کو امر ربی (سورۃ بنی اسرائیل۔ آیت ۸۵) کہا جاتا ہے......قل الروح من امر ربی......تو جب روح ادنیٰ درجہ سے ترقی کر کے اشیاءِ عالم کے مبداء سے اتحاد و وصل کی خواہش کرے تو اس کو مندرجہ ذیل منازل میں سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔

(۱) ایمان بالغیب

(۲) غیب کی جستجو۔ اگر ان عجیب و غریب مظاہر قدرت کا مشاہدہ کیا جائے تو تحقیق و جستجو کی روح اپنی نیند سے بیدار ہو جاتی ہے......

افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت والی السمآء کیف رفعت والی الجبال کیف نُصِبَت.

ترجمہ: کیا یہ لوگ اونٹوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ کیسے پیدا کیے گئے اور آسمان کی طرف کہ کیسا بلند کیا گیا اور پہاڑوں کی طرف کہ کس طرح کھڑے کیے گئے۔ (سورۃ الغاشیہ آیت نمبر ۱۷، ۱۸، ۱۹)

(۳) علم الغیب۔ جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں...... یہ اس وقت حاصل ہوتا ہے

Marfat.com

جب ہم اس کو اپنی روح کی گہرائیوں میں تلاش کرتے ہیں۔

(۴) تحقق .... اعلیٰ درجے کے تصوف میں یہ عدل واحسان کی مسلسل مشق سے حاصل ہوتا ہے۔

ان اللہ یامر بالعدل و الاحسان و ایتآئ ذی القربیٰ و ینھی عن الفحشاء والمنکر و البغی یعظکم لعلکم تذکرون.

ترجمہ: اللہ تم کو انصاف اور احسان کرنے اور رشتہ داروں (قربیٰ) کو دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی سے منع کرتا ہے۔ اور نامعقول کاموں اور سرکشی سے منع کرتا ہے اور تم کو نصیحت کرتا ہے تاکہ تم یاد رکھو۔ (سورۃ النحل آیت نمبر ۹۰)

تاہم یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ مابعد کے صوفیانہ فرقوں نے (جیسے نقشبندیہ) اس تحقیق کو حاصل کرنے کے دوسرے ذرائع بھی ایجاد کیے یا یوں کہو کہ ہندی ویدانتوں سے ان کو مستعار لیا۔[۱]

کنڈالینی کے ہندی نظریہ کی تقلید میں انہوں نے یہ تعلیم دی کہ جسم انسانی میں مختلف رنگوں کی روشنی کے چھ مراکز ہیں۔ صوفی کا مطمحِ نظر یہ ہوتا ہے کہ مراقبہ کے چند طریقوں کے استعمال سے ان کو متحرک کرے، اور اس کے ذریعہ رنگوں کی ظاہری کثرت وتعدد میں سے بالآخر اس اساسی نور کو متحقق کرلے جو بے رنگ ہے۔ اور جس

۱۔ ''ویبر'' نے حسب ذیل خیال ''لاسن'' کی سند پر پیش کیا ہے۔ ''البیرونی'' نے ''پتن جلی'' کی تصنیف کا گیارھویں صدی کے آغاز میں عربی زبان میں ترجمہ کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے سانکھیا سوترا کا بھی ترجمہ کیا تھا۔ لیکن جو باتیں ان تصانیف میں مذکور ہیں وہ اصلی سنسکرت نسخوں سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ (تاریخ ادبیات ہند۔ ص ۲۳۹)

Marfat.com

کیوجہ سے ہر شے دکھائی دیتی ہے۔ لیکن وہ خود غیر مرئی ہے۔ جسم کے توسط سے ان مراکز نور کی مستمر حرکت اور بالآخر ان کی مماثلت کا تحقق (مختلف اسماء الہٰی اور دیگر پر اسرار کلمات کے ورد سے جسم کے سالمات' حرکت کے ایک متعین راستہ پر پڑ جاتے ہیں۔ اور اس سے مراکز نور کی مماثلت کا تحقق ہوتا ہے) صوفی کے پورے جسم کو منور کر دیتا ہے۔ یہ تمام طریقے ایرانی صوفیاء کو معلوم تھے۔ ''وان کریمر'' کو ایک غلط فہمی ہوگئی جس کی بناء پر وہ تصوف ہی کے پورے واقعے کو ویدانتی تصورات کے اثر سے منسوب کرتا ہے۔ مراقبوں کے ان طریقوں کی نوعیت بالکل غیر اسلامی ہے، اور اعلیٰ درجے کے صوفیاء ان کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے''۔

حقیقت بہ حیثیت نور

اسلامی علم الکلام میں یونانی جدلیات کے استعمال سے تنقید کی روح بیدار ہوگئی۔ اس کا آغاز ''الاشراقی'' کے ساتھ ہوا۔ اور یہ ''الغزالی'' کی تشکیک میں مکمل طور پر نمودار ہوگئی۔ عقلیین میں بھی ''نظام'' جیسے نقاد موجود تھے جنہوں نے یونانی فلسفہ کو من و عن تسلیم نہیں کیا بلکہ اس پر آزادی سے تنقید کی۔ تحکم و عقائد کے حامی ''الغزالی' الرازی، ابوالبرکات اور آمدی'' وغیرہ نے یونانی فلسفہ کی پوری عمارت پر حملے کیے اور ''ابوسعید سیرانی، قاضی عبدالجبار، ابوالمعالی، ابوالقاسم''......... اور سب سے بڑھ کر دقیق النظر ''ابن تیمیہ'' اس قسم کے کلامی محرکات سے متاثر ہو کر یونانی منطق کی خلقی کمزوری کو منظر عام پر لانے لگے۔ یونانی فلسفہ کی تنقید میں ان مفکرین کو بعض قابل صوفیاء جیسے ''شہاب الدین سہروردیؒ'' سے بھی مدد ملی، انہوں نے اپنی ایک تصنیف میں جو ''کشف الفضائح الیونانیہ'' کے نام سے موسوم ہے۔ یونانی فلسفہ کا ابطال کر کے عقل

Marfat.com

خالص کی بے چارگی کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ عقلیت کے خلاف اشاعرہ کے ردعمل کا یہ نتیجہ ہوا کہ اس سے ایک نظام مابعد الطبیعات نمو پایا جس کے بعض حصوں پر بالکل جدید رنگ چڑھا ہوا ہے، اس نے جدید غلامی کی زنجیروں کو نیتًا توڑ دیا۔ ''اردمین'' کا یہ خیال ہے کہ مسلمانوں میں ''فارابی'' اور ''ابن سینا'' کے بعد تفکر کی روح مضمحل ہوگئی۔ ان کے بعد فلسفہ ارتیابیت اور سریت میں جاکر دیوالیہ ہوگیا، اردمین نے اس بات کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے کہ فلسفۂ یونان پر مسلمانوں کی تنقید سے ایک طرف تو اشاعرہ کی تصوریت وجود میں آئی۔ اور دوسری طرف ایرانی تفکر کی ازسرنو تعمیر ہوئی۔ دراصل ایک ایسے نظام فلسفہ کی تعمیر ممکن تھی جس کی نوعیت بالکل ایرانی ہو اور لازمی تھا کہ غیر ملکی تفکر منہدم ہو جاتا، یا ذہن پر اس کا جو تسلط تھا کم ہو جاتا۔ اشاعرہ اور اسلامی عقائد کے دیگر حامیوں نے اس انہدام کو تکمیل تک پہنچایا۔ ''الاشراقی'' .... جو آزادی کی پیداوار تھے فکر کی ایک جدید عمارت تعمیر کرنے کے لیے آگے بڑھے لیکن انہوں نے اس جدید تعمیر میں پرانے مواد و مسالہ کو بالکل ترک نہیں کیا۔ ان کا دماغ خالص ایرانی تھا اور وہ تنگ نظر سند کی دھمکیوں کی پروانہ کر کے آزاد خیالی کا دعویٰ کرتے تھے۔ ان کے فلسفہ میں قدیم ایرانی روایات، جن کا جزوی اظہار ''طیب رازی، الغزالیؒ'' اور اسماعیلیہ فرقہ کی تصانیف میں ہوا تھا اپنے پیشروں کے فلسفہ اور اسلامی علم الکلام سے آخری مصالحت کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

''شیخ شہاب الدین سہروردی'' .... ''جو شیخ الاشراق مقتول'' کے نام سے مشہور ہیں، بارھویں صدی کے اوائل میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ''ماجد جیلی'' سے ''جو شارح الرازی'' کے استاد ہیں، فلسفہ سیکھا، اور جب کہ یہ ابھی نوجوان ہی تھے، اسلامی دنیا میں ایک مفکر کی حیثیت سے ان کا کوئی ہمسر نہ تھا۔ ''سلطان صلاح الدین

ایوبیؒ" کے بیٹے .... "الملک الظاہر" نے، جو، ان کا زبردست مداح تھا........:
ان کو حلب مدعو کیا۔ یہاں اس نوجوان فلسفی نے اپنی آزاد آراء وافکار کو اس طرح پیش کیا کہ اس زمانے کے متکلمین میں اس سے زبردست رشک پیدا ہو گیا۔ خونخوار عقائد کے ان غلاموں نے جو اپنی خلقی کمزوری سے واقف ہوتے ہیں، اور جو اپنی حمایت کے لیے زبردست قوت مہیا رکھتے ہیں۔ "سلطان صلاح الدین" کو لکھا کہ شیخ کی تعلیم، اسلام کے لیے ایک خطرہ ہے، اور مذہبی مفاد کے لیے یہ لازمی ہے کہ اس فتنہ کو ابتداء ہی میں مٹا دیا جائے۔ سلطان اس پر راضی ہو گئے۔ 36 سال کی عمر میں اس نوجوان ایرانی مفکر نے اس مہلک ضرب کے آگے سر جھکا دیا جس نے اس کو شہید حق بنا کر اس کے نام کو بقائے دوام عطا کیا۔ قاتلین تو مر چکے ہیں لیکن وہ فلسفہ جس کی قیمت خون سے ادا کی گئی تھی ابھی تک زندہ ہے اور مخلص محبانِ صداقت کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔

فلسفہ اشراق کے بانی کی خصوصیات میں سے اس کی عقلی آزادی اور دقیق النظری زیادہ نمایاں ہے جس کی وجہ سے وہ معمولی مواد و مسالہ سے ایک مکمل نظام تشکیل دیتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اپنے ملک کی فلسفیانہ روایات کے ساتھ وفا شعاری برتتا ہے۔ بہت سے اساسی امور میں وہ افلاطون سے مختلف رائے رکھتا ہے اور "ارسطو" پر بھی جس کے فلسفہ کو وہ اپنے نظام فکر کی ایک تیاری سمجھتا ہے، آزادی کے ساتھ تنقید کرتا ہے۔ کوئی چیز اس کی زد سے نہیں بچتی۔ حتیٰ کہ "ارسطو" کی منطق کو بھی وہ دقیق النظری سے جانچتا ہے اور اس کے بعض نظریات کے کھوکھلے پن کو ظاہر کر دیتا ہے۔ مثلاً ارسطو کے نزدیک منطقی تعریف جنس و فصل کا اجتماع ہے۔ لیکن الاشراقی کا یہ دعویٰ ہے کہ جس شے کی تعریف کی جاتی ہے، ہم اس کی متمائز صفت سے، جس کو کسی دوسری شے پر محمول نہیں کیا جا سکتا اس شے کے علم تک نہیں پہنچ سکتے۔ ہم گھوڑے کی یہ تعریف کرتے

Marfat.com

ہیں کہ یہ ایک ہنہنانے والا جانور ہے۔ ہم حیوانیت کو اس لیے سمجھ جاتے ہیں کہ ہم کو بہت سے جانوروں کا علم ہے۔ جس میں یہ صفت موجود ہے۔ لیکن ہنہنانے کی صفت کو سمجھنا ناممکن ہے کیونکہ یہ صفت اسی شے کے سوا جس کی تعریف کی جارہی ہے، کہیں اور نہیں پائی جاتی۔ لہٰذا ایک ایسے شخص کے لیے جس نے گھوڑے کو کبھی نہیں دیکھا ہے........گھوڑے کی معمولی تعریف بے معنیٰ ہوگی۔ ایک حکمیاتی اصول کی حیثیت سے ارسطا طالیسی تعریف بالکل بیکار ہے۔ اس تنقید سے شیخ کی رہنمائی اس نقطہ نظر کی طرف ہوتی ہے جو ''بوزنکے'' کے نقطہ نظر سے بہت مشابہہ ہے۔ جس نے تعریف کی؛ یہ تعریف کی ہے کہ یہ صفات کو اکٹھا کرنے کا نام ہے۔ شیخ کا دعویٰ ہے کہ صحیح تعریف میں تمام صفات لازمی شامل ہوں گی۔ جو مجموعی حیثیت سے اسی شے کے سوا جس کی تعریف کی جاتی ہے........کہیں اور پائی نہ جائیں۔ انفرادی حیثیت سے ممکن ہے کہ وہ دوسری اشیاء میں بھی موجود ہوں۔

اب ہم کو ان کے نظام مابعد الطبیعات (Metaphysics) کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اور اس کا اندازہ لگانا چاہیے کہ انہوں نے اپنے ملک کے فلسفہ میں جو اضافہ کیا ہے اس کی کیا قیمت ہے؟ شیخ کا قول ہے کہ ماورائی فلسفہ کے خالص عقلی پہلو کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ایک متعلم کو چاہیے کہ ارسطو کے فلسفہ، منطق، ریاضیات، اور تصوف سے پوری واقفیت حاصل کرلے۔ گناہ اور تعصب کے داغ سے اس کے ذہن کو بالکل پاک رہنا چاہیے۔ تاکہ وہ بتدریج اس حاسہ باطنی کو نمو دے سکے جس کا وظیفہ یہ ہے کہ جس چیز کو عقل محض نظری حیثیت سے سمجھ لیتی ہے........اس کی تصحیح وتصدیق کرے۔ تنہا عقل ادراک کرنے کے قابل نہیں۔ اس کو ہمیشہ ''ذوق'' سے (جو اشیاء کے جوہر کا پراسرار ادراک ہے) مدد لینی چاہیے، جو بے چین روح کو علم وسکون بخشتا

Marfat.com

ہے اور تشکیک (شک) کو ہمیشہ کے لیے مٹا دیتا ہے۔ ہم کو اس روحانی تجربہ کے خالص تفکری پہلو یعنی باطنی ادراک کے نتائج سے تعلق ہے.......... جن کو فکر انسانی منضبط و منظم کرتی ہے۔ لہٰذا ہم اشراقی فلسفہ کے مختلف پہلوؤں مثلاً وجودیات، کونیات اور نفسیات پر غور کریں گے۔

"وجودیات"

تمام موجودات کی انتہائی حقیقت، نور قاہرہ ہے.......... یعنی وہ ابتدائی نور مطلق جس کی ماہیت میں مسمر تجلی داخل ہے۔ نور سے زیادہ کوئی شے مرئی نہیں اور مرئیت کی تعریف تحصیل حاصل ہے[1]۔ لہٰذا نور کی ماہیت ظہور ہے۔ اگر ظہور ایک ایسی صفت ہے جو نور پر اضافہ کی گئی ہے تو اس سے لازم آئے گا کہ نور بذات خود مرئی نہیں بلکہ یہ ایک ایسی شے کے توسط سے مرئی ہو جاتا ہے جو بذات خود مرئی ہے۔ اس سے یہ مہمل نتیجہ نکلتا ہے کہ نور کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جو نور سے زیادہ مرئی ہے۔ لہٰذا نور اولیٰ کے وجود کی علت خود اس نور اولیٰ سے باہر نہیں۔ اس ابتدائی قوت کے علاوہ جو کچھ ہے وہ قائم بالغیر اور ممکن الوجود ہے۔ ظلمت (تاریکی) کوئی ایسی متمائز شے نہیں ہے جو کسی آزاد اور قائم بالذات ماخذ سے ظہور پذیر ہوتی ہو۔ مجوسی مذہب کے نمائندوں کا یہ خیال کہ نور اور ظلمت دو متمائز حقائق ہیں اور ان کو دو متمائز عوامل تخلیقی، خلق کرتے ہیں .... ایک غلطی پر مبنی ہے۔ ایران کے قدیم فلاسفہ ان زرتشتی پیشوایان مذہب کی طرح ثنوئن نہ تھے جنہوں نے اس خیال کی بناء پر کہ "ایک" اپنے اندر سے ایک سے زیادہ کو وجود میں نہیں لا سکتا.......... یہ قرار دیا تھا کہ نور و ظلمت کے دو مستقل ماخذ

۱- شرح انواریہ۔ الاشراقی کی حکمت الاشراق پر الہروی کی شرح۔ ورق ۱۰۔ الف

Marfat.com

ہیں۔ ان دونوں کی باہمی نسبت، تناقض پر مبنی نہیں، بلکہ ان میں وجود وعدم کا تعلق ہے۔ نور کے اثبات ہی میں اُس کی نفی پوشیدہ ہے، یعنی اپنے آپ کو برقرار رکھنے کے لیے وہ ظلمت کو منور کر دیتا ہے۔ نور اولیٰ تمام حرکات کا مبداء ومنفذ ہے۔ لیکن اس کی حرکت تبدیلی مقام نہیں بلکہ منور کرنے کی خواہش حرکت کا باعث ہوتی ہے۔ اور اس کا جوہر بھی یہی ہے، یہی خواہش نور کو بے چین کر دیتی ہے کہ اپنی شعاعوں کو تمام اشیاء پر منعکس کر کے ان میں زندگی کی ایک لہر دوڑا دے۔ اس سے تجلیات ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ ان کی تعداد لامحدود ہے۔ ایسی تجلیات جن کی روشنی میں شدت ہوتی ہے وہ دوسری تجلیات کا ماخذ بن جاتی ہیں۔ اور بتدریج ان کی روشنی میں انحطاط شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد یہ تجلیات دوسری تجلیات کو پیدا کرنے کے قابل نہیں رہتیں۔ یہ تمام تجلیات ایسے وسائل یا علم الکلام کی زبان میں ایسے ملائکہ ہیں جن کے ذریعہ سے نور اولیٰ وجود کی لامحدود اقسام کو حیات و قیام عطا کرتا ہے۔ ارسطو کے پیروؤں نے غلطی سے عقول کی تعداد کو دس تک محدود کر دیا تھا۔ مقولات فکر کے شمار کرنے میں بھی ان سے اسی طرح غلطی صادر ہوئی۔ نور اولیٰ کے امکانات لامحدود ہیں، اور کائنات مع اپنی کثرت وتعدد کے اس لامحدودیت کا ایک جزوی ظہور ہے جو اس کے عقب میں پوشیدہ ہے۔ لہٰذا ارسطو کے مقولات محض اضافی حیثیت سے صحیح ہیں۔ فکر انسانی کے لیے یہ ناممکن ہے کہ تصورات کی ان لامحدود قسموں کو اپنی فہم کی گرفت میں لاسکے۔ جن کے مطابق نور اولیٰ ان چیزوں کو منور کرتا ہے جو غیر نور ہیں۔ نور اولیٰ کی حسب ذیل تجلیات میں ہم امتیاز کر سکتے ہیں:۔

(۱) نور مجرد (یعنی انفرادی وکلی عقل) اس کی کوئی صورت نہیں، یہ اپنے سوا کسی اور شے کی صفت نہیں بنتی۔ اس سے نور کی مختلف نیم شعوری، شعوری اور شاعر الذات

Marfat.com

صورتیں ظہور پذیر ہوتی ہیں اور یہ بلحاظ تنویر ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ ان کو اپنے ماخذ سے جس قدر قرب یا بعد ہوتا ہے اسی قدر ان کی تنویر کم یا زیادہ ہوتی ہے۔ انفرادی عقل یا روح، نور اولیٰ کی ایک دھندلی سی شبیہ یا عکس بعیدہ ہے۔ نور مجرد خود کو خود اپنے ذریعہ سے جانتا ہے اور کسی ''غیر انا'' کا یہ محتاج نہیں ہوتا جو اس کے وجود کو منکشف کرسکے۔ شعور یا علم ذات نور مجرد کا جوہر ہے۔ یہی نور مجرد کو نفی نور سے متمائز کرتا ہے۔

(۲) نور عارضی (صفت)......... یہ ایسا نور ہے جس کی کوئی ایک صورت ہوتی ہے اور جو اپنے سوا کسی اور شئے کی صفت بننے کی قابلیت رکھتا ہے۔ (یعنی ستاروں کا نور یا دوسرے اجسام کی مرئیت) نور عارضی یا صحیح معنوں میں نور محسوس نور مجرد ہی کا عکس بعیدہ ہے جو بُعد کی وجہ سے اپنی شدت کو کھو دیتا ہے۔ مسلسل انعکاس کا عمل درحقیقت مدھم کرنیوالا عمل ہے۔ متواتر تجلیات بتدریج اپنی شدت کو کھو دیتی ہیں۔ اس انعکاس کے سلسلہ میں ہم ایسی تجلیات پر پہنچتے ہیں جو بہت ہی مدھم ہو کر اپنی مستقل حیثیت کو بالکل گم کر دیتی ہیں اور بغیر کسی دوسری شے کی مدد کے......... قائم نہیں رہ سکتیں۔ انہی تجلیات پر نور عارضی مشتمل ہے یعنی یہ ایسی صفت ہے جس کا کوئی مستقل و آزاد وجود نہیں۔ لہٰذا نور عارضی و نور مجرد کے مابین علت و معلول کا تعلق ہے۔ تاہم معلول ایسی شے نہیں ہے جو اپنی علت سے بالکل متمائز و جداگانہ ہو، یہ ایسی مفروضہ علت کا ایک تغیر یا ضعیف صورت ہوتی ہے۔ نور مجرد سے علیحدہ جو شے بھی ہو وہ نور عارضی کی علت نہیں ہوسکتی کیونکہ آخر الذکر (یعنی نور عارضی) محض ممکن الوجود ہے اور اسی لیے اس کی نفی بھی کی جاسکتی ہے اور اس کو اجسام سے ان کی ماہیت میں کوئی تبدیلی کے بغیر......... علیحدہ کیا جاسکتا ہے۔ جسم منور کا جوہر یا ماہیت، اگر نور عارضی کی علت ہوتی تو اس کو نور سے ظلمت میں لانے کا عمل ناممکن ہو جاتا۔ ایک غیر فانی[۱] فاعل علت کو ہم خیال میں نہیں لاسکتے۔

۱- شرح انوار نیہ- صفحہ ۱۱ ب

Marfat.com

اب واضح ہوگیا ہے کہ شیخ الاشراق اشاعرہ سے اس بات میں متحد الخیال ہیں کہ ''ارسطو'' کے مادۂ اولیٰ جیسی کوئی شے موجود نہیں ہے۔ گو وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ نفیِ نور یعنی ظلمت کا وجود بھی لازمی ہے، ظلمت معروض نور ہے.......... جو ہر و عرض کے علاوہ باقی مقولات کی اضافیت کی تعلیم میں بھی وہ اشاعرہ سے متفق ہیں۔ لیکن وہ اشاعرہ کے نظریۂ علم میں اس حد تک تصحیح کرتے ہیں جس حد تک کہ وہ علم انسانی میں ایک فاعلی عنصر کو مانتے ہیں۔ ہمارے معروضات علم سے ہمارا تعلق بالکل انفعالی نہیں۔ انفرادی روح، خود بھی ایک تجلی ہونے کے لحاظ سے معروض علم کو عملی، علم کے دوران منور کر دیتی ہے۔ اس کے نزدیک کائنات، فاعلی تنویر کا ایک زبردست عمل ہے۔ لیکن خالص نقطۂ نظر سے یہ تنویر و تجلی ایک جزوی اظہار ہے' نور اولیٰ کی لامحدودیت کا، جو ایسے قوانین کے مطابق منور کر سکتی ہے جن سے ہم لاعلم ہیں، مقولات فکر لامحدود ہیں۔ ہماری فکر صرف چند مقولات کو لے کر عمل کرتی ہے۔ لہٰذا شیخ الاشراق مناظری نقطۂ نظر سے جدید اناسیت (Humanism) سے دور نہیں ہیں۔

''کونیات''

وہ تمام چیزیں جو ''غیر نور'' ہیں ان کو اشراقی مفکرین ''کمیت مطلق'' یا ''مادۂ مطلق'' کہتے ہیں۔ یہ صرف اثبات نور کا ایک دوسرا پہلو ہے۔ یہ کوئی مستقل وجود نہیں جیسا کہ ''ارسطو'' کے پیروؤں نے غلطی سے خیال کیا تھا۔ یہ واقعہ کہ ابتدائی عناصر ایک دوسرے سے متبدل و متغیر ہو جاتے ہیں اس اساسی مادۂ مطلق کی طرف اشارہ کرتا ہے جو مع اپنے مختلف مدارجِ کثافت کے، مادی وجود کے مختلف دوائر کو تشکیل دیتا ہے۔ تمام اشیاء کی بنیاد کو دو اصناف میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

Marfat.com

(۱) جو ماورائے مکان ہے۔ یعنی نا معلوم جوہر یا سالمات (اشاعرہ کے جواہر)
(۲) جو لازماً موجود فی المکان ہے یعنی ظلمت کی صورتیں جیسے وزن، بو، ذائقہ وغیرہ۔

ان دونوں کے اجتماع پر مادۂ مطلق مشتمل ہے۔ ایک مادی جسم ظلمت اور نا معلوم جوہر کے اجتماع کی صورت ہے، جس کو نور مجرد مرئی یا منور کر دیتا ہے۔ لیکن ظلمت کی مختلف صورتوں کی علت کیا ہے؟ یہ بھی نور کی صورتوں کی طرح اپنے وجود کے لیے نور مجرد کے محتاج ہیں جس کی مختلف تجلیات سے موجودات میں کثرت و تعدد پیدا ہوتا ہے۔ وہ صورتیں جن کی بناء پر اجسام ایک دوسرے سے متمائز و مختلف ہوتے ہیں........ مادۂ مطلق کی ذات میں موجود نہیں ہیں۔ کیت مطلق اور مادۂ مطلق ایک دوسرے کے مماثل ہیں۔ اگر یہ صورتیں مادۂ مطلق کی ماہیت میں موجود ہوں تو ظلمت کی صورتوں کی حد تک تمام اجسام مماثل ہوں گے۔ بہر صورت ہمارا روزمرہ کا تجربہ اس کی تردید کر دیتا ہے۔ لہٰذا ظلمت کی صورتوں کی علت مادۂ مطلق نہیں ہے اور چونکہ صورتوں کے اختلاف کی علت کسی اور شے کو نہیں ٹھہرایا جا سکتا اس لیے لازم آتا ہے کہ یہ نور مجرد کی مختلف تجلیات ہی کا نتیجہ ہیں۔ نور و ظلمت کی صورتوں کا وجود نور مجرد سے ماخوذ ہے۔ مادی جسم کا تیسرا عنصر یعنی نا معلوم جوہر یا سالمہ اثباتِ نور ہی کے ایک لازمی پہلو کے سوا اور کچھ نہیں۔ لہٰذا جسم بحیثیت مجموعی بالکل نور اولیٰ پر قائم ہے۔ کل کائنات درحقیقت دوائر وجود کا ایک مستمر سلسلہ ہے۔ اور یہ سب ابتدائی نور ہی پر قائم نہیں، جو مبداء نور سے قریب ہیں وہ زیادہ تجلی حاصل کرتے ہیں۔ ہر دائرے کے موجودات کو اور خود ان دوائر کو غیر محدود درمیانی تجلیات کے ذریعے روشنی، حاصل ہوتی ہے۔ جو ''ذی شعور نور'' کی مدد سے وجود کی چند صورتوں کو محفوظ کر لیتے ہیں (جیسا کہ انسان، حیوان اور

نباتات میں ہوتا ہے) اور بعض بغیر اس کی مدد کے (جیسا کہ فلزات اور ابتدائی عناصر میں ہوتا ہے) کثرت و تعدد کا یہ وسیع منظر جس کو ہم کائنات کے نام سے موسوم کرتے ہیں وہ ایک ظل و سایہ ہے، لامحدود تجلیات اور نور اولیٰ کی شعاعوں کا۔ اشیاء میں ان تجلیات کی وجہ سے جن کی طرف یہ مسلسل حرکت کرتی ہیں......... ایک عشق کا جذبہ ابھر جاتا ہے۔ تاکہ وہ اصلی مبداء نور سے مستفیض ہوتی رہیں۔ کائنات محبت کا ایک ابدی ڈرامہ ہے۔ ہستی کے مختلف عوالم حسب ذیل ہیں:۔

نور اولیٰ کا عالم

۱۔ عالم عقول (مبداء افلاک) ۲۔ عالم روح ۳۔ عالم صورت

۱۔ عالم صورت مثالی	۱۔ عالم افلاک
۲۔ عالم صورت مادی	۲۔ عالم عناصر

الف۔ افلاک	الف۔ عناصر بسیط
ب۔ عناصر	ب۔ عناصر مرکب
۱۔ عناصر بسیط	۱۔ اقلیم فلزاتی
۲۔ عناصر مرکب	۲۔ اقلیم نباتی
۱۔ اقلیم فلزاتی	۳۔ اقلیم حیوانی
۲۔ اقلیم نباتی	
۳۔ اقلیم حیوانی	

Marfat.com

ہستی کی عام ماہیت کو اجمالی طور پر بیان کر دیا گیا ہے۔ اب ہم عملِ کائنات کو زیادہ تفصیلی طور پر جانچیں گے۔ جو کچھ ''غیر نور'' ہے۔ اس کی تقسیم حسب ذیل ہے۔

۱۔ ازلی۔ یعنی عقول، ارواح، اجرام فلکی، فلک، عناصر، زمانہ اور حرکت۔

۲۔ ممکن الوجود یعنی مختلف عناصر کے مرکبات .... افلاک کی حرکت ازلی ہے۔ اور اس سے کائنات کے مختلف دوائر تشکیل پاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ روحِ فلکی میں مبداءِ نور سے تجلی حاصل کرنے کی ایک شدید اور زبردست خواہش پائی جاتی ہے۔ وہ مادہ جس سے افلاک کی تعمیر ہوئی ہے، کیمیائی اعمال کے اثر سے بالکل آزاد ہے۔ ہر فلک اپنا ایک خاص مادہ رکھتا ہے، جو اسی کے لیے مخصوص ہوتا ہے افلاک اپنی حرکت کی سمت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں اور اس اختلاف کی توجیہہ اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ محبوب یا قائم رہنے والی تجلی ہر ایک فلک میں مختلف ہوتی ہے۔ حرکت، زمانے کا محض ایک پہلو ہے۔ یہ گویا زمانے کے عناصر کو اکٹھا کرتا ہے اور جب ان عناصر کو خارجیت حاصل ہو جاتی ہے تو اس کو حرکت کہتے ہیں۔ ماضی، حال اور مستقبل میں صرف سہولت کی خاطر فرق کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ فرق زمانے کی ماہیت میں موجود[1] نہیں ہوتا۔ ہم زمانے کے آغاز کا تعقل نہیں کر سکتے کیونکہ یہ مفروضہ آغاز خود زمانے ہی کا ایک نقطہ ہوگا۔ لہٰذا زمانہ اور حرکت دونوں ازلی ہیں۔

آب، باد، اور خاک تین ابتدائی عناصر ہیں۔ الاشراقی کے نزدیک آتش محض ایک بادِ سوزاں (جلتی ہوئی ہوا) ہے۔ ان عناصر کے مرکبات مختلف افلاک کے اثرات کے تحت مختلف صورتیں مثلاً سیال، غاز، جامد وغیرہ .... اختیار کر لیتے ہیں۔

۱- شرح انواریہ۔ ورق 34۔ب

Marfat.com

ان ابتدائی عناصر کے تغیر و تبدل سے ''تعمیر و انہدام'' کا عمل شروع ہو جاتا ہے، جو غیر نور کے کل دائرے میں جاری و ساری ہے اور وجود کی مختلف صورتوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ مدارج پر لے جاتا اور ان کو تنویر کی قوتوں سے قریب تر کر دیتا ہے۔ فطرت کے تمام مظاہر جیسے بارش، بادل، برق، شہاب ثاقب وغیرہ حرکت کی اس باطنی قوت کے مختلف اعمال ہیں۔ اس کی توجیہ اس طرح کی جاتی ہے کہ اشیاء پر نور اولیٰ بالواسطہ یا بلا واسطہ عمل واثر کرتا ہے۔ تجلی حاصل کرنے کی صلاحیت کے لحاظ سے اشیاء ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ مختصر الفاظ میں کائنات ایک خواہش بلورین ہے لیکن کیا یہ ازلی کائنات ہے؟ کائنات قوتِ تنویر کا ایک مظہر ہے اور قوت، نور اولیٰ کی اصل ماہیت میں داخل ہے لہٰذا جس حد تک کہ کائنات ایک مظہر ہے........ یہ ایک قائم بالغیر ہستی ہے اور اسی لیے یہ ازلی نہیں۔ لیکن ایک دوسرے مفہوم میں یہ ازلی بھی ہے۔ ہستی کے تمام مختلف دوائرِ نورِ ازلی کی تجلیات و شعاعوں کی وجہ سے موجود ہیں۔ بعض تجلیات ایسی ہیں جو براہ راست ازلی ہیں اور بعض ایسی مدھم بھی ہیں کہ ان کا ظہور دوسری تجلیات اور شعاعوں کے اجتماع پر مبنی ہے۔ ان کا وجود ان معنوں میں ازلی نہیں، جن معنوں میں کہ ماقبل تجلیات کا ہے۔ مثلاً رنگ اس شعاع کے مقابلہ میں ممکن الوجود ہے، جو کسی تاریک جسم کو جب کہ وہ اس کے سامنے لایا جاتا ہے، منور کر کے رنگ کو ظہور میں لاتی۔ لہٰذا کائنات بحیثیت ایک مظہر کے ممکن الوجود ہے۔ لیکن چونکہ اس کے مبداء کی نوعیت ازلی ہے، اس لیے یہ بھی ازلی ہے۔ جو لوگ کائنات کی ازلیت کو نہیں مانتے، وہ اس بات کو فرض کر کے بحث کرتے ہیں کہ جزو سے کل کا فیصلہ نا ممکن ہے۔ یہ استدلال حسب ذیل طریقے سے کیا جاتا ہے۔

۱۔ حبشیوں میں ہر ایک سیاہ ہے۔

Marfat.com

☆ تمام حبشی سیاہ ہیں۔

۲۔ ہر ایک حرکت ایک معینہ لمحے میں شروع ہوئی۔

☆ تمام حرکات کو اسی طرح شروع ہونا چاہیے۔

لیکن یہ طرز استدلال بالکل ناقص ہے۔ اس میں مقدمہ کبریٰ کو پیش کرنا بالکل ناممکن ہے۔ کوئی شخص ماضی، حال اور مستقبل کے تمام حبشیوں کو کسی خاص لمحہ وقت میں اکٹھا نہیں کر سکتا لہٰذا ایسا کلیہ ناممکن ہے۔ حبشیوں میں افراد کے مشاہدے سے، یا حرکت کی ان خاص خاص مثالوں سے جو ہمارے تجربے کے دائرے میں آجاتی ہیں۔ یہ نتیجہ نکالنا ایک لغویت ہے کہ تمام حبشی سیاہ ہیں یا تمام حرکت کا آغاز زمانے میں ہوا ہے۔

''نفسیات''

ادنیٰ درجے کے اجسام میں حرکت اور نور متلازم نہیں ہیں۔ مثلاً پتھر کا ایک ٹکڑا اگر منور ہو کر مرئی ہو گیا ہے لیکن اس میں خود بخود حرکت کرنے کی قوت ودیعت نہیں ہے۔ سلسلۂ موجودات پر اوپر کی طرف نگاہ دوڑائیں تو ہم کو ایسے اعلیٰ درجے کے اجسام بھی ملتے ہیں جن میں حرکت اور نور ساتھ ساتھ موجود ہیں۔ تجلی مجرد کے لیے سکونت کا بہترین مقام انسان ہے، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انفرادی تجلی مجرد، جس کو ہم روح کہتے ہیں اپنے طبعی لوازمہ (یعنی جسم) سے پہلے موجود تھی یا نہیں؟ اس سوال کے متعلق فلسفہ اشراق کے بانی نے ''ابن سینا'' کی تقلید کی ہے۔ اور اس استدلال کو پیش کر کے یہ بتلایا ہے کہ انفرادی تجلیات مجردہ نور کی اکائیوں کی حیثیت سے ظہور میں آنے سے پہلے موجود نہیں رہ سکتیں۔ وحدت و کثرت کے مادی مقولات کا اطلاق تجلی

Marfat.com

مجرد پر نہیں کیا جا سکتا۔ جس کی اصل ماہیت میں وحدت ہے نہ کثرت اور اس میں جو کثرت نظر آتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے مادی لوازمات میں تجلی حاصل کرنے کے مدارج مختلف ہیں۔ تجلی مجرد یا روح اور جسم میں جو علاقہ ہے وہ علت و معلول کا علاقہ نہیں .... بلکہ ان دونوں کے مابین محبت، ایک رابطہ اتحاد ہے۔ جو جسم تجلی کا خواہشمند ہوتا ہے وہ روح کے ذریعے سے اس کو حاصل کرتا ہے کیونکہ اس کی فطرت ہی ایسی ہے کہ وہ جسم میں اور مبداء نور میں براہ راست تعلق قائم کرنے میں حائل ہوتی ہے۔ لیکن روح اس نور کو جو یہ براہ راست حاصل کرتی ہے تاریک اور ٹھوس جسم میں منتقل نہیں کر سکتی۔ کیونکہ جسم بہ لحاظ اپنی صفات کے ہستی کی ایک مخالف سمت میں واقع ہے اور دونوں میں تعلق پیدا کرنے کے لیے ایک واسطہ کی ضرورت ہے۔ یہ واسطہ ایک ایسی چیز ہے جو نور اور ظلمت کے درمیان واقع ہے۔ یہ واسطہ روح حیوانی ہے۔ یہ ایک گرم، لطیف اور شفاف بخار ہے۔ جس کا خاص مقام دل کے بائیں جانب ہے۔ لیکن یہ سارے جسم میں گردش بھی کرتا ہے۔ چونکہ روح حیوانی اور نور میں ایک ایک جزوی مماثلت ہے۔ اس لیے تاریک راتوں میں بری جانور آتش سوزاں کی طرف لپکتے ہیں، اور بحری جانور اپنے آبی مسکن کو چھوڑ کر باہر نکل آتے ہیں۔ تاکہ چاندنی کے دلکش نظارہ سے لطف اٹھا سکیں۔ اس لیے ہستی کے اعلیٰ سے اعلیٰ مدارج طے کرنا اور زیادہ سے زیادہ تجلی حاصل کرنا انسان کا نصب العین ہے، اس طریقہ سے بتدریج عالم صور (عالم مادی) سے مکمل آزادی حاصل ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ نصب العین کس طرح متحقق ہو سکتا ہے؟ علم اور عمل سے۔ عقل اور ارادہ دونوں کو متبدل کرنے سے۔ فکر و عمل کے اتحاد سے انسان کا اعلیٰ ترین نصب العین متحقق ہوتا ہے۔ کائنات سے متعلق تم اپنے نقطۂ نظر کو بدل دو اور کردار کے اس طریقہ کو اختیار کرو جو اس تغیر سے پیدا ہوتا ہے۔ اب ہم تحقق نصب

Marfat.com

العین کے ذرائع پر اجمالی طور پر غور کریں گے۔

الف۔ علم۔ جب تجلی مجرد اپنے آپ کو کسی اعلیٰ جسم سے وابستہ کر دیتی ہے۔ تو وہ چند قوتوں یعنی نور وظلمت کی قوتوں کے عمل سے اپنے آپ کو نمو دیتی ہے۔ اول الذکر حواس خمسہ ظاہری و باطنی پر مشتمل ہے۔ مثلاً مرکز حسی، تصور، تخیل، فہم اور حافظہ وغیرہ اور آخر الذکر نشو ونما اور انہضام کی قوتوں پر (مشتمل) ہے۔ صرف سہولت کی خاطر قوتوں کی اس طرح تقسیم کی گئی ہے۔ ''ایک قوت تمام اعمال کا ماخذ ہو سکتی ہے[1]۔ دماغ کے درمیانی حصہ میں صرف ایک ہی قوت ہے لیکن مختلف نقاط نظر سے اس کو مختلف ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ذہن ایک وحدت ہے جو سہولت کی خاطر ایک کثرت سمجھا جاتا ہے۔ اس قوت کو جو ذہن کے درمیانی حصہ میں ہے اس تجلی مجرد سے متمائز کرنا چاہیے جو انسان کا حقیقی جوہر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ فلاسفۂ اشراق ذہن فاعل اور روحِ منفعل کے مابین ایک امتیاز پیدا کرتے ہیں۔ پھر بھی وہ یہ تعلیم دیتے ہیں کہ مختلف قوتیں ایک پراسرار طریقے سے روح سے علاقہ رکھتی ہیں۔

ان کی نفسیاتِ تعقل میں ان کا نظریۂ رویت ایک ایسی چیز ہے۔ جس میں بہت بڑی جدت اور اُپج[2] پائی جاتی ہے۔ وہ شعاعِ نور جس کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ آنکھ سے نکلتی ہے یا تو جوہر ہے یا صفت۔ اگر وہ صفت ہے تو ایک جوہر (آنکھ) سے دوسرے جوہر (جسم مرئی) میں منتقل نہیں کی جاسکتی۔ اس کے برخلاف اگر وہ جوہر ہے تو شعوری طور پر یا اپنی خلقی ماہیت سے مجبور ہو کر حرکت کرے گی۔ شعوری حرکت حیوان سے سرزد ہوتی ہے جو اشیاء کا ادراک کرتا ہے۔ ایسی صورت میں ادراک کرنے والی

۱۔ شرح انواریہ۔ صفحہ 58۔ب

۲۔ شرح انواریہ۔ صفحہ 60۔ب

ہستی انسان نہیں بلکہ شعاع ہے۔ اگر شعاع کی حرکت اس ماہیت ہی کی ایک صفت ہے تو اس کی کوئی وجہ نہیں کہ وہ ایک خاص سمت میں حرکت کرے اور دوسری سمتوں میں نہیں۔ لہٰذا شعاعِ نور کے متعلق یہ نہیں خیال کیا جاسکتا کہ وہ آنکھ سے نکلتی ہے۔ ''ارسطو'' کے پیرو کہتے ہیں کہ عمل رویت میں اشیاء کی تمثال وشبیہ آنکھ پر مرتسم ہو جاتی ہے۔ یہ خیال بھی غلط ہے۔ کیونکہ ایسی اشیاء کی تمثال جو بہت بڑی ہوتی ہے ایک چھوٹی سی جگہ پر مرتسم نہیں ہوسکتی۔ واقعہ یہ ہے کہ جب کوئی شے آنکھوں کے آگے آتی ہے تو ایک تجلی وقوع پذیر ہوتی ہے اور اس تجلی کے ذریعے سے ذہن اس شے کو دیکھتا ہے۔ جب کسی شے اور اوسط درجہ کی صورت کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہوتا اور ذہن ادراک کرنے کے لیے تیار رہتا ہے تو عمل رویت (دیکھنے کا عمل) کو وقوع پذیر ہو جانا چاہیے۔ کیونکہ اشیاء کا قانون ہی یہی ہے۔ ''تمام دیکھنا ایک تجلی ہے اور ہم اشیاء کو خدا میں دیکھتے ہیں۔'' ''بارکلے'' نے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ تمام تصورات کی آخری بنیاد خدا ہے، ہمارے بصری ادراکات کی اضافیت کی تشریح کی ہے۔ ایک اشراقی فلسفی کے پیش نظر بھی یہی مقصد ہوتا ہے۔ گو اس کا نظریہ رویت عمل بصارت کی کوئی ایسی توجیہہ نہیں کرتا جس کی بناء پر دیکھنے کے عمل پر ایک نئے طریقے سے غور کیا جائے۔

حواس وعقل کے علاوہ علم کا ایک اور ماخذ ہے۔ جس کو ذوق سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی یہ ایک باطنی ادراک ہے جو ہستی کے غیر زمانی وغیر مکانی عوالم کو منکشف کر دیتا ہے۔ فلسفہ کا مطالعہ یا تصورات خالص پر غور وفکر کی عادت جب نیکو کاری سے متحد ہو جاتی ہے تو اس سے اس پُراسرار حاسہ کی پرورش ہوتی ہے۔ یہ حاسہ، عقل کے اخذ کردہ نتائج کی تصحیح وتصدیق کرتا ہے۔

(ب) انسان میں بہ حیثیت ایک ہستیِ فاعل کے حسب ذیل قوائے محرکہ ہیں۔

Marfat.com

(۱) عقل یا روح ملکوتی۔ یہ فہم، امتیاز، اور حبِ علم کا ماخذ ہے۔

(۲) روح حیوانی۔ جو غضب، شجاعت، اقتدار اور بلند ہمتی کا ماخذ ہے۔

(۳) روح بہیمی۔ جو نفس پرستی، اشتہا اور شہوانی جذبہ کا ماخذ ہے۔

پہلی صورت حکمت کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور دوسری و تیسری صورتیں اگر ان کو عقل کے قابو میں رکھا جائے تو شجاعت و عفت کی طرف لے جاتی ہیں۔ ان سب کو ہم آہنگی اور توافق کے ساتھ استعمال کیا جائے تو اس کا نتیجہ عدل جیسی فضیلت کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔ نیکی کے ذریعہ سے روحانی ترقی کا امکان اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ یہ عالم ایک بہترین ممکنہ عالم ہے۔ اشیاء جس طرح کہ وہ موجود ہیں............ نہ بری ہیں نہ بھلی۔ ان کا غلط استعمال یا ان کے متعلق غلط نقطہ نظر ان کو برا یا بھلا بنا دیتا ہے۔ پھر بھی شر کے واقعہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ شر موجود ہے۔ لیکن خیر کے مقابلہ میں اس کی مقدار بہت ہی کم ہے۔ یہ عالم ظلمت کے صرف ایک حصہ سے مخصوص ہے۔ لیکن کائنات کے اور بھی حصے ہیں جو شر کے داغ سے بالکل پاک ہیں۔ ایک ارتیابیہ، جب شر کے وجود کو خدا کی تخلیقی قوت سے منسوب کرتا ہے........ تو گویا وہ یہ فرض کر لیتا ہے کہ انسانی اور ربانی فعل میں مماثلت ہے اور یہ نہیں دیکھتا کہ جو شے موجود ہے وہ خود اسی کے مفہوم میں آزاد نہیں۔ ربانی فعلیت ان معنوں میں خالق شر نہیں سمجھی جا سکتی جن معنوں میں کہ انسانی فعلیت کی بعض صورتوں کو ہم شر کی علت سمجھتے ہیں۔

پس علم اور نیکی کے اتحاد سے روح اپنے آپ کو عالم ظلمت سے آزاد کر لیتی ہے۔ جوں جوں ہم اشیاء کی ماہیت کو جاننے لگتے ہیں، ہم عالم نور سے قریب ہوتے جاتے ہیں اور اس عالم کا عشق ہم میں شدت اختیار کرتا جاتا ہے۔ روحانی ترقی کے مدارج لامحدود ہیں، کیونکہ محبت کے مدارج بھی لامحدود ہیں۔ اس کے خاص خاص مدارج یہ ہیں۔

(۱) ''انا'' کا درجہ۔ اس منزل میں شخصیت کا احساس زیادہ غالب رہتا ہے اور انسانی افعال کا مبداء و مصدر خودغرضی ہوتی ہے۔

(۲) یہ درجہ ''تو نہیں ہے'' کا ہے۔ یہاں انسان خود اپنی ''انا'' کی گہرائیوں میں بالکل جذب ہو کر تمام خارجی اشیاء کو بھول جاتا ہے۔

(۳) یہ درجہ ''میں نہیں ہوں'' .... کا ہے۔ یہ دوسرے درجے کا لازمی نتیجہ ہے۔

(۴) یہ درجہ ''تو ہے'' کا ہے۔ اس میں ''انا'' کی کلیتاً نفی کی جاتی ہے اور ''تو کا اثبات جس کے معنی اپنے آپ کو مرضی الٰہی کے بالکل تابع کر دینے کے ہیں۔

(۵) یہ درجہ ''میں نہیں ہوں اور تو نہیں ہے'' کا ہے۔ اس میں فکر کے دونوں اطراف کی مکمل نفی کی جاتی ہے۔ یعنی یہ کوئی شعور کی حالت ہے۔

ہر منزل میں تجلیات کی شدت کم یا زیادہ ہوتی ہے۔ ان کی معیت میں بعض ناقابل تشریح آوازیں بھی ہوتی ہیں۔ موت روح کی روحانی ترقی کو مسدود نہیں کر دیتی۔ مرنے کے بعد انفرادی ارواح کسی ایک روح میں متحد نہیں ہوتیں بلکہ وہ ایک دوسرے سے اسی تناسب سے علیحدہ رہتی ہیں، جس تناسب سے کہ ان کو اُس زمانے میں تجلی حاصل ہوئی ہے، جب وہ اپنے مادی جسموں سے متحد تھیں۔ اشراقی فلسفہ نے لائبنز کے نظریۂ مماثلتِ غیر ممیزات کی پیش بینی کی ہے۔ اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ کو دو ارواح ایک دوسرے سے مماثل نہیں [1]۔

جب یہ مادی مشین جس کو روح بتدریج تجلی حاصل کرنے کے لیے استعمال کرتی ہے، زائل ہو جاتی ہے تو غالباً روح کسی دوسرے جسم کو اختیار کر لیتی ہے اور وجود کے

۱۔ شرح انواریہ۔ صفحہ 82

Marfat.com

مختلف دوائر میں اعلیٰ سے اعلیٰ منزل طے کرتی جاتی ہے اور ایسی صورتیں اختیار کرتی جاتی ہے جو ان دوائر کے لیے مخصوص ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنی منزل مقصود کو پہنچ جاتی ہے۔ یہ نفی مطلق کی حالت ہے۔ غالباً بعض ارواح اس دنیا میں واپس آ جاتی ہیں تا کہ اپنے نقائص اور کمزوریوں کو رفع کرلیں۔ تناسخ کے نظریہ کو...... اگرچہ یہ روح کے مستقبل کی توجیہہ کے لیے ایک امکانی نظریہ ہے خالص منطقی نقطۂ نظر سے ثابت یا باطل نہیں کیا جاسکتا۔ تمام ارواح اپنے مشترکہ ماخذ کی طرف سفر کر رہی ہیں۔ یہ ماخذ اس سفر کے اختتام کے بعد کل کائنات کو اپنی طرف واپس بلا لیتا ہے۔ اور ہستی کے ایک دوسرے دائرہ کا آغاز کرتا ہے۔ تا کہ گذشتہ دائرہ کی تاریخ کو تمام و کمال پھر پیدا کرے۔

اس ایرانی شہید کے فلسفہ کا یہ ماحصل ہے۔ صحیح معنوں میں یہی پہلا ایرانی ہے جس نے یہ تسلیم کیا کہ ایرانی تفکر کے تمام شعبوں میں عناصر صداقت موجود ہیں اور خود اپنے نظامِ فلسفہ میں ان عناصر صداقت کو دقیق النظری سے مرتب و منضبط کرتا ہے۔ جب وہ خدا کی یہ تعریف کرتا ہے کہ وہ تمام محسوس تصوری وجود کا مجموعہ ہے تو اس لحاظ سے وہ ''ہمہ اوست'' [1] کا قائل ہے۔ اس کے نزدیک برخلاف متقدمین صوفیا کے...... کائنات ایک حقیقی شے ہے اور روح انسانی ایک متمائز انفرادیت رکھتی ہے۔ ایک راسخ العقیدہ متکلم سے وہ اس دعویٰ میں متحد الخیال ہے کہ ہر ایک مظہر کی انتہائی علت نور مطلق ہے۔ جس کی تجلی کائنات کا اصلی جوہر ہے۔ نفسیات میں ابن سینا کی تقلید کرتا ہے لیکن علم کے اس شعبہ پر وہ زیادہ منضبط اور زیادہ تجربی حیثیت سے نظر ڈالتا ہے۔ اخلاقی فلسفی کی حیثیت سے وہ ارسطو کی تقلید کرتا ہے جس کے نظریۂ وسیلہ کی

۱- شرح انواریہ۔ ص 81۔ب

Marfat.com

اس نے نہایت ہی جامعیت کے ساتھ توضیح وتشریح کی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ روایتی فلاطونیت کو بالکل ایرانی نظام فکر میں بدل دیتا ہے جو نہ صرف افلاطون سے قریب ہو جاتی ہے بلکہ اس طریقہ سے قدیم ایرانی ثنویت پر بھی روحانی رنگ چڑھ جاتا ہے۔ اس ایرانی شہید سے زیادہ کسی ایرانی مفکر کو اس ضرورت کا احساس نہیں ہوا کہ وہ وجود خارجی کے تمام پہلوؤں کی توجیہہ اس کے اساسی اصول کے حوالہ سے کرے۔ وہ ہمیشہ تجربے کی طرف رجوع ہوتا ہے اور طبعی مظاہر کی توجیہہ بھی اپنے نظریۂ تجلی کی روشنی میں کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ خارجیت جو ''ہمہ اوست'' کی انتہائی باطنیت میں بالکل دب گئی تھی، اس کے نظامِ فلسفہ میں ابھر آتی ہے۔ جس میں اس کی تفصیلی تحقیق و تفتیش کے بعد ایک جامع توجیہہ کی گئی ہے۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ یہ دقیق النظر فلسفی ایک ایسا نظام فکر تعمیر کرنے میں کامیاب ہوا جو نفوس انسانی کو ہمیشہ متحیر کرتا رہا اور جس نے فکر و جذبہ میں ایک مکمل اتحاد و توافق پیدا کر دیا۔ اس کے معاصرین کی کوتاہ بینی نے اس کو مقتول کا خطاب دیا۔ جس کے یہ معنی بھی نکل سکتے ہیں کہ اس کو شہید نہ سمجھا جائے۔ لیکن مابعد کے صوفیاء فلاسفہ نے ہمیشہ اس کا بہت احترام کیا ہے۔

میں یہاں اشراقی طریقۂ فکر کی ایک ایسی صورت کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس میں روحانیت کم ہے۔ ''نسفی'' نے صوفیانہ تخیل کے ایک ایسے پہلو کو پیش کیا ہے جو ''مانی'' کی قدیم ثنویت کی طرف جاتا ہے۔ اس نقطۂ نظر کے حامیوں کا یہ دعویٰ ہے کہ نور و ظلمت ایک دوسرے کے متلازم ہیں، یہ درحقیقت دو نہریں ہیں جو تیل اور دودھ کی طرح ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں۔ انہی میں سے اشیاء کی کثرت و تعدد ظہور پذیر ہوتا ہے۔ افعال انسانی کا نصب العین ظلمت کی آلودگی سے پاک ہو جانا ہے۔ نور کے ظلمت سے آزاد ہونے کے یہ معنی ہیں کہ نور کو بہ حیثیت نور کے شعور ذات حاصل ہو جائے۔

Marfat.com

حقیقت بہ حیثیت فکر

الجیلی، جیسا کہ خود اس نے اپنے کسی شعر میں کہا ہے' 767ء میں پیدا ہوا۔ 811ء میں وفات پائی۔ ''الجیلی'' ایسا مصنف نہیں تھا جس نے ''شیخ محی الدین ابن عربی کی طرح کوئی جدید تخیل پیش کیا ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ الجیلی کی تعلیمات پر شیخ ''محی الدین ابن عربیؒ'' کے طریقۂ تفکر کا بہت گہرا اثر پڑا ہے۔ اس میں شاعرانہ تخیل اور فلسفیانہ دقیق النظری گھل مل گئی تھی اس کی شاعری اس کے صوفیانہ اور مابعد الطبیعی نظریات کے اظہار کا محض ایک آلہ تھی۔ اس نے منجملہ اور تصانیف کے ''شیخ محی الدین ابن عربیؒ'' کی شرح ''بسم اللہ'' پر جو ''فتوح المکیہ'' کے نام سے موسوم ہے، ایک شرح لکھی اور ''انسانِ کامل'' بھی اس کی مشہور تصنیف ہے۔ (مطبوعہ قاہرہ)۔

اس کا خیال ہے کہ خالص اور بسیط جوہر ایک ایسی شے ہے جس پر اسماء اور اعراض کا اطلاق کیا جاتا ہے.......... خواہ اس کا وجود واقعی ہو یا تصوری، وجود کی دو قسمیں ہیں:

(۱) وجود مطلق یا وجود خالص.......... خدا۔

(۲) وجود جو عدم سے مرکب ہے.......... فطرت۔

خدا کا جوہر یا فکر خالص ہماری فہم سے بالاتر ہے اور کوئی لفظ اس کو ظاہر نہیں کر سکتا کیونکہ یہ ماورائے علائق ہے اور علم تو ایک علاقہ یا نسبت کا نام ہے۔ عقل لامتناہی فضائے بسیط میں سے پرواز کر کے اسماء و اعراض کے پردے کو چاک کرتے ہوئے اور زمان کے ایک وسیع دائرے کو طے کرتے ہوئے اقلیم عدم میں داخل ہوتی ہے۔ یہاں اس کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ فکرِ خالص ایک وجود ہے.......... جو عدم ہے۔ یہ متناقضات

Marfat.com

کا ایک مجموعہ ہے۔ اس کے دو خواص ہیں۔ حیات ازلی بہ زمانِ ماضی .... اور حیات ازلی بہ زمانِ مستقبل۔ اس کی دو صفات ہیں .... خدا اور تخلیق۔ اس کی دو تعریفیں ہیں .... ناقابلِ تخلیق ہونا اور قابل تخلیق ہونا۔ اس کے دو نام ہیں .... خدا اور انسان۔ اس کی دو صورتیں ہیں .... ظاہر (یہ دنیا) اور پوشیدہ (عقبیٰ)۔ اس کے دو معلولات ہیں .... جبر اور امکان۔ اس کے دو نقاطِ نظر ہیں۔ پہلے نقطۂ نظر سے یہ اپنے لیے معدوم اور اپنے سے ماسوا کے لیے موجود اور دوسرے نقطۂ نظر سے یہ اپنے لیے موجود اور اپنے سے ماسوا کے لیے معدوم۔

وہ کہتا ہے کہ اسم، مسمّٰی کو ہماری فہم میں جما دیتا ہے۔ ذہن میں اس کی تصویر کھینچ دیتا ہے۔ تخیل میں اس کو حاضر کرتا اور حافظہ میں محفوظ کر دیتا ہے۔ اسم مسمّٰی کا خارج یا پوست ہے۔ لیکن مسمّٰی باطن یا مغز ہے۔ بعض اسماء درحقیقت موجود نہیں ہوتے۔ ان کا وجود برائے نام ہوتا ہے، جیسے عنقا۔ یہ ایک اسم ہے جس کا مسمّٰی درحقیقت نہیں ہے۔ بس خدا بھی مطلقاً موجود ہے۔ گو ہم اس کو چھو یا دیکھ نہیں سکتے۔ ''عنقا'' صرف تصور میں موجود ہے۔ لیکن ''اللہ'' کے اسم کا مسمّٰی فی الواقع موجود ہے اور اس کا علم بھی ''عنقا'' کی طرح اسماء و اعراض ہی کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ اسم ایک آئینہ ہے۔ جو ہستیِ مطلق کے تمام اسرار کو منکشف کر دیتا ہے۔ یہ ایک روشنی ہے جس کے ذریعہ سے خدا اپنے آپ کو دیکھتا ہے۔ یہاں الجیلی فرقہ اسماعیلیہ کے اس نقطۂ نظر کے قریب پہنچ گیا ہے کہ مسمّٰی کو اسم کے ذریعے سے تلاش کرنا چاہیے۔

اس عبارت کو سمجھنے کے لیے ہم کو ہستیِ خالص کے ارتقاء کے ان تین منازل کو ذہن نشین رکھنا چاہیے۔ جو اس نے یہاں گنوائے ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ ہستیِ مطلق باوجود خالص ہونے کے اپنی مطلقیت کو چھوڑنے کے بعد تین منازل سے گزرتی ہے (۱)

Marfat.com

احدیت (۲) غیریت (۳) ذاتیت۔ پہلی منزل میں تمام اعراض وعلائق کا فقدان ہوتا ہے۔ پھر بھی اس کو واحد ہی کہتے ہیں۔ اس لیے احدیت، مطلقیت سے ایک قدم ہٹ جاتی ہے۔ دوسری منزل میں ہستیِ خالص تمام مظاہر سے آزاد رہتی ہے اور تیسری منزل یعنی ذاتیت خود غیریت ہی کا ایک خارجی مظہر ہے۔ جیسا کہ ہیگل اس کی تعبیر کرے گا۔ یہ انفصالِ ذات باری ہے۔ یہ تیسری منزل اسم اللہ کا دائرہ ہے۔ یہاں ہستیِ خالص کی ظلمت کو منور کیا جاتا ہے فطرت اس کے سامنے آجاتی ہے۔ ہستیِ مطلق ذی شعور ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ اسم اللہ ایک چیز ہے۔ جس سے الوہیت کے مختلف پہلو کمال کو پہنچ جاتے ہیں۔ ہستیِ خالص کی ترقی کی دوسری منزل میں انفصال ذات ربانی کا جو کچھ نتیجہ برآمد ہوتا ہے وہ اسی اسم کی گرفت میں بالقواء موجود تھا۔ جس نے ارتقاء کی تیسری منزل میں آکر خارجیت اختیار کر لی اور ایک ایسا آئینہ بن گیا جس میں خدا نے اپنے آپ کو منعکس کیا۔ پس! اس طرح اسم اللہ نے اپنے آپ کو شفاف کر کے ہستیِ مطلق کی تاریکی کو دور کر دیا۔

ارتقاءِ مطلق کی ان تین منازل کے مقابل میں انسان کامل کی روحانی تادیب کی بھی تین منازل ہیں۔ لیکن انسان کامل کے عمل ارتقاء کو معکوس ہونا چاہیے کیونکہ اس کا عمل ارتقاء...... ترقی کی طرف ہے اور ہستی مطلق تو دراصل منزل کی طرف آتی ہے۔ اپنی روحانی ترقی کی پہلی منزل میں وہ اس اسم پر استغراق کرتا ہے اور اس فطرت کا مطالعہ کرتا ہے جس پر یہ اسم مرتسم ہے۔ دوسری منزل میں وہ عرض کے دائرے میں قدم رکھتا ہے۔ تیسری منزل میں جوہر کے دائرے میں داخل ہوتا ہے۔ یہاں پہنچ کر وہ انسان کامل بنتا ہے۔ اس کی آنکھ خدا کی آنکھ، اس کا کلام خدا کا کلام اور اس کی زندگی خدا کی زندگی بن جاتی ہے۔ یعنی وہ فطرت کی عام زندگی میں شریک ہو جاتا ہے اور

Marfat.com

''اشیاء کا راز حیات معلوم کر لیتا ہے۔''

اب عرض کی ماہیت پر غور کرنا چاہیے۔ اس دلچسپ سوال کے متعلق اس کے خیالات بہت ہی اہم ہیں۔ کیونکہ یہی وہ نقطہ ہے جہاں اس کا نظریہ ہندی تصوریت سے بالکل مختلف ہو جاتا ہے۔ اس نے عرض کی یہ تعریف کی ہے کہ یہ ایسا وسیلہ ہے جس سے اشیاء کی حالت کا علم حاصل ہوتا ہے۔ کسی اور جگہ وہ کہتا ہے کہ عرض میں اور حقیقتِ پنہاں میں جو امتیاز ہے وہ صرف مظاہر کے دائرے میں قائم رہ سکتا ہے۔ کیونکہ یہاں ہر ایک عرض کو اس حقیقت کے ماسوا سمجھا جاتا ہے۔ جس میں یہ قائم ہے اس غیریت کی وجہ یہ ہے کہ مظاہر کے دائرے میں اتصال وانفصال کا وجود ہے۔ لیکن یہ امتیاز حقیقت پنہاں کے قلمرو میں قائم نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ یہ اتصال وانفصال نہیں ہے۔ یہ ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ نظریہ ''مایا'' کے حامیوں سے یہ کس قدر زبردست اختلاف رکھتا ہے۔ اس کا یقین ہے کہ عالم مادی کا وجود حقیقی ہے۔ بلاشبہ یہ ہستیِ حقیقی کا خارجی پوست ہے لیکن یہ خارجی پوست بھی کچھ کم حقیقی نہیں اس کے نزدیک عالم حادث کی علت کوئی ایسی حقیقی ہستی نہیں جو اعراض کے مجموعہ کے عقب میں پوشیدہ ہے۔ بلکہ یہ ایک تصور ہے۔ جو ذہن کا آفریدہ ہے۔ لہٰذا مادی عالم کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔ ''بارکلے'' اور ''فشٹے'' اس حد تک ہمارے مصنف سے اتفاق کریں گے۔ لیکن اس کا نقطۂ نظر ہیگل کے فکر و ہستی کی غیبت کے مخصوص نظریہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ ''انسانِ کامل'' جلد دوئم، باب 38 میں اس نے واضح طور پر کہا ہے کہ تصور ہی وہ مواد ہے جس سے کائنات نے تشکیل پائی ہے۔ فکر، تصور، اور ادراک ہی وہ مواد و مسالہ ہیں جس سے فطرت کی ساخت ہوئی ہے۔ اس نظریہ پر زور دیتے ہوئے وہ کہتا ہے.......... کیا تم اپنے اعتقاد پر غور نہیں کرتے؟ وہ حقیقت کہاں ہے جس میں یہ نام نہاد اعراض ربانی قائم ہیں؟ وہ

تصور کے سوا کچھ اور نہیں۔ پس فطرت ایک متشکل تصور کے سوا اور کوئی شے نہیں۔ وہ کانٹ کی ''تنقید عقل خالص'' کے نتائج کو دل سے تسلیم کرتا ہے لیکن اس کے برخلاف وہ اسی تصور کو کائنات کا جوہر بنا دیتا ہے۔ اس کے نزدیک ''شے بذات خود'' عدم محض ہے۔ اعراض کے مجموعہ کے عقب میں کوئی شے نہیں۔ اعراض حقیقی اشیاء ہیں۔ عالم مادی، ہستی مطلق کی خارجی صورت ہے۔ یہ ہستی مطلق ہی کی ایک دوسری ذات ہے۔ یہ دوسری ذات اس قوتِ تفریق سے وجود میں آئی ہے جو ہستی مطلق ہی کے مایۂ خمیر میں داخل ہے۔ فطرت، خدا کے ذہن کا ایک تصور ہے۔ یہ ایسی شے ہے جس کے بغیر خدا اپنی ذات کا علم حاصل نہیں کر سکتا۔ ''ہیگل'' اپنے نظریہ کو فکر و ہستی کی عینیت سے تعبیر کرتا ہے۔ لیکن ''الجیلی'' اس کو عرض و حقیقت کی نوعیت کہتا ہے۔ یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اس مصنف کا ''عالم اعراض'' کا فقرہ جس کو وہ عالم مادی کے لیے استعمال کرتا ہے کسی قدر گمراہ کن ہے۔ درحقیقت وہ جس بات کا مدعی ہے' یہ ہے کہ عرض و حقیقت..... کا امتیاز محض ظاہری ہے اور اشیاءِ کے متعلق یہ امتیاز قطعاً موجود نہیں۔ یہ اس لیے مفید ہے کہ ہم کو اپنے گردوپیش کے عالم کو سمجھنے میں سہولت ہوتی ہے۔ لیکن یہ قطعاً حقیقی نہیں۔ یہ سمجھا جائے گا کہ الجیلی تجربی تصوریت کی صداقت کو آزمائشی طور پر تسلیم کرتا ہے۔ لیکن وہ اس امتیاز کی قطعیت کو تسلیم نہیں کرتا۔ ان امور سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ الجیلی ''شے بذاتِ خود'' کی خارجی حقیقت میں یقین نہیں رکھتا ہے وہ اس میں یقین تو رکھتا ہے لیکن وہ اس کی وحدت کا علمبردار ہے۔ اور کہتا ہے کہ عالم مادی ''شے بذات خود'' ہے، عالم مادی ''شے بذات خود'' کا خارجی مظہر ہے۔ ''شے بذات خود'' اور اس کا خارجی مظہر یا انفصال ذات کا نتیجہ، درحقیقت ایک دوسرے کے مماثل ہیں، اگرچہ ہم ان میں امتیاز کر لیتے ہیں تاکہ کائنات کے سمجھنے میں سہولت ہو۔ وہ کہتا ہے کہ اگر یہ مماثل نہیں ہیں تو

Marfat.com

ایک دوسرے کا مظہر کس طرح ہو سکتے ہیں؟ مختصر یہ کہ ''شے بذات خود'' سے اس کی مراد خالص اور مطلق ہستی ہے، اور وہ اسی ہستی کو اس کے ظواہر یا خارجی مظاہر کے توسط سے تلاش کرتا ہے۔ اس کا قول ہے کہ جب تک ہم عرض و حقیقت کی عینیت کو متحقق نہ کرلیں عالم مادی یا عالم اعراض ایک پردہ نظر آتا ہے اور جب یہ نظریہ سمجھ میں آجاتا ہے تو یہ پردہ اٹھ جاتا ہے۔ ہم جوہر کو ہر جگہ دیکھتے ہیں اور یہ معلوم کرتے ہیں کہ تمام اعراض خود ہم ہی ہیں۔ فطرت اس وقت اپنی اصلی روشنی میں آجاتی ہے۔ غیریت دور ہو جاتی ہے اور ہم اس سے متحد ہو جاتے ہیں۔ بے تاب کرنے والا تجسس ختم ہو جاتا ہے۔ ذہن کی تجسّسی کیفیت کی جگہ فلسفیانہ سکوت کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ جو شخص اس عینیت کو متحقق کر لیتا ہے اس کے لیے سائنس کے انکشافات اُسے کوئی نئی اطلاع نہیں پہنچاتے۔ مذہب جس کو فوق الفطرت اقتدار حاصل ہے' اس کو کوئی نئی بات نہیں بتلاتا۔ یہ روحانی آزادی ہے۔

اب ہم اس پر غور کریں گے کہ اس نے مختلف اسماء و اعراض ربانی کو کس طرح منقسم کیا ہے۔ جو فطرت میں ظہور پا چکے ہیں۔ اس کی تقسیم حسب ذیل ہے۔

(۱) خدا کے اسماء و اعراض جیسا کہ وہ بذات خود ہے (اللہ، واحد، فرد، نور، صداقت، ظاہر، حی)

(۲) خدا کے اسماء و اعراض بہ حیثیت کمال کے (خالق، کریم، اول، آخر)

(۳) خدا کے اسماء و اعراض بہ حیثیت جمال کے (نا قابل خلق، مصور، رحیم، مبداءِ کل)

ان میں سے ہر ایک اسم و عرض اپنا ایک خاص اثر رکھتا ہے جس کے ذریعہ سے وہ انسان کامل کی روح کو اور فطرت کو منور کر دیتا ہے۔ یہ تجلیات کس طرح ظہور میں آتی

ہیں اور وہ روح تک کس طرح پہنچتی ہیں، اس کی توجیہہ ''الجیلی'' نے نہیں کی۔ ان امور پر اس کا خاموش رہنا اس کے صوفیانہ خیالات کو اور تقویت دیتا ہے، اور روحانی رہبری کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

خاص خاص ربانی اسماء و اعراض کے متعلق الجیلی کے خیالات پر غور کرنے سے پہلے یہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ خدا کا تصور جو اس نے اوپر کی تقسیم میں بیان کیا ہے.......... وہ شلائر ماخر کے تصور خدا سے بہت ہی ملتا جلتا ہے۔ جرمن متکلم صفات ربانی کو قوت کی صفتِ واحد میں تحویل کر دیتا ہے۔ لیکن ہمارا مصنف یہ محسوس کرتا ہے کہ خدا کو صفات و اعراض سے معرا کرنے میں کیا خطرہ ہے، پھر بھی وہ شلائر ماخر کا ہم آہنگ ہو کر یہ تسلیم کرتا ہے کہ.......... ''خدا ایک نا قابل تغیر وحدت ہے''۔

اور اس کے اعراض محض وہ خیالات ہیں جو انسان مختلف نقاط نظر سے اس کے متعلق قائم کرتا ہے۔ یہ اعراض مختلف ظواہر ہیں۔ جن کو یہ لاتغیر علت ہماری محدود عقل کے سامنے اسی طرح پیش کرتی ہے جس طرح کہ ہم اس پر روحانی منظر کے مختلف جوانب سے نظر ڈالتے[1] ہیں۔

وجود مطلق کی حالت میں وہ اسماء و اعراض کی قید سے بالاتر ہے۔ لیکن جب وہ خارجیت اختیار کر لیتا ہے۔ جب وہ اپنی مطلقیت کو چھوڑ دیتا ہے، جب فطرت پیدا ہوتی ہے.......... تو اس پر اسماء و اعراض کی مہر لگ جاتی ہے۔

اب ہم اس پر غور کریں گے کہ خاص خاص اسماء و اعراض ربانی کے متعلق اس کی کیا تعلیم ہے؟۔ پہلا اصل نام ''اللہ'' ہے۔ جس کے معنی تمام حقائقِ وجود کے مجموعہ کے

1-Matheson's Aids to German Theology-p.34)

Marfat.com

ہیں۔ ہر حقیقت اس مجموعہ میں ایک ترتیب کے ساتھ آتی ہے۔ یہ نام جب خدا کو دیا جاتا ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ صرف خدا ہی وجود لازمی ہے، الوہیت، ہستیِ خالص کا اعلیٰ ترین مظہر ہے۔ اِن کے مابین فرق یہ ہے کہ آخر الذکر آنکھوں کے لیے مرئی ہے، لیکن اس کا مقام غیر مرئی ہے۔ اول الذکر کی علامات مرئی ہیں لیکن...... یہ خود غیر مرئی ہے۔ اس واقعہ سے کہ ہستی خالص ہی الوہیت ہے .... فطرت حقیقی الوہیت نہیں ہوسکتی۔ پس الوہیت غیر مرئی ہے۔ لیکن اس کی علامات، فطرت کی صورت میں آنکھوں کے لیے مرئی ہیں۔ الوہیت جیسا کہ ہمارے مصنف نے تشریح کی ہے، پانی ہے اور فطرت آب منجمد یا برف ہے، لیکن برف پانی نہیں۔ جوہر آنکھوں کے لیے مرئی ہے۔ گو اس کے تمام اعراض کا ہم کو علم نہیں۔ (یہ ہمارے مصنف کی فطری حقیقت یا تصوریتِ مطلق کا مزید ثبوت ہے)۔ ہم ان کے اظلال یا اثرات کو ہی جانتے ہیں۔ مثلاً خیرات فی نفسہٖ نامعلوم ہے۔ ہم صرف اس کے اثر کو یا اس واقعہ کو جانتے اور دیکھتے ہیں کہ غرباء کو کچھ دیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اعراض خود جوہر کی ماہیت میں داخل ہیں۔ اگر اعراض کی حقیقی ماہیت کا اظہار ممکن ہوتا تو جوہر سے اس کو علیحدہ کرنا بھی ممکن ہو جاتا۔ اس کے علاوہ خدا کے اور بھی اصلی نام ہیں۔ احدیتِ مطلق اور احدتِ بسیط احدیت مطلق میں فکر خالص، ظلمت سے ظہور کی روشنی کی طرف ایک قدم بڑھاتی ہے۔ (یہ ویدانت کا باطنی یا ابتدائی مایا ہے) اگرچہ اس حرکت کی معیت میں خارجی مظاہر نہیں ہوتے۔ پھر بھی یہ تمام مظاہر کو اپنی کلیت میں سمیٹ لیتی ہے۔ ہمارا مصنف کہتا ہے کہ ایک دیوار کو بغور دیکھو! تم کو پوری دیوار نظر آئے گی۔ لیکن تم اس مواد وسالہ کے مختلف اجزاء کو نہ دیکھ سکو گے جن سے یہ دیوار بنی ہے۔ یہ دیوار ایک وحدت ہے۔ لیکن یہ ایسی وحدت ہے جس میں کثرت و تعدد بھی شامل ہے۔ اسی طرح ہستی

Marfat.com

خالص بھی ایک وحدت ہے۔ لیکن یہ ایسی وحدت ہے جو کثرت و تعدد کی روح رواں ہے۔

ہستی مطلق کی تیسری حرکت احدیت بسیط کی طرف ہے۔ یعنی جب ہستی مطلق اس طرف قدم اٹھاتی ہے تو اس کی معیت میں مظاہر خارجی بھی ہوتے ہیں۔ احدیت مطلق خاص خاص اسماء و اعراض سے بالکل آزاد ہوتی ہے۔ احدیت بسیط اسماء و اعراض سے مملو ہوتی ہے۔ لیکن ان اعراض میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک دوسرے کا جوہر ہوتے ہیں۔ الوہیت، احدیت بسیط کے مماثل ہے۔ لیکن اس کے اسماء و اعراض ایک دوسرے سے متمائز بلکہ متناقض ہوتے ہیں۔ جیسے عفو متناقض ہے انتقام کا[۱] - تیسرے قدم کا جس کو ''ہیگل'' سفر ہستی کہتا ہے.......... ایک اور نام بھی ہے، (رحم)۔ ہمارا مصنف لکھتا ہے کہ پہلا رحم کائنات کا وہ ارتقاء ہے جو خود اس کی ذات میں سے ہوتا ہے اور ان سالمات میں خود اس کی ذات کا اظہار ہوتا ہے۔ جو انفعال ذات کا نتیجہ ہے۔ الجیلی اس خیال کو ایک تمثیل کے ذریعہ سے واضح کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ فطرت آب منجمد ہے اور خدا آب ہے۔ فطرت کا حقیقی نام اللہ ہے۔ برف یا آب منجمد محض ایک نام ہے جو مستعار لیا گیا ہے۔ ایک اور جگہ وہ پانی کو علم، عقل، فہم، فکر اور تصور کا مبداء کہتا ہے۔ اس مثال سے وہ ظاہر نہیں ہونے دیتا کہ وہ خدا کو فطرت کے

۱- (یہ خیال ویدانت کے مظہری برہما کے تصور سے بہت کچھ مشابہہ ہے۔ شخصی خالق یا ویدانت کا پراج پتی، ہستی مطلق یا اعیانی برہما کا تیسرا قدم ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ الجیلی دو قسم کے برہما کو تسلیم کرتا ہے۔ ایک جس میں صفات ہوتی ہیں، دوسرا جس میں صفات نہیں ہوتیں۔ جیسے سا کارا اور بدرایانا۔ اس کے نزدیک عمل تخلیق درحقیقت فکر مطلق کا انحطاط ہے اور جس حد تک یہ مطلق ہے اس کو اسَت کہتے ہیں۔ یہ وحدت مطلق کے اس خیال کی طرف مائل ہوتا ہے جو رامانجا کے خیال کے مشابہہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ انفرادی روح کی حقیقت کو تسلیم کرتا ہے اور سمکارا کے خلاف اس کا یہ خیال ہے کہ اشور اور اس کی پرستش اعلیٰ ترین علم کے حصول کے بعد بھی ضروری ہے)

Marfat.com

اندر موجود خیال کرتا ہے یا یہ سمجھتا ہے کہ خدا مادی وجود کے دائرے میں جاری و ساری ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا کا فطرت کے اندر موجود ہونا ہستی کے اختلال کا مستلزم ہے خدا فطرت کے اندر نہیں ہے۔ کیونکہ وہ خود موجود ہے۔ خارجی وجود خدا کی ذات کا دوسرا رخ ہے...... یہ ایک روشنی ہے۔ جس کے ذریعے سے خدا اپنے آپ کو دیکھتا ہے۔ جس طرح ایک تصور کو پیدا کرنے والا خود اس تصور کے اندر موجود ہوتا ہے۔ اسی طرح خدا فطرت کے اندر موجود ہوتا ہے۔ کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ خدا اور انسان میں فرق یہ ہے کہ خدا کے تصورات مادی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور ہمارے تصورات نہیں کرتے۔ یہاں یہ ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ ''ہیگل'' بھی اپنے آپ کو ''ہمہ اوست'' کے الزام سے بری رکھنے کے لیے اس قسم کا استدلال کرے گا۔

رحم اور رزاقی کی صفت میں قریبی تعلق ہے۔ وہ اس کی تعریف اس طرح کرتا ہے کہ یہ ان چیزوں کا مجموعہ ہے جن کے محتاج تمام موجودات ہوتے ہیں۔ اسی اسم کی قوت سے نباتات کو پانی بہم پہنچتا ہے۔ ایک طبعی فلسفی اسی خیال کو ایک دوسرے طریقے سے ظاہر کرے گا۔ وہ ان مظاہر کو فطرت کی کسی ایک قوت کی فعلیت کا نتیجہ کہے گا۔ الجیلی اس کو رزاقی کا مظہر کہے گا۔ لیکن ایک طبعی فلسفی کی طرح وہ اس بات کی حمایت نہیں کرے گا کہ یہ قوت ناقابل علم ہے۔ وہ یہ کہے گا کہ اس کے عقب میں بجز ہستی مطلق کے اور کوئی شے نہیں ہے۔

خدا کے اسماء و اغراض کی بحث ہم ختم کر چکے ہیں۔ اب یہ دریافت کریں گے کہ تمام اشیاء سے پہلے جو کچھ موجود تھا...... اس کی ماہیت کیا ہے؟ الجیلی کہتا ہے کہ پیغمبر عرب صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بار کسی نے یہ دریافت کیا تھا کہ تخلیق عالم سے پہلے خدا کا مقام کہاں تھا؟ آپؐ نے فرمایا کہ تخلیق عالم سے پہلے خدا ''اعما'' میں موجود تھا۔

اب ہم اس ''اعما'' یا ظلمت اولیٰ کی ماہیت کی تحقیق کرنا چاہتے ہیں۔ یہ تحقیق خاص طور پر اس لیے دلچسپ ہے کہ اگر اس لفظ کا جدید اصطلاحات میں ترجمہ کیا جائے تو............ ''لاشعوریت'' کے مترادف ہوگا۔ صرف یہی ایک لفظ ہمارے دل میں یہ نقش بٹھا دیتا ہے کہ الجیلی نے کس قدر دور بینی کے ساتھ جدید جرمنی کے مابعد الطبعی نظریات کی پیش بینی کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ''لاشعوریت'' تمام حقائق کی حقیقت ہے۔ یہ ایسی ہستی خالص ہے جس میں پستی اور تنزل کی طرف کوئی حرکت نہیں ہوتی یہ خدا اور تخلیق جیسے اعراض سے بالکل معرا ہے۔ یہ کسی نام یا صفت کی محتاج نہیں۔ کیونکہ یہ دائرہ علائق سے ماوراء ہے۔ یہ احدیت مطلق سے متمائز ہے کیونکہ اس نام کا اطلاق ہستی خالص پر اس وقت ہوتا ہے جبکہ یہ ظہور پذیر ہونے کی حالت میں رہتی ہے۔ بہر حال یہ ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ جب ہم خدا اور تخلیق کے تقدم و تاخر کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارے الفاظ میں زمان کا مفہوم نہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ کسی مرور زمانی یا خدا اور اس کی ذات میں انفصال نہیں ہوسکتا۔ زمان یا استمرار زمانی یا مکانی ہی جب مخلوقات میں سے ہیں تو پھر ایک مخلوق شے کس طرح خدا اور اس کی مخلوق میں حائل ہوسکتی ہے۔ پس قبل اور بعد کہاں اور کب جیسے الفاظ جب فکر کے دائرہ میں استعمال کیے جائیں تو ان سے زمان یا مکان کا مفہوم نہ لینا چاہیے۔ حقیقی شے انسانی تصورات کی گرفت سے ماوراء ہے۔ مادی وجود کا کوئی مقولہ اس پر منطبق نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ بقول ''کانٹ'' .... یہ نہیں کہا جاسکتا کہ مظاہر کے قوانین ذات واعیان کے دائرے میں پائے جاتے ہیں۔

ہم نے پہلے ہی معلوم کرلیا ہے کہ انسان کو کمال کی طرف ترقی کرنے میں تین منازل میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ پہلی منزل میں اس اسم پر استغراق و مراقبہ کرنا پڑتا ہے۔ جس کو ہمارا مصنف تمام اسماء کی تجلی سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے............ جب

Marfat.com

خدا کسی خاص شخص کو اپنے اسماء کے نور سے منور کر دیتا ہے تو یہ شخص اس اسم کی چکا چوند کر دینے والی روشنی میں فنا ہو جاتا ہے اور جب تم خدا کو پکارتے ہو تو یہی شخص اس آواز کا جواب دیتا ہے'' اور اس تنویر کا نتیجہ ''شوپن ہور'' کی زبان میں یہ ہو گا کہ انفرادی ارادہ فنا ہو جائے گا۔ تاہم اس کو جسمانی موت سے خلط ملط نہ کرنا چاہیے کیونکہ بقول ''کپیلا'' .... فرد ''پراکرتی'' سے متحد ہو جانے کے بعد بھی زندہ اور چرخہ کی طرح متحرک رہتا ہے۔ اس موقع پر کوئی فرد ''ہمہ اوست'' کے نشہ میں پکار اٹھتا ہے.........

''میں اس میں تھا اور وہ مجھ میں۔ اور ہم کو کوئی جدا کرنے والا نہیں تھا۔''

روحانی تادیب کی دوسری منزل وہ ہے جس کو وہ تجلی صفات سے تعبیر کرتا ہے۔ اس تجلی کے ذریعہ سے انسان کامل، خدا کی صفات، ان کی اصلی ماہیت میں اسی تناسب سے حاصل کرتا ہے۔ جس قدر اس میں حاصل کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ یہ ایسا واقعہ ہے جو انسانوں کو اس روشنی کی وسعت کے لحاظ سے جو اس سے ہوتی ہے، مختلف طبقوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ بعض لوگ حیات کی صفت ربانی سے تجلی حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح وہ کائنات کی روح میں شریک ہو جاتے ہیں۔ اس روشنی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان ہوا میں پرواز کرتا ہے۔ پانی پر چلتا ہے اور اشیاء کے حجم کو بدل دیتا ہے۔ (جیسا کہ مسیح نے اکثر کیا تھا) اس طرح انسان کامل تمام صفات ربانی سے تجلی حاصل کر کے اسم و اعراض کے دائرے سے گزر جاتا ہے اور جوہر یا وجود مطلق کے قلمرو میں قدم رکھتا ہے۔

جیسا کہ ہم نے پہلے ہی معلوم کر لیا ہے ہستیِ مطلق جب اپنی مطلقیت کو چھوڑ دیتی ہے تو اس کو تین منازلِ سفر طے کرنے پڑتے ہیں، اور ہر ایک سفر جو ہر مطلق کی کلیت کے عمل تفرید پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان تینوں حرکات میں سے ہر ایک حرکت ایک نئے اسم

Marfat.com

کے تحت ظاہر ہوتی ہے اور روحِ انسانی پر اس کی تجلی کا ایک خاص اثر پڑتا ہے۔ ہمارے مصنف کی روحانی اخلاقیات یہاں ختم ہو جاتی ہیں۔ انسان یہاں کامل ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو ہستی مطلق سے متحد کر لیتا ہے۔ یا بقول ہیگل.......... انسان یہاں فلسفۂ مطلق سیکھ لیتا ہے۔ ''وہ کمال کا اعلیٰ ترین نمونہ پرستش کی چیز اور کائنات کا محافظ بن جاتا ہے۔[1] ''یہی وہ نقطہ ہے جہاں انسانیت اور الٰہیت ایک ہو جاتی ہیں اور اس کا نتیجہ انسانِ ربانی کی پیدائش ہے۔

روحانی ارتقاء کی اس بلندی پر انسان کامل کس طرح پہنچتا ہے اس کو ہمارے مصنف نے نہیں بیان کیا۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ ہر منزل میں اس کو ایک خاص قسم کا تجربہ ہوتا ہے اور اس میں ذرہ بھر بھی شک وشبہ نہیں ہے۔ اس تجربے کے آلے کو وہ ''قلب'' سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ ایسا دقیق لفظ ہے جس کی تحدید ذرا دشوار ہے وہ ''قلب'' کا ایک صوفیانہ نقشہ پیش کرتا ہے اور اس کی اس طرح توجیہہ کرتا ہے کہ یہ ایک آنکھ ہے جو اسماء واعراض اور ہستیِ مطلق کا علی الترتیب مشاہدہ کرتی ہے۔ یہ نفس اور روح کے ایک پر اسرار اتحاد سے پیدا ہوتا ہے اور وجود کے انتہائی حقائق کو معلوم کرنے کا فطرۃً ایک آلہ بن جاتا ہے۔ ''قلب یا وہ شے'' جس کو ویدانت میں اعلیٰ مبداء علم کہا گیا ہے وہ جو کچھ منکشف کرتی ہے' اس کو کوئی فرد اس طرح نہیں دیکھتا کہ یہ اس کی ذات سے علیحدہ اور متبائن ہے، بلکہ اس کو جو کچھ اس ذریعہ سے دکھایا جاتا ہے وہ خود اسی کی حقیقت اور اسی کی پوشیدہ ہستی ہے۔ اس ذریعہ یا واسطہ کی خصوصیت ہی ایسی ہے کہ وہ اس کو عقل سے متمائز کر دیتی ہے۔ اس کا مقصد اس فرد سے ہمیشہ مختلف اور جداگانہ ہوتا ہے جو عقل کی قوت کا استعمال کرتا ہے۔ اس مذہب کے صوفیاء کے خیال کے مطابق روحانی تجربہ

۱۔ انسان کامل۔ جلد اول۔ ص 48

مستقل اور مستمر نہیں ہوتا۔[1] مے تھیو آرنلڈ کہتا ہے روحانی مکاشفہ کے لمحات ہمارے حکم اور قابو میں نہیں ہوتے۔ انسان ربانی خود اپنی ہستی کے راز سے واقف ہوتا ہے۔ لیکن جب یہ خاص روحانی تحقق ختم ہو جاتا ہے......... انسان انسان ہی رہ جاتا ہے.........اور خدا، خدا ہی۔ اگر یہ تجربہ مستقل اور مستمر ہوتا تو ایک بڑی اخلاقی قوت زائل ہو جاتی اور معاشرہ میں انتشار پیدا ہو جاتا۔

اب ہم الجیلی کے نظریۂ تثلیث کو سمیٹ کر بیان کریں گے۔ ہم ہستیِ مطلق کی تین حرکات یا ہستی خالص کے تین ملکات کو معلوم کر چکے ہیں اور ہم نے یہ بھی معلوم کر لیا ہے کہ تیسری حرکت کی معیت میں خارجی مظاہر بھی ہوتے ہیں اور جس میں جوہر اپنے آپ کو خدا اور انسان میں منفصل کر دیتا ہے اس انفصال سے جو جگہ خالی ہوتی ہے اس کو انسان کامل پُر کرتا ہے۔ یہ ربانی اور انسانی دونوں صفات میں شریک رہتا ہے۔ الجیلی کا خیال ہے کہ انسان کامل کائنات کا محافظ ہے، لہٰذا تسلسل فطرت کے لیے انسان کامل کا ظہور ایک لازمی شرط ہے۔ یہ ذہن نشین کر لینا آسان ہے کہ ہستیِ مطلق جو اپنی مطلقیت کو چھوڑ چکی تھی پھر انسان کامل میں واپس جاتی ہے اور بغیر انسان کامل کے اس کے لیے ایسا کرنا ناممکن تھا۔ کیونکہ اس کے بغیر نہ تو فطرت ہی کا وجود ہوتا اور نہ روشنی ہی ہوتی۔ جس کے ذریعے سے خدا اپنے آپ کو دیکھ سکتا۔ وہ روشنی جس کے ذریعہ خدا اپنے آپ کو دیکھتا ہے اس وقت تفریق کی وجہ سے وجود میں آتی ہے۔ خود ہستیِ مطلق کی ذات موجود ہے۔ اس قوت کو اس نے مندرجہ ذیل شعر میں بیان کیا ہے:

"اگر تم کہو گے کہ خدا ایک ہے تو تم صحیح کہتے ہو۔ لیکن اگر تم یہ کہو گے کہ وہ دو ہے تو یہ صحیح ہوگا۔

---

[1] "ہم جب چاہیں اس آگ کو سلگا نہیں سکتے جو ہمارے دل میں پوشیدہ ہے"

Marfat.com

اگر تم یہ کہو گے کہ نہیں وہ تین ہے تو تم صحیح کہتے ہو کیونکہ انسان کی صحیح ماہیت ہے[1]

پس انسان کامل ایک درمیانی کڑی ہے۔ ایک طرف تو وہ اساسی اسماء سے تجلی حاصل کرتا ہے اور دوسری طرف تمام ربانی صفات اس میں ظہور کرتی ہیں۔ یہ صفات حسب ذیل ہیں:

(۱) حیات یا وجود مستقل

(۲) علم جو حیات ہی کی ایک صورت ہے۔ اس کو اس نے قرآن کی آیت سے ثابت کیا ہے۔

(۳) ارادہ .... یہ قوت تفرید یا ہستی کا ظہور ہے۔ اس نے اس کی تعریف اس طرح کی ہے کہ یہ خدا کے علم کی ایک تجلی ہے، لہٰذا یہ علم ہی کی ایک خاص صورت ہے۔ اس کے نو (۹) مظاہر ہیں اور یہ سب محبت ہی کے مختلف نام ہیں اور آخری نام ایسی محبت ہے جس میں محبّ و محبوب، عالم و معلوم ایک دوسرے میں جذب ہو کر ایک ہو جاتے ہیں وہ کہتا ہے محبت کی یہ صورت جوہر مطلق ہے۔ یا جیسا کہ مسیحیت کی تعلیم ہے۔ خدا ہی محبت ہے۔ یہاں وہ اس بات سے متنبہ کر دیتا ہے کہ فرد کے فعل ارادی کے متعلق یہ سمجھنا کہ وہ علت کے وقوع میں آتا ہے ایک غلطی ہے۔ صرف عالمگیر ارادہ کا فعل بلا علت کے ہوتا ہے۔ پس وہ ہیگل کے نظریۂ آزادی کے متضمن ہے اور اس بات کا مدعی ہے کہ انسان اپنے افعال میں آزاد بھی ہے اور مجبور بھی۔

(۴) قوت...... جو اپنے آپ کو انفصالِ ذات یعنی تخلیق میں ظاہر کرتی ہے۔ وہ شیخ محی الدین ابن عربیؒ کے اس خیال پر جرح کرتا ہے کہ کائنات تخلیق سے پہلے خدا

۱۔ انسان کامل۔ جلد اول۔ ص 8) یہی ہے

کے علم میں موجود تھی۔ وہ کہتا ہے اس سے یہ نتیجہ لازم آئیگا کہ خدا نے کائنات کو عدم محض سے خلق نہیں کیا اور یہ دعویٰ کرتا ہے کہ کائنات اپنے وجود سے پہلے بہ حیثیت ایک تصور کے خدا کی ذات میں موجود تھی۔

(۵) کلام یا ہستیِ منعکسہ.......... ہر ایک امکان خدا کا کلام ہے۔ پس فطرت خدا کے کلام کی مادی صورت ہے۔ اس کے مختلف نام ہیں۔ مثلاً کلام محسوس، انسانی حقائق کا مجموعہ، ربانیت کی ترتیب، احدیت کا امتداد، نامعلوم کا مظہر، جمال کا پہلو، اسماء و اعراض کا سراغ، خدا کے علم کا معروض۔

(۶) غیر مسموع کو سننے کی قوت۔

(۷) غیر مرئی کو دیکھنے کی قوت۔

(۸) جمال فطرت میں جو شے بہت ہی کم حسین و جمیل نظر آتی ہے (جمال منعکسہ) وہ اپنی اصلی ماہیت میں جمال ہی ہے۔ شر محض اضافی ہے۔ اس کا کوئی حقیقی وجود نہیں۔ گناہ محض ایک اضافی قبح ہے۔

(۹) عظمت و جلال۔

(۱۰) کمال۔ یہ خدا کا ناقابل علم جوہر ہے اور اسی لیے لامتناہی و لامحدود ہے۔

Marfat.com

باب ۲

تصوف اور نظریہ ارتقاء

عقیدہ وحدت الوجود:

علامہ اقبال فرماتے ہیں:۔

''بایں ہمہ یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اسلامی فلسفہ کی تاریخ میں شعور انسانی کی وحدت کا مسئلہ جسے گویا اس کی شخصیت کا مرکزی نقطہ تصور کرنا چاہیے کبھی زیر بحث نہیں آیا۔ متکلمین کا خیال تھا کہ روح یا تو مادے کی ایک بڑی ہی لطیف شکل ہے یا محض عرض اور اس لیے جسم کے ساتھ فنا ہو جاتی ہے۔ لہٰذا قیامت کے دن اس کی پھر سے تخلیق ہوگی۔ حکمائے اسلام یونانی فلسفہ کے زیر اثر تھے۔ رہے دوسرے مذاہب فکر سو اس سلسلے میں قابل غور بات یہ ہے کہ جیسے جیسے دنیائے اسلام میں وسعت پیدا ہوئی اس میں مختلف العقیدہ ملتیں شامل ہوتی گئیں۔ مثلاً یہودی، زرتشتی، نسطوری (عیسائی) لیکن ان ملتوں کے ذہنی مطمح نظر کی تشکیل میں چونکہ ایک ایسی ثقافت نے حصہ لیا تھا جو اپنی ابتداء اور نشو ونما دونوں لحاظ سے مجوسی الاصل (عجمی) تھی اور جس نے قرن ہا قرن سے وسطی اور مغربی ایشیاء پر غلبہ حاصل کر رکھا تھا لہٰذا اس کی روح پر دوئی ہی دوئی (ثنویت) چھائی ہوئی تھی۔ چنانچہ اس دوئی کی تھوڑی

Marfat.com

بہت جھلک ہمیں الٰہیات اسلامیہ میں بھی نظر آ جاتی ہے۔ یہ صرف تصوف تھا جس نے یہ کوشش کی کہ عبادات اور ریاضت کے ذریعے واردات باطن کی وحدت تک پہنچے۔ قرآن پاک کے نزدیک یہ واردات علم کا ایک سرچشمہ ہیں۔ جن میں ہمیں دو اور یعنی عالم تاریخ اور عالم فطرت کا اضافہ کر لینا چاہیے۔ اب اگر صرف مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ان واردات کا نشو و نما حلاج کے نعرۂ ''انا الحق'' میں اپنے معراج کمال کو پہنچ گیا اور گو حلاج کے معاصرین علی ھذا متبعین نے اس کی تعبیر وحدت الوجود کے رنگ میں کی لیکن مشہور فرانسیسی مستشرق موسیو ماسینیو (M.Massignon)'' نے حلاج کی تحریروں کے جو اجزاء حال ہی میں شائع کیے ہیں ان سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس شہید صوفی نے انا الحق کہا تو اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اسے ذات الٰہیہ کے وراء الوراء ہونے سے انکار تھا۔ لہٰذا ہمیں اس کی تعبیر اس طرح کرنی چاہیے جیسے قطرہ دریا میں واصل ہو گیا۔ حالانکہ یہ اس امر کا ادراک بلکہ علی الاعلان اظہار تھا کہ خودی ایک حقیقت ہے۔ جو اگر ایک عمیق اور پختہ تر شخصیت حاصل کر لی جائے تو ثبات و استحکام حاصل کر سکتی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو کچھ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے حلاج ان الفاظ میں متکلمین کو دعوت مبارزت دے رہا تھا۔ (اس لیے کہ وہ خودی کے منکر تھے)''

(مذکورہ بالا اقتباس ''تشکیل جدید'' کے صفحہ نمبر 143 سے لیا گیا ہے۔ علامہ اقبالؒ یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں کہ منصور حلاج وحدت الوجود کے قائل تھے۔ حالانکہ خود اپنے مقالہ میں علامہ نے کئی سال قبل منصور حلاج کو وحدت الوجودیوں کا سردار بتایا ہے۔ جبکہ اہل وحدت الوجود کا یہ کہنا ہے کہ منصور حلاج ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے اسلامی تصوف میں وحدت الوجود کو متعارف کروایا۔ وحدت الوجود کیا ہے؟ یہ کہ قطرہ دریا میں واصل ہو جاتا ہے، یہ کہ آتما، پرماتما سے جا ملتی ہے یہ کہ کائنات میں کائنات کی ہر چیز خود خدا ہے۔ یہ کہ متناھی خودی لامتناھی خودی میں جذب ہو کر اپنی ہستی فنا کر دیتی ہے۔ ''مرزا اسد اللہ خان غالب'' اردو ادب میں وحدت الوجود کے سب سے بڑے پرچارک ہیں۔ ان کے اشعار میں واضح طور پر قطرے کے دریا میں گم ہو جانے یا آتما کے پرماتما سے جا ملنے کا عقیدہ دکھائی دیتا ہے وہ اکثر اس طرح کے سوال کرتے ہیں۔)

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

غالب تو وحدت الوجودی ادب کا شاید ہندوستانی اظہار ہے۔ منصور حلاج سے لے کر آج تک مسلمانوں میں وحدت الوجود کا تصور ہمیشہ رہا۔ علمائے دیو بند میں ''مولانا اشرف علی تھانوی'' اور ان کے متبعین پکے وحدت الوجودی ہیں۔ پاکستان میں علمائے بریلوی اس عقیدہ کے سب سے بڑے ماننے والے ہیں اور اہل حدیث سب سے بڑے مخالف۔ عامۃ الناس یا عام مذہبی پیشواؤں میں وحدت الوجود کا نظریہ تیزی کے ساتھ مقبول ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ ایک ایسا نظریہ ہے جو فی الحقیقت منصور حلاج سے شروع نہیں ہوا بلکہ بقول اقبالؒ قرن ہا قرن سے ایران و ہندوستان میں

موجود تھا۔ مذکورہ بالا اقتباس میں علامہ اقبالؒ نے منصور حلاج کو اس الزام سے بری قرار دیا ہے کہ وہ وحدت الوجود کے ماننے والے تھے۔ آتما ایک دن پرماتما سے جا ملے گی یہ آتما اس شریر (بدن) میں قید ہے، اسے مکت ہونا ہے۔ اسے یہ بدن چھوڑنے کے بعد پرماتما (خدا) سے وصال کرنا ہے۔ بالکل ویسے جیسے قطرہ دریا سے جا ملتا ہے۔ ہم سب خدا کی روح ہیں۔ لیکن خدا سے جدا ہو کر بھٹک رہے ہیں۔ ہم اپنے اس بدن (شریر) کو جس قدر اذیت پہنچائیں گے اور دنیاوی معاملات سے جس قدر بے اعتنائی برتیں گے اس قدر ہی ہماری آتما (روح) پرماتما کے نزدیک ہوتی جائے گی۔ یہ ہے وحدت الوجودی طرزِ فکر۔ علامہ اقبالؒ نظریہ وحدت الوجود کے مقابل مولانا روم کا نظریہ پیش کرتے ہیں جو خود اگرچہ وحدت الوجودی تھے لیکن اُن کے لیے وحدت الوجود محض ایک سنگ میل تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مولانا رومؒ وحدتِ ارتقائے وجود کے قائل تھے۔ اُن کا نظریہ...... وجود انسانی کو انحطاط کا درس دینے کی بجائے طبق در طبق آگے بڑھنے کا درس دیتا ہے۔ تشکیل جدید کے صفحہ نمبر 115 پر علامہ اقبالؒ پھر فرماتے ہیں:۔

> ''قرآن مجید نے بار بار تقدیر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لہٰذا ہمیں تقدیر کے مسئلے پر غور کر لینا چاہیے۔ بالخصوص اس لیے کہ ''زوال مغرب'' (Decline of the west) میں اشپینگلر نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اسلام بھی خودی کی نفی کا خواہشمند ہے۔ حالانکہ تقدیر کے بارے میں قرآن کا جو تصور ہے اس کی تشریح ہم اس سے پہلے کر آئے ہیں۔ پھر جیسا کہ اشپینگلر نے خود بھی لکھا ہے...... دنیا سے یگانگت پیدا کرنے کے دو

Marfat.com

ہی طریق ہیں۔ ایک عقلی، دوسرا جس کے لیے کوئی مناسب لفظ نہیں ملتا، اس لیے حیاتی۔ عقلی طریق کے ماتحت تو ہم کائنات کا ادراک اس طرح کرتے ہیں کہ وہ علت و معلول کا ایک کڑا نظام ہے۔ حیاتی طریق کا تقاضا البتہ یہ ہے کہ بحیثیت ایک ایسے ''کل'' کے جو زمان متسلسل کی تخلیق اس لیے کر رہا ہے کہ اپنے اندرونی تنوع کا اظہار کر سکے۔ ہم زندگی کو بطور ''شئے ناگزیر'' چپ چاپ قبول کر لیں۔ لیکن پھر کائنات کی طرف حیاتی طریق پر ہی قدم بڑھانا وہ چیز ہے جسے قرآن پاک نے ایمان سے تعبیر کیا ہے۔ لہٰذا ایمان سے مطلب یہ نہیں کہ ہم چند ایک قضیوں کو بے چون و چرا صحیح مان لیں۔ برعکس اس کے یہ تیقن اور اعتماد کی وہ کیفیت ہے جس کے لیے انسان کو بڑی نادر واردات اور تجربات سے گزرنا پڑتا ہے اور جس کی اہل صرف وہی شخصیتیں ہو سکتی ہیں جو نہایت درجہ مضبوط ہوں اور اس قسم کی تقدیر پرستی کو جو اس صورت میں ناگزیر ہے برداشت کرنے کی اہل۔ کہا جاتا ہے نپولین کا قول تھا.......... میں شے ہوں شخص نہیں۔ چنانچہ یہ بھی ایک طریق ہے واردات اتحاد کے اظہار کا۔ (اپنی ذات اور وجود کے حقیقی سرچشمے سے)۔ عالم اسلام نے بھی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے مطابق کہ انسان اپنے اندر اخلاق الہیہ پیدا کرے.......... ''تخلقوا باخلاق اللہ'' مذہبی مشاہدات اور واردات کی طرف قدم بڑھایا تو جیسا کہ

Marfat.com

مطالعے سے پتا چلتا ہے اس تقرب و اتصال کی ترجمانی کچھ اسی قسم کے اقوال میں ہوتی رہی۔ مثلاً ''انا الحق''.......... یا ''انا الدھر'' (اشارہ ہے مشہور حدیث، لا تسبو الدھر کی طرف) .... ''میں ہوں قرآن ناطق'' (حضرت علیؓ) .... سبحانی ما اعظم شانی (میں پاک ہوں کتنی اونچی میری شان ہے۔ قول بایزیدؒ'') .... لہٰذا اسلامی تصوف کے اعلیٰ مراتب میں اتحاد و تقرب سے یہ مقصود نہیں تھا کہ متناہی خودی لا متناہی خودی میں جذب ہو کر اپنی ہستی فناء کر دے۔ بلکہ یہ کہ لا متناہی خودی متناھی خودی کی آغوش محبت میں آ جائے۔ مولانا رومؒ نے کیا خوب کہا ہے..........

علم حق در علم صوفی گم شود
ایں سخن کے باور مردم شود

لہٰذا اس تقدیر پرستی کا تقاضا نفی ذات نہیں۔ جیسا کہ اشپنگلر کا خیال ہے.......... یہ زندگی وہ بے پایاں طاقت و قدرت ہے جو کسی مزاحمت کو تسلیم نہیں کرتی اور جس کی بدولت انسان اس وقت بھی جب ہر طرف سے گولیاں برس رہی ہوں باطمینان ادائے صلوۃ میں مصروف رہتا ہے۔''

دراصل وحدت الوجود کا نظریہ ہمیشہ ایک خاص قسم کی ذہنی سطح تک محدود رہا۔ لیکن یہاں یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ حقیقت کا علم پانے کے لیے ذہنی سطحات کی درجہ بندی لازمی ہے۔ حقیقت کا علم معرفت کہلاتا ہے۔ ذہنی سطح چاہے جس قدر ہی ابتدائی کیوں نہ

Marfat.com

ہو.......... معرفت حق کی لذتوں میں برابر کی شریک ہوتی ہے۔ وحدت الوجود کے ماننے والوں میں ایک عام نعرہ مشہور ہے:۔

''ہمہ اوست''

''سب کچھ وہی ہے۔''

اس کے مقابلے میں یا بالفاظ دیگر اس نظریہ کی اصلاح کے طور پر وحدت الشہود کا نظریہ پایا جاتا ہے اور ان کا نعرہ ہے ہمہ از اوست، سب کچھ اسی سے ہے۔ میں ذاتی طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ اہل معرفت کے لیے یہ دونوں نعرے غیر اسلامی ہیں۔ جب ہمیں معرفت حق کی خاطر خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مستند نعرہ دے دیا ہے تو پھر ہمیں کسی اور تشریح کو اپنانے کی کیا ضرورت ہے۔ مسلمانوں کا نعرہ ہے لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ۔ ہم کلمہ طیبہ کا فارسی میں ترجمہ کریں تو یوں بنتا ہے۔

''ہمہ نیست فقط اوست''

(الف) یہ سب کچھ' کچھ نہیں صرف وہی ہے۔''

(ب) کوئی الہ نہیں سوائے اللہ کے۔

ہم ذرا سی بصیرت استعمال کریں تو ہمیں کلمہ طیبہ میں ہمہ اوست اور ہمہ از اوست کے منطقی قضیے کا سب سے بہترین حل مل جاتا ہے۔

''ہمہ نیست فقط اوست''

یہ ہے لا الہ الا اللہ۔ ہمیں معرفت حق حاصل کرنے کے لیے پہلے ہر چیز کی نفی کا راستہ اپنانے کی ہدایت تو کی گئی ہے لیکن اس میں فوراً ہی اثبات کا عنصر شامل ہو جاتا ہے۔ کلمہ طیبہ گویا موت سے زندگی کی طرف لے جانے والی کلید ہے نہ کہ زندگی سے موت کی طرف، جیسا کہ اب تک ہمیں درس دیا جاتا رہا ہے۔ کلمہ طیبہ کے پہلے حصے میں

Marfat.com

لا الہ یا ہمہ نیست فی الحقیقت ایک احساس ہے جسے اپنے دل و دماغ میں پیدا کرنا ہم پر لازم ہے۔ جب تک ہم زمینی پیوستگی (Earth Rootedness) سے چھٹکارا حاصل نہیں کر لیتے ہمیں دائمی زندگی نہیں مل سکتی۔ ارضی پیوستگی ہمارے ہر ہر اقرار کی نشاندہی کرتی ہے۔ حالانکہ ہمیں ہر ہر مقام پر انکار کرنا تھا.......... نہیں نہیں.......... کہنا تھا۔ لیکن ہم نے مال اولاد، گھربار، کھیت کھلیان، کاروبار اور دنیاوی زندگی کی ہر چیز کو اپنے لیے اہم جانا۔ گویا ہم نے ''لا'' نہیں کہا۔ گویا ہم نے ان بتوں کا انکار نہیں کیا۔ ہمارے لیے آگے بڑھنے کا کوئی راستہ نہیں جب تک ہم اپنے سفلی معاملات سے یکسر چھٹکارا نہیں پا لیتے۔ یہ تو بالکل ایسا ہے جیسے ہم نے خود کو ان گنت رسیوں سے باندھ رکھا ہو اور ہمارے سامنے، آگے بڑھنے کا راستہ کھلا ہو لیکن ہم اپنی رسیوں کی وجہ سے آگے نہ بڑھ پاتے ہوں۔ زندگی سفر ہے اور ہمیں آگے بڑھنا ہے۔ بقول شیخ عبدالقادر جیلانیؒ:۔

''مومن مسافر ہے، مسافر زادِ راہ لیتا ہے۔ کافر ٹھکانہ کرتا ہے۔''

ہم نے خود کو باندھ رکھا ہے۔ ہمہ اوست کہنے سے یا ہمہ از اوست کا اقرار کرنے سے ہماری قلبی تربیت اس طرح سے نہیں ہو پائے گی جس طرح.......... ''ہمہ''.......... کا انکار کرنے سے ہو پائے گی۔ کلمہ طیبہ ہمیں ہر بت سے انکار سکھاتا ہے اقرار تو اس سے اگلے مرحلے میں ہے۔ ہمیں اپنی رسیاں کاٹنی ہوں گی۔ اولاد کی رسی، مال کی رسی، گھربار کی رسی، کھیت کھلیان کی رسی۔

لیکن ان رسیوں کو کاٹنے سے کیا مراد ہے؟ کیا عملاً دنیا کو ترک کر دیا جائے۔ نہیں قطعاً یہ مراد نہیں! بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ہم ذہنی طور پر ان تمام بتوں کا بوجھ محسوس کرنا ترک کر دیں۔ ہم بے پرواہ ہو جائیں۔ عملی زندگی میں بے شک ہر شے کو اپنے

تصرف میں لائیں کیونکہ ہر شے ہمارے لیے ہے۔ لیکن ایسا نہ ہو کہ ہم ان چیزوں کے محتاج ہو کر رہ جائیں۔ ہم اتنے بے پرواہ ہو جائیں کہ سونے چاندی کے ڈھیر ہمارے قدموں میں رُلنے لگیں۔ ہمیں ابراہیمؑ کی طرح اپنی اولاد کے بت پر چھری چلانی ہوگی۔ ہماری نسل ہمیں نہیں بچائے گی۔ ہمیں، ہمیشہ زندہ رہنا ہے تو ہمیں خاندان کا بت گرانا ہوگا۔ کچھ نہیں! کھیت کھلیان کچھ نہیں!......... مال مویشی کچھ نہیں! سونا چاندی کچھ نہیں! ہمیں خود کو ان سب چیزوں سے اہم جاننا ہوگا۔ یہ سب چیزیں، یہ ساری کائنات، ہمارے واسطے مسخر کی گئی ہے۔ کائنات کی ہر قوت ہمارے سامنے سجدہ ریز ہے۔ ہمیں ملائکہ نے سجدہ کیا ہے۔ پھر ہم کیوں ان چیزوں کی پرستش کریں۔ ان چیزوں کے خدا تو ہم خود ہیں۔ پھر ہم دنیا کی ان چیزوں کے سامنے سر کیوں جھکائیں۔ ماضی میں بت پرست قومیں جن دیوتاؤں کی پوجا کرتی تھیں اسلام نے ان دیوتاؤں کو خود انسان کے سامنے سجدہ ریز بنایا۔ مثلاً وہ بارش کے دیوتا کی پوجا کرتے تھے لیکن اسلام نے کہا کہ بارش کا دیوتا نہیں بلکہ فرشتہ ہے، جس کا نام ''میکائیل'' ہے اور جس نے انسان کے سامنے سجدہ کیا ہے۔ غیر مسلم دیوتا کے سامنے جھکتے ہیں لیکن یاد رہے کہ دیوتا مسلمان کے سامنے جھکتا ہے۔ زمین پر پیدا ہونے والی چیزیں ہمارے استعمال کے لیے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ ہم انہیں خدا بنالیں۔ ہم ان چیزوں کو ہمہ اوست کہہ کر اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں۔ یہ چیزیں کچھ بھی نہیں۔ یہ چیزیں ہمہ نیست ہیں۔ ہمارے ذہن پر دنیاوی اشیاء کی کوئی پریشانی نہیں ہونی چاہیے۔ اگر ہم کسی پریشانی (Depression) کو اپنے دل میں جگہ دیتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ ہماری کمر میں بندھی رسیاں تن جاتی ہیں اور دائمی زندگی کے راستے پر ہم رتی بھر چلنے کے بعد رک جاتے ہیں۔

Marfat.com

گزشتہ صفحات میں ہم نے علامہ اقبالؒ کے مقالہ میں سے تصوف کی تاریخ پر ایک مضمون پیش کیا ہے۔ جس سے ہمیں معلوم ہوا کہ وحدت الوجود کا آغاز کب اور کیسے ہوا۔ اس کے آغاز میں ہی علامہ اقبالؒ نے ہمیں بتایا کہ مغربی مفکرین ایرانی تصوف کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ مثلاً وان کریمر اور ڈوزی نے ایرانی تصوف کا ماخذ ہندی ویدانت کو ٹھہرایا ہے۔ نکلسن .... اس کو نو فلاطونیت سے ماخوذ سمجھتا ہے۔ لیکن پروفیسر براؤن نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ غیر جذبی سامی (عربی) مذہب کے خلاف ایک آریائی ردعمل ہے۔ علامہ اقبالؒ کو ان لوگوں سے اختلاف ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ کسی عظیم واقعہ کی علت کوئی ایک نہیں ہوتی۔ جدید نظریہ ارتقاء سے بھی ہمیں یہی سبق ملتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے بقول یہ کہنا کہ بربروں کے حملوں نے سلطنت روما کو برباد کر دیا تھا، دنیا کی کسی منطق کی رو سے درست نہیں۔ آپ نے صحیح صحیح نشاندہی کی ہے کہ اسلامی دنیا میں تصوف کب داخل ہوا۔ لیکن یہاں تصوف کا لفظ اپنے آفاقی مفہوم کی بجائے محض عجمی تصوف کی حد تک استعمال کیا گیا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے بتایا کہ آٹھویں صدی کے اختتام اور نویں صدی کے نصف اول میں ایرانی تصوف کا آغاز ہوا۔ اور اگر ہم اسے ایرانی + اسلامی تصوف بھی کہہ دیں تو کوئی خاص حرج نہ ہوگا۔ یہ تقریباً ساٹھ ستر سال کا عرصہ بنتا ہے۔ بظاہر یہ اتنا مختصر عرصہ ہے کہ ایک عام انسان بھی اس عرصے میں زندہ رہ سکتا ہے۔ لیکن علامہ اقبالؒ کا کہنا ہے کہ خالص اسلامی تصورِ خدا...... میں آریائی تہذیب وتمدن اور فلسفے کا تمام تر اثر انہی ستر سالوں میں اسلامی ادبیات کا حصہ بنا۔

جب ہم اس زمانہ کی تاریخ دیکھتے ہیں تو ہمیں یہ ایک سیاسی بے چینی کا دور نظر آتا ہے۔ آٹھویں صدی کے نصف آخر میں سلطنت بنوامیہ کا تختہ الٹ دیا گیا۔ یہ 749ء کا

واقعہ ہے۔ انہی ایام میں زنادقہ نے سر اٹھایا۔ ایرانی ملحدین نے بغاوت کی۔ (سندیہ 755ء تا 756ء، اوستادس 777ء تا 778ء) اور پھر نویں صدی کے آغاز میں ہارون الرشید کے بیٹے مامون اور امین سیاسی اقتدار کے لیے ایک زبردست جنگ میں مصروف ہو گئے۔ 816ء تا 838ء .... بابک کی مسلسل بغاوت کے دن ہیں جن کی وجہ سے اسلامی ادبیات کو بے پناہ صدمہ اٹھانا پڑا۔ اسی طرح طاہریہ، صفاریہ، سامانیہ قبائل کا مناقشہ شروع ہو گیا۔ یہاں پہنچ کر علامہ اقبال لکھتے ہیں:۔

> ''غرض کہ یہ اور اسی قسم کے دیگر حالات نے ایسے لوگوں کو جن کی سیرت زاہدانہ واقع ہوئی تھی اس مسلسل بے چینی کے منظر سے ہٹا کر ایک پرسکون مراقبہ کی زندگی کی طرف رجوع کر دیا۔ ان ابتدائی مسلمان مرتاضین کی حیات وفکر کی سامی نوعیت کے ساتھ ساتھ وحدت الوجود کا ایک وسیع نظریہ بتدریج وجود میں آ گیا۔ جس پر کم وبیش آریائی رنگ چڑھا ہوا تھا۔ اس نظریہ کا ارتقاء ایران کی سیاسی آزادی کے نشوونما کے متوازی تھا۔''

مذکورہ بالا تصریح سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ عقیدہ وحدت الوجود اسلام میں کب داخل ہوا۔ علامہ اقبالؒ نے بڑی وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ سامی اقوام یعنی عربوں کے ہاں نجات کا جو اصول تھا اسے ان الفاظ میں بیان کیا جاتا تھا:۔

> ''اپنے ارادے کو متبدل کر دو۔''

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرون اولیٰ کے عرب یعنی سامی ارادے کو روح انسانی کا جوہر خیال کرتے تھے۔ ان کے برخلاف ہندی ویدانت یہ تعلیم دیتی ہے کہ دنیا میں آلام ومصائب کی وجہ، ہمارا غلط انداز فکر ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنی عقل کو متبدل کرنا

Marfat.com

ہوگا۔ ویدانتیوں کے نظریہ نجات کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے:۔

"اپنی فکر کو متبدل کر دو۔"

سامیوں اور ویدانتیوں کے نظریات الگ الگ تھے۔ ایک عمل کا قائل تھا تو دوسرا محض سوچنے کا۔ یہ دونوں الگ الگ انتہائیں تھیں۔ وسطی عہد کے صوفیاء جنہوں نے وحدت الوجود کی بنیاد ڈالی وہ ان دونوں نظریات سے بڑھ کر ایک تیسرا نظریہ پیش کرتے تھے اور وہ مختصر الفاظ میں یوں تھا:۔

"احساس کو متبدل کر دو۔"

یا پھر یوں کہنا چاہیے کہ احساس کی مکمل تبدیلی کے ذریعے عقل و ارادہ دونوں کو متبدل کر دو۔ کیونکہ عقل و ارادہ دونوں صورتیں ہیں...... احساس کی۔

تصوف میں نظریہ وحدت الوجود کے ساتھ ہی احساس کی تبدیلی پر کام کیا جانے لگا۔ جتنا بڑا نابغہ اس نظریہ سے منسلک ہوا اس کے حق میں اتنے ہی زیادہ جواز پیش کیے گئے۔

یہاں از راہ معلومات ایک دلچسپ بات تحریر کرتا چلوں۔ اپنے اس مقالہ میں علامہ اقبالؒ نے "مولانا رومؒ" کو بھی وحدت الوجودیوں کی فہرست میں شامل کیا ہے۔ مولانا رومؒ...... کو مثنوی کے بعض مضامین کی وجہ سے اہل وحدت الوجود کا امام مانا جاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ بھی اول اول یہی سمجھتے رہے۔ چنانچہ اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ میں علامہؒ نے یہی رویہ اختیار کیا۔ دراصل صحیح قسم کی روحانی تربیت کے دوران ایک مقام ایسا آتا ہے کہ وحدت الوجود کو مانے بغیر گزارا نہیں ہوتا لیکن اسی مقام پر جسے مقام فنا بھی کہا جاتا ہے رُک جانا اہل نظر کے نزدیک جرم ہے۔ مولانا روم وحدت الوجود سے بہت آگے نکل چکے تھے۔ اب ان کی نظر لولاک سے نیچے کہیں رُکتی ہی نہ تھی۔ چنانچہ

Marfat.com

انہوں نے ''نظریۂ ارتقائے وجود'' پیش کر کے صحیح معنوں میں وحدت الوجود سے اگلا قدم اُٹھایا۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبالؒ نے مولانا روم کو پہلے ''وجودی'' کہا اور سمجھا...... جبکہ بعد ازاں مثنوی کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد علامہ اقبالؒ نے مولانا رومؒ کو نہ صرف نظریہ ارتقائے خودی کا بانی مانا بلکہ اپنا پیر و مرشد کہنا شروع کر دیا۔

بہر حال ہم بات کر رہے تھے ایک طرف سامی نظریہ تھا اور دوسری طرف ہندو ویدانت کا خشک نظام فکر۔ لیکن ایران میں اسلام کے داخل ہونے کے بعد ایران کے نابغہ روزگار انسانوں کے ذہن میں نہ تو ویدانت کا خشک نظام فکر باقی رہا اور نہ ہی سامی اقوام کا غیر جذبی (خشک) مذہب۔ ایران نے ایک تیسری راہ اپنائی اور اس راہ کا نام تھا تصوف۔

ایک عجیب چیز جو ہمیں جغرافیہ کا مطالعہ کرنے سے پتا چلتی ہے اس کا ذکر بھی علامہ نے بڑے دلچسپ الفاظ میں کیا۔ علامہؒ کے الفاظ یہ ہیں:۔

> ''تصوف محبت کے اعلیٰ کلیے کے تحت سامی اور آریائی اصولوں کو متحد کرتا ہے۔ ایک طرف تو وہ بدھ مت کے تصور نروان (فناء) کو اپنے اندر جذب کر کے اس تصور کی روشنی میں ایک مابعد الطبیعی نظام تعمیر کرتا ہے اور دوسری طرف وہ اسلام سے بے تعلق نہیں ہونا چاہتا اور کائنات سے متعلق اپنے نقطہ نظر کا جواز قرآن سے پیش کرتا ہے وہ اپنے مقام پیدائش کے جغرافیائی موقع محل کی طرح خود بھی آریائی و سامی مذاہب کے اثرات کے وسط میں واقع ہے اور دونوں طرف سے، وہ تصورات کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے...... لہٰذا یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ تصوف کی قوت کا

راز اس بات میں پوشیدہ ہے کہ فطرت انسانی کے متعلق اس کا
نقطہ نظر بہت ہی جامع اور مکمل ہے۔

وحدت الوجود ایک ایسا نظریہ ہے جسے اسلامی تاریخ میں صوفیاء کی ایک بہت بڑی تعداد نے اختیار کیے رکھا۔ حتیٰ کہ آج تک بھی اس میدان کے مسافر اسے اختیار کیے ہوئے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے پوری طرح جائزہ لیا اور دیکھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فی الواقعہ حضرت علیؓ یا حضرت ابوبکر صدیقؓ کو کوئی باطنی علم نہیں سکھایا تھا۔ بہرحال صوفیاء کا یہ دعویٰ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی تعلیم کے علاوہ ایک باطنی تعلیم بھی دی جسے حکمت کہتے ہیں اور صوفیاء اپنے دعوے کی تائید میں مندرجہ ذیل آیت پیش کرتے ہیں:۔

کما ارسلنا فیکم رسولاً منکم یتلوا علیکم ایاتنا ویزکیکم
ویعلمکم الکتاب و الحکمۃ و یعلمکم مالم تکونوا تعلمون٥

صوفیاء کا یہ خیال ہے کہ حکمت کا لفظ جو اس طرح کی آیات میں استعمال ہوا ہے وہ ایسی چیز ہے جس کو قرآن کی تعلیم میں بیان نہیں کیا گیا۔ صوفیا کے بقول خود پیغمبر علیہ السلام نے بارہا فرمایا ہے کہ قرآن کی تعلیم آپ سے پہلے کے پیغمبروں نے بھی دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر اس لفظ ''حکمت'' کے عمل کو قرآن کریم میں بیان کر دیا گیا ہے۔ تو اس آیت میں حکمت کا جو لفظ آیا ہے حشو و زوائد ہوگا۔ علامہ اقبالؒ کے خیال میں یہ اچھی طرح سے ثابت کیا جا سکتا ہے کہ قرآن حکیم اور صحیح احادیث میں تصوف کی طرف اشارات موجود ہیں۔ علامہ اقبال عربوں کو سامی قوم کہہ کر پکارتے ہیں اور تاریخ شاہد ہے کہ سامی قوم عملی (پریکٹیکل) تھی اور تفکر میں ان کا ہاتھ تنگ تھا۔ آدم علیہ السلام سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام سامی اقوام میں انبیاء تو متواتر گزرے

Marfat.com

لیکن فلسفی کوئی نہ ہوا۔ چنانچہ قرآن کریم میں موجود تصوف کے اشارات سامیوں کی عملی ذہانت کی وجہ سے ویسے بارآور نہ ہو سکے جیسے ایرانیوں نے انہیں سمجھا اور نشو ونما دی۔ یہاں تصوف کے لیے حالات موزوں تھے۔ چنانچہ پہلی بار دنیا میں ویدانت اور ثنویت سے ہٹ کر ایک الگ نظریہ وجود میں آیا اور یہ نظریہ تھا وحدت الوجود۔ ایران میں نور کے مقابلے میں ظلمت اور ظلمت کے مقابلے میں نور بالفاظ دیگر خیر اور شر کے دو الگ الگ خدا تھے۔ اسے ثنویت یا دوئی کہا جاتا ہے۔ لیکن وحدت الوجود کی تعمیر توحید کے گارے سے ہوئی چنانچہ یہ ایک مکمل مابعدالطبیعی نظام کے طور پر جلوہ گر ہوا۔ قرآن کریم نے ایک مسلمان کی مندرجہ ذیل تعریف کی ہے۔

"الذین یومنون بالغیب ویقیمون الصلوۃ و مما رزقنا ھم ینفقون○

(البقرہ آیت نمبر 2)

ترجمہ:۔ وہ لوگ ہیں جو ایمان لاتے ہیں غیب پر اور قائم کرتے ہیں صلوۃ اور جو رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔"

سوال یہ ہے کہ............ یہ............ "غیب" کیا ہے؟ اسی غیب کے بارے میں غور وفکر کرنے کی عادت عجمی مزاج کا پرانا خاصہ تھی۔ جبکہ عربی مزاج دوسرا تھا۔ جو غیب سے متعلق کیوں اور کیسے............ جیسے سوالات کرنے کے زیادہ تر عادی نہ تھے۔ غیب کیا ہے؟ قرآن کریم نے خود اس بات کا جواب دیا ہے:۔

"وفی الارض ایات للموقنین ط وفی انفسکم افلاتبصرون○

(سورۃ الذاریات۔ آیت 20,21)

ترجمہ:۔ اور یقین کرنے والوں کے لیے زمین میں آیات ہیں اور خود تمہارے نفسوں میں بھی۔ تو کیا تم دیکھتے نہیں۔"

Marfat.com

گویا غیب کا علم آیات میں ہے۔ وہ آیات جو ہمارے نفسوں اور ارض وسموات میں ہیں کیونکہ ایک اور جگہ ارشاد ہے......... سنریھم ایا تنافی الافاق و فی انفسھم .... ہم نے بیان کر دی ہیں اپنی آیات آفاق میں اور ان کے نفسوں میں۔ ہمارے نفسوں میں آیات کہاں موجود ہیں۔ تصوف کا ایک طالب علم تمام عمر اسی سوال کا جواب تلاش کرنے میں صرف کرتا ہے۔ صوفیاء کے بقول قرآن کریم نے ان آیات کو تلاش کرنے کے مزید واضح اشارات بھی دیے ہیں۔ مثلاً۔

"ونحن اقرب الیه من حبل الورید. (سورۃ ق۔آیت 16)

ترجمہ: اور ہم اس کی رگ جان سے بھی، اس سے زیادہ قریب ہیں۔"

ایک صوفی جب غیب کی تلاش میں اپنی رگ جاں کو ٹٹولتا ہے تا کہ خدا کو قریب سے قریب دیکھ سکے تو تڑپ اٹھتا ہے اور کہتا ہے:

اے دوست! ذرا اور قریب رگِ جاں ہو
کیا جانئے کب تک شبِ ہجراں کا دھواں ہو

اور پھر مسلسل مراقبہ کے بعد صوفی یہ جاننے کے قابل ہو جاتا ہے کہ غیب کیا ہے؟ تب اسے اپنے قلب سے ایک ہی آواز بار بار سنائی دینے لگتی ہے۔

"الله نور السمٰوٰت والارض. (سورۃ نور۔آیت 35)

ترجمہ:۔ اللہ ارض وسموات کا نور ہے۔"

چنانچہ صوفی پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ غیب کی ماہیت نور ہے۔ وہ کائنات کی ہر چیز کو منور دیکھتا ہے۔ تو گویا اسے ہر چیز میں اپنا خدا دکھائی دینے لگتا ہے اور یوں وہ بالآخر وحدت الوجود کے نظریے تک پہنچتا ہے۔

وحدت الوجودیوں کے ہاں "آیہ نور" بڑی مقبول ہے۔

Marfat.com

"اللہ نور السموات والارض۔"

اور نور سے منور ہونے والی پوری کائنات خدا کا چہرہ ہے۔ اس دوران ایک وحدت الوجودی، اس آیت پر بھی نظر رکھتا ہے۔

"لیس کمثلہ شیئی۔

ترجمہ:۔ "اس کی مثال کسی شے سے نہیں دی جا سکتی۔"

چنانچہ وحدت الوجودی کو یقین ہو جاتا ہے کہ صرف نور ہی خدا ہے۔ کیونکہ نور کسی شے کی مثال نہیں اور نہ ہی نور کی مثال کوئی شے ہے۔ آخر کار وحدت الوجودی ایک سیدھے راستے سے چلتے ہوئے اچانک ایک غلط منزل پر جا پہنچتا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص سیدھے راستے سے چلے لیکن غلط منزل پر جا پہنچے؟ یہ اسی وقت ہوتا ہے جب التباس پیدا ہونے لگے۔ سیدھے راستوں میں التباس۔ آپ نے خود دیکھا کہ صوفی نور کی شعاع پر چلتا ہوا خدا تک تو آ پہنچا۔ لیکن ایک طرح سے اس نے پھر سے قدیم آریائی نظریہ ثنویت یا ہندو ویدانت کی تجدید کر دی۔ وہ کیسے؟ ملاحظہ ہو۔

قدیم ثنوی نظریہ یہ تھا کہ حقیقت نور ہے۔ ہر وہ چیز جو منور ہے، نور کا حصہ ہے۔ بقایا رہی ہر وہ چیز جو منور نہیں سو وہ ظلمت کا حصہ ہے۔ نور ظلمت کے ہوتے ہوئے نمو پاتا ہے۔ چنانچہ نور اور ظلمت یعنی روشنی اور سایہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ قدیم ثنویت نے نور کو "یزدان" اور ظلمت کو "درج اہرمن" کہا جاتا تھا۔ اس نام کے دو الگ الگ خدا پوجے جاتے تھے۔

"شیخ الاشراق" مقتول شہاب الدین سہروردی شہیدؒ، مسلمان صوفی مفکرین میں بے حد مقبول ہیں۔ ان کے الفاظ میں منور اجسام نور کا حصہ ہیں اور باقی تمام تاریکی کا۔ نور اولیٰ نور مجرد ہے اور نور مرئی نور عارضی۔ نور عارضی نور مجرد سے نکلتا ہے۔ نور مجرد

Marfat.com

کے ظہور کا مقام ہے روح اور نور عارضی کے ظہور کا مقام ہے یہ کائنات۔ مادہ نور کے سامنے آ کر منور ہو جاتا ہے ورنہ مادہ ظلمت کا حصہ ہے۔ چنانچہ کائنات کا تمام مادہ ظلمت کا حصہ ہے۔ مادہ ظلمت اور نور حقیقت۔ یہ بھی ثنویت کا پرچار ہے۔

میرے خیال میں ہم شیخ الاشراق کو آئن سٹائین کا پیش رو کہیں تو زیادہ نامناسب نہ ہوگا۔ اس پر مزید گفتگو میں اپنی کتاب ''نظریہ اضافیت'' میں کروں گا۔

چنانچہ وحدت الوجودی بھی جب نور کو سمجھنے نکلتا ہے تو ظلمت کو ایک امر واقعی کے طور پر اپنے سامنے پاتا ہے۔ یہی مقام ہے جہاں سے ثنویت جنم لیتی ہے اور حیات کی رگوں میں حرکت کی رفتار کم پڑ جاتی ہے۔ علامہ اقبالؒ کو وحدت الوجودی نظریے سے اختلاف تو ہے لیکن نفرت نہیں۔ وہ ان مسلمان صوفیاء کو بے پناہ قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جنہوں نے نظریہ وحدت الوجود پر کام کیا۔ خاص طور پر شیخ اکبر یعنی ''شیخ محی الدین ابن عربیؒ'' وغیرہ۔ لیکن مجموعی طور پر علامہ اقبالؒ نظریہ وحدت الوجود کو انسانیت کے لیے مضر سمجھتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں آپ شیخ مجدد الف ثانیؒ کے نظریہ وحدت الشہود کو زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ یہ نظریہ حیات کو فنا کا درس نہیں دیتا۔ بلکہ بقائے دائمی کا سبق دیتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے آخری عمر کے خطبات میں .... اسی ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ تحریر کیا ہے۔

> ''نفسیات حاضرہ نے مذہبی زندگی کا گویا قشر تک بھی نہیں چھوا۔ وہ اس تنوع اور گوناگونی سے بالکل بے خبر ہے جو مذہبی واردات اور مشاہدات میں پائی جاتی ہے۔ لیکن جس کا تھوڑا بہت اندازہ آپ شاید سترھویں صدی کے ایک بہت بڑے مرشد کامل شیخ احمد سرہندی کی ایک عبارت سے کر سکیں گے۔ انہوں نے اپنے

Marfat.com

زمانے کے تصوف کا تجزیہ جس بیبا کی اور تنقید و تحقیق سے کیا اس سے سلوک و عرفان کا ایک نیا طریق وضع ہوا (سلسلہ مجددیہ) ان سے پہلے جتنے بھی سلسلہ ہائے تصوف رائج ہوئے وہ یا تو وسط ایشیا اور یا سرزمین عرب سے آئے تھے۔ مگر یہ صرف اُنہی کا طریق ہے جس نے ہندوستان کی حدود سے نکل کر باہر کا رخ کیا اور جواب بھی پنجاب، افغانستان اور ایشیائی روس میں ایک بہت بڑی اور زندہ قوت کی شکل میں موجود ہے۔ البتہ جہاں تک شیخ موصوف کی عبارت کا تعلق ہے مجھے ڈر ہے میں نفسیات حاضرہ کی زبان میں اس کے حقیقی معنی شاید ہی بیان کرسکوں۔ کیونکہ اس قسم کی زبان موجود ہی نہیں۔ لیکن میرا مقصد چونکہ سردست صرف اتنا ہے کہ آپ کی توجہ مذہبی واردات کے اس تنوع اور گوناگونی کی طرف منعطف کرواؤں جن سے ایک سالک راہ کو گزرنا پڑتا ہے اور جن کی چھان بین ضروری ہے۔ لہٰذا آپ مجھے ان غیر مانوس مصطلحات کے لیے معذور سمجھیں جن کا تعلق ایک دوسری سرزمین اور ایک ایسی نفسیات مذہب سے ہے۔ جس نے تہذیب و تمدن کی ایک سرتاسر مختلف فضا میں پرورش پائی تھی اور جو وضع ہوئیں تو اس کے زیر اثر۔ لیکن جن میں سچ مچ معانی کی ایک دنیا پوشیدہ ہے۔ بہر حال اب میں شیخ موصوف کی عبارت پیش کرتا ہوں۔

ایک مرتبہ عبدالمومن نام کے ایک شخص نے مشاہدے اور تجربے کا حال ان الفاظ میں شیخ موصوف سے بیان کیا گیا۔ (عبدالمومن

Marfat.com

نے کہا)

.... میرے لیے نہ تو ارض و سما کا وجود ہے نہ عرش الٰہی کا۔ نہ جنت اور دوزخ کا۔ میں اپنے اردگرد نظر ڈالتا ہوں تو ان کو کہیں نہیں دیکھتا۔ میں جب کسی کے سامنے کھڑا ہوتا ہوں تو مجھے کوئی نظر نہیں آتا۔ بلکہ میں اپنا وجود بھی کھو دیتا ہوں۔ ذات الٰہیہ لامتناہی ہے۔ کوئی اس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ یہی منتہا ہے روحانی مشاہدات کا۔ کسی ولی کا گزر اس سے آگے نہیں ہوا...... تو اس پر شیخ نے فرمایا:

میرے سامنے جو مشاہدات بیان کیے گئے ہیں ان کا تعلق ہر لحظہ بدلتی ہوئی زندگی سے ہے۔ معلوم ہوتا ہے صاحب مشاہدات نے قلب کے لاتعداد مقامات میں سے ابھی ایک چوتھائی بھی طے نہیں کیے۔ ان مقامات کا طے کرنا ضروری ہے۔ تاکہ عالم روحانیت کے مقام اول کے مشاہدے کی تکمیل ہو جائے۔ اس مقام کے بعد اور بھی کئی مقامات ہیں۔ مثلاً روح کا مقام، سرِ خفی اور سرِ اخفیٰ کے مقامات ان سب مقامات کے، جن کو مجموعاً ہم اپنی اصطلاح میں عالم امر سے تعبیر کرتے ہیں اپنے اپنے احوال اور واردات ہیں۔ جب سالک کا گزر ان مقامات سے ہوتا ہے تو رفتہ رفتہ اس پر اسمائے الٰہیہ اور پھر صفات الٰہیہ کی تجلی ہوتی ہے۔ بالآخر ذات الٰہیہ کی۔''

آپ نے دیکھا کہ وحدت الوجودی جس مقام کے بارے میں یہ رائے رکھتا تھا

کہ یہ مقام فنا ہے اور اس سے آگے کسی ولی کا گزر ممکن نہیں۔ شیخ مجدد اس مقام کو راہ سلوک کے بے حد ابتدائی مقامات میں بھی پہلے زینے کا درجہ دیتے ہیں۔ نظریہ وحدت الوجود کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس نظریہ کی رو سے انسان کی انفرادیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ دریا میں قطرے کا واصل ہو جانا دراصل قطرے کا فنا ہو جانا ہے۔ جیسا کہ ہم نے ثابت کیا کہ نور کے مقابلے میں ظلمت کا وجود ماننا پڑتا ہے اور شیخ الاشراق کی زبان میں کائنات کا تمام مادہ ظلمت ہے۔ کیا ہمارے جسم مادی نہیں۔ اگر مادی ہیں تو ہمارے جسم بھی ظلمت کا حصہ ہیں۔ گویا ہمارے بدن روح کے قید خانے ہیں یعنی شریر۔ ہم روح تک اسی صورت پہنچ سکتے ہیں۔ جب اپنے بدن کی خواہشات کو ترک کر دیں۔ دنیا تیاگ دیں اور جنگل میں جا بیٹھیں۔ اپنے بدن کو زنجیروں سے جکڑ لیں اور کھانا پینا چھوڑ دیں۔ ہر قسم کی تکلیف' جب ہم اپنے بدن کو دیں گے تو نتیجے میں ہم اپنی روح تک پہنچیں گے۔ ہماری روح ہی نور مجرد ہے۔ جو اس دریا کا ایک قطرہ ہے جسے خدا کہتے ہیں۔ بے شک اس نظریہ کا ایک مکمل نظام فکر ہے۔ لیکن ذرا غور سے دیکھیں۔ یہ نظریہ حقیقت میں وہی قدیم ہندو ویدانت ہے جس نے ہمیشہ اپنے کردار سے انسانیت کی تاریخ کو مجروح کیا۔ علامہ اقبالؒ اپنے فکری ارتقاء کے ابتدائی عرصہ میں مولانا رومؒ اور منصور حلاج کو وحدت الوجودی ہی سمجھتے رہے۔ جیسا کہ انہوں نے اپنے مقالہ میں ذکر کیا ہے۔ لیکن بعد ازاں مثنوی اور طواسین کے مطالعہ نے آپ کو نظریۂ ارتقائے خودی کے مقام تک پہنچایا اور آپ یہ جان کر حیران رہ گئے کہ مولانا رومؒ نے انسان کے ارتقاء کا ایسا مکمل خاکہ پیش کیا جسے رہتی دنیا تک رہنما سمجھا جاتا رہے گا۔ حیات......طبق در طبق اوپر چڑھتی ہے۔ مادہ کثافت کے لحاظ سے مختلف درجات کا حامل ہے۔ جوں جوں کثافت کم ہوتی چلی جاتی ہے، توں توں آسمان ظاہر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ہمیں

Marfat.com

اپنے وجود کو کثافتوں سے پاک کر دینا چاہیے۔ ہم مٹی سے دور رہیں تا کہ ہم میں زیادہ سے زیادہ لطیف بننے کی صلاحیت پیدا ہو سکے۔ انسان کو بلندیوں کا سفر کرنا ہے اور ایسا کرنے کے لیے ہمیں ایک خاص توانائی کی ضرورت ہوگی۔ ایک ایسی توانائی جو ہمیں آسمانوں تک لے جا سکے۔ ایک ایسی توانائی جو ہمیں اس زمان و مکاں سے بہت بلند کسی اور زمان و مکاں میں لے جائے۔

مولانا رومؒ کے نظریات نے علامہ اقبالؒ کو ایک سیدھی راہ دے دی۔ یہاں تک کہ علامہ اقبالؒ دور جدید کے عین مطابق ایک ایسا نظام فکر پیش کرنے کے قابل ہو سکے جو قرآن کا دامن چھوڑے بغیر جدید سائنس کے ساتھ پوری طرح وابستہ تھا۔

یہ دیکھنے کے لیے کہ معرفت حق کا کون سا نظریہ درست ہے ہمارے لیے آخرت کے تصور کو سمجھنا ناگزیر ہے۔ نظریہ وحدت الوجود، وحدت الشہود، ویدانت، نوفلاطونیت، فلسفہ یا مذہبی مشاہدہ، سائنس یا علامہ اقبالؒ کا نظریہ خودی......... وہ کون سا راستہ ہے؟ جس پر چل کر ہم معرفت حق تک پہنچ سکتے ہیں۔ یہ سمجھنے کے لیے ہمیں آخرت کا ہمہ گیر تصور سمجھنا ہوگا۔

آخرت کا تصور

فی زمانہ بہت سے لوگ آخرت میں یقین نہیں رکھتے۔ ماضی میں ایسا نہیں تھا۔ ماضی میں جوں جوں ہم دور سے دور تک نظر دوڑاتے چلے جاتے ہیں۔ ہمیں زمین پر بسنے والے انسان مذہب کے زیادہ پابند دکھائی دیتے ہیں۔ آخرت کا انکار دوسرے الفاظ میں مذہب کا انکار ہے۔ کیونکہ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی شخص آخرت پر تو یقین نہ رکھتا ہو لیکن خدا کو مانتا ہو۔ اس لیے کہ اس کا خدا کو ماننا بالکل بیکار ہے۔ اگر میں ساٹھ سال کی زندگی پاؤں اور مجھے یقین ہو کہ میں مرنے کے بعد کسی نئے جہان کا سامنا نہیں کروں گا تو مجھے خدا سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اپنی عمر کے ساٹھ سال تک میں جتنے بھی گناہ اور جرائم کروں گا مجھے ان کا بدلہ دینے کے لیے یوم حساب کا ڈر نہیں ہوگا۔ تب کسی خدا پر بے شک میرا تصور قائم بھی رہا تو میرے دل میں اس کا ڈر نہیں ہوگا۔ چنانچہ ثابت ہوا کہ اگر ہم آخرت کو نہیں مانتے تو خدا کو ماننے کی بھی ضرورت نہیں۔

لیکن آخرت کو ثابت کیسے کیا جائے۔ یہ زمانہ سائنسی طرز استدلال کا زمانہ ہے۔ جدید علوم سے دور رہنے والے لوگوں کو تو الفاظ کی الٹ پھیر سے خدا اور پھر آخرت کے تصور میں جکڑ لینا مشکل نہیں۔ لیکن وہ طلباء جنہوں نے جدید سائنس کی تعلیم حاصل کر لی ہے۔ اب ہر اس عقیدے کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جسے ہم نے بلا چون و چرا مان لیا ہے اور جب انہیں منطقی دلائل و براہین کے ذریعے سمجھایا نہیں جاتا تو وہ برگشتہ (Agressive) ہو جاتے ہیں اور خدا و آخرت سے یکسر انکار کر دیتے ہیں۔ ماڈرن دنیا کے زیادہ تر نوجوان یا تو خدا پر یقین نہیں رکھتے اور یا ایسا یقین رکھتے

Marfat.com

ہیں کہ وہ گویا خدا نہیں کوئی عضو معطل ہے جو اپنی دنیا بنا کر اب ایک طرف بیٹھا خاموشی سے تماشہ دیکھ رہا ہے۔ باقی بچتے ہیں وہ لوگ جو خدا اور آخرت پر سچ مچ ایمان رکھتے ہیں لیکن ان کے ساتھ یہ المیہ ہے کہ وہ ایسی مذہبی پیشوایت کے شکنجے میں پھنسے ہوئے ہیں جو صدیوں سے محض روایت کی بنیاد پر قائم ہے۔ مذہبی دنیا کے لکھاریوں میں روایت اور درایت کی اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔ درایت سے مراد ہے.........
کسی بات کے ثبوت میں عقلی دلائل پیش کرنا۔ اہل مذہب نے اب تک زیادہ تر روایت کا ہی سہارا لیا ہے۔ بے شک روایت کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ہر روایت کو عقلی دلائل مہیا کرتے رہنا گویا اپنے عقائد کو زندہ کرتے رہنے کے برابر ہے۔ عام لوگ سوچنے کا استخراجی انداز نہیں اپناتے استخراجی انداز کیا ہے؟ مثلاً

تمام انسان فانی ہیں۔
چنانچہ اسلم بھی فانی ہے۔

یہ ہے استخراجی انداز۔ عامۃ الناس کے سوچنے کا انداز عموماً استقرائی ہوتا ہے۔
اب استقرائی طرز فکر کی مثال دیکھیے:

اسلم دو پاؤں پر چلتا ہے۔
اسلم ایک انسان ہے۔
لہٰذا انسان دو پاؤں پر چلتے ہیں۔

اسے کہتے ہیں جزو سے کل کا فیصلہ لینا۔ ہماری روزمرہ زندگی میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ ایک دو بار کسی کا راستہ کالی بلی نے کاٹ لیا اور اس کے ساتھ کوئی مشکل پیش آ گئی تو مشہور ہو گیا کہ کالی بلی راستہ کاٹ لے تو مصیبت آتی ہے۔ بعض لوگوں نے دیکھا کہ جمعرات کے روز شروع ہونے والی بارش ہفتہ بھر جاری رہتی ہے تو یہ قانون

Marfat.com

بنالیا کہ ہمیشہ جمعرات کو ہونے والی بارش ہفتہ بھر جاری رہے گی۔ یہ طرز فکر درست نہیں۔ البتہ جب کوئی دانا شخص استقرائی طریقہ کا استعمال کرے گا تو وہ قانون پیش کرنے کی بجائے مفروضہ پیش کرے گا۔ اس نے چیزوں کو زمین پر گرتے دیکھنا شروع کیا اور ہمیشہ یہ سوچنے لگا کہ سب چیزیں زمین پر ہی کیوں گرتی ہیں۔ وہ ایک ایک چیز یعنی ایک ایک جزو کا مشاہدہ کرتا رہا۔ پھر اس نے مفروضہ قائم کیا کہ زمین اشیاء کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ سیب اس لیے درخت سے ٹوٹ کر گرتا ہے کیونکہ زمین اسے اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ ایسے شخص کا طریقۂ فکر بھی اگرچہ استقرائی ہے لیکن اس نے استقرائی عقل کا استعمال جائز طریقے سے کیا۔ لیکن ایک عام انسان استقرائی عقل کا استعمال کر کے مبہم اور ناپائیدار نتائج تک پہنچتا ہے۔ جب مذہب پرستوں سے پوچھا جاتا ہے کہ آخرت کے بارے میں کچھ اس طرح سے سمجھائیں کہ آخرت پر کامل یقین خود بخود ہمارے دلوں میں پیدا ہو جائے تو وہ استقرائی طریقہ کار کا سہارا لیتے ہیں۔ اس موضوع پر ایک مشہور کتاب جس کے پبلشرز نے اب تک غالباً کروڑوں روپے کی بکری کر لی ہے.......... ''موت کا منظر'' کے نام سے ملتی ہے۔ پورا نام یہ ہے:

''موت کا منظر

مرنے کے بعد کیا ہوگا؟''

عامۃ الناس کے دل میں اپنی آخرت کے بارے میں جاننے کا بے پناہ اشتیاق ہے۔ ہر کوئی یہ جاننا چاہتا ہے کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا۔ ''موت کا منظر'' میں بہت سے لوگوں کے واقعات لکھے ہوئے ہیں جو مر گئے اور مرنے کے بعد قبر میں ان کے ساتھ عجیب و غریب واقعات پیش آئے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایک مرے ہوئے انسان کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کی خبر کس نے دی؟ موت کا منظر کی رو سے یہ تمام

Marfat.com

واقعات بعض لوگوں نے اپنی نیند کے دوران خواب میں دیکھے۔ گویا بعض افراد کی انفرادی روایت کو معیار مان کر آخرت کے بارے میں تصورات قائم کیے گئے۔

استقرائی طریقہ کار فی الحقیقت سائنسی طریقہ کار ہے۔ لیکن اس عمل کے لیے چند خاص ضابطوں کی پابندی لازمی ہے جو منطق کی کتابوں میں آسانی سے مل جاتے ہیں۔ عام آدمی جب اس طریقہ فکر کو اختیار کرے گا تو بدشگونی اور بدعقیدگی جنم لے گی۔ جیسا کہ کالی بلی یا ''موت کا منظر'' سے ہمیں ثبوت ملتا ہے۔ اس کے برعکس استخراجی طریقہ کل سے جزو کی طرف سفر کرتا ہے اور ہمیشہ کسی حتمی نتیجے پر پہنچتا ہے۔

تمام انسان فانی ہیں۔

اسلم ایک مکمل انسان ہے۔

لہٰذا ہر قیمت پر ایسا ہوگا کہ اسلم بھی فانی ہوگا۔

قرآن کریم نے ہمیشہ استخراجی اور استقرائی ہر دو طریقے اپنائے ہیں۔ لیکن مذہبی عقائد کو سائنسی طرز استدلال سے مزین کرنے کی کبھی جستجو ہی نہیں کی گئی الاّ قلیل۔ کیا ہم ثابت کر سکتے ہیں کہ آخرت وجود رکھتی ہے۔ موت کا منظر اور قبر کی پہلی رات جیسی کتابوں سے تو کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ ہاں! مگر عام لوگ ایسی کتابوں کو پڑھ کر ڈر ضرور جاتے ہیں۔ لیکن دل سے ان پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔

ہم جانتے ہیں کہ سورج کی روشنی پودوں کے لیے بہت ضروری ہے۔ سورج کے بغیر پودے مر جاتے ہیں اور ہمیں اس بات پر دل سے یقین ہے۔ کیا آخرت کے بارے میں بھی ہمارے دل میں اسی طرح کا یقین ہے؟ ہم نیکیاں کیوں کریں؟ ہم اپنی زندگی کو دنیا میں اخلاقی قواعد کے تحت کیوں گزاریں؟ کیا سچ مچ مرنے کے بعد ہمیں نئی زندگی ملے گی؟ .... ہم جانتے ہیں کہ پودے سورج کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔

Marfat.com

چنانچہ ہم کبھی بھی پودوں کو سورج سے دور رکھنے کی غلطی نہیں کرتے۔ لیکن ہم اپنے اعمال کے حوالے سے ہمیشہ خطا کھا جاتے ہیں۔ اس لیے کہ ہمیں دل سے آخرت پر یقین نہیں۔ ہمیں بچپن سے اب تک ہزاروں واقعات سنا کر آخرت پر یقین دلوانے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن پھر بھی شک کا کانٹا ہمارے دل سے نہ نکل سکا۔ ہمیں یقین ہوتا تو ہم برے اعمال کبھی نہ کرتے۔ بالکل ویسے جیسے ہم کپاس کی فصل کو کسی تہہ خانے میں نہیں اگا سکتے۔ کیا ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ ہے جس سے ہم مرنے کے بعد کی زندگی کا یقین حاصل کر لیں؟ زیادہ سے زیادہ کوئی راسخ العقیدہ مذہبی یہ کہہ سکتا ہے کہ اس نے باطن کی آنکھ سے اللہ کے جلوے دیکھے ہیں اور اسے ذاتی طور پر یہ یقین ہے کہ آخرت ہو کر رہے گی۔ تب بھی ہم عام انسانوں کو اس کی ذاتی روایت، کوئی خاص اجتماعی فائدہ نہیں پہنچاتی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمیں یعنی تمام انسانوں کو اجتماعی طور پر آخرت کا یقین کامل ہو جائے۔ جیسا ہمیں زمین کی کشش ثقل کا یقین کامل اجتماعی طور پر حاصل ہو چکا ہے۔ حالانکہ یہ صرف پانچ سو سال پہلے کی بات ہے۔ جب ”نیوٹن“ کے سر پر سیب گرا تھا۔ لیکن آخرت کے ہونے کا عقیدہ تو ہزاروں سال سے رائج ہے۔ زمین کی کشش ثقل یا پودے کی ضیائی تالیف کو ہم نے دل سے اس لیے مان لیا کیونکہ ہم ہر روز ان حقائق کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ ہم اپنے مذہبی عقائد کو روزمرہ کے مشاہدے میں صاف صاف دیکھیں؟

حیرت ہے! انسان آج تک اپنے ہزاروں سالہ پرانے عقائد کو دل سے تسلیم نہیں کر پایا۔ اس نے یہ عقائد ترک بھی نہیں کیے اور کبھی ان کی اچھی طرح سے پاسداری بھی نہیں کی۔ ہزاروں سال سے یہ عقیدہ موجود ہے کہ دنیا میں اچھے اور برے اعمال کا نتیجہ اگلی زندگی میں ملے گا۔ لیکن انسانوں کی اکثریت نے کبھی برے اعمال کو نہیں

Marfat.com

چھوڑا۔ محض اس لئے کہ انہیں اس پر دل سے یقین نہیں تھا۔ بقول شخصے:

حشر جب آئے گا دیکھا جائے گا

یہ بے یقینی کا عالم ہے اور بقول اقبالؒ .... بے یقینی غلامی سے بدتر ہوتی ہے۔ تو پھر ہم یقین کیسے حاصل کریں؟

ایک حقیقت بہر حال صاف ہے اور وہ یہ کہ زمین پر بسنے والے انسانوں کے لیے آخرت کا عقیدہ دہریت سے بدرجہا بہتر ہے۔ گھٹیا سے گھٹیا مذہب بھی آخرت کا کوئی نہ کوئی تصور رکھتا ہے۔ مثلاً وہ لوگ جو اپنے آباؤ اجداد کی ہڈیوں کو پوجتے ہیں وہ بھی مرنے کے بعد کی زندگی کو مانتے ہیں۔ اس طرح کے یقین کا یہ فائدہ ہے کہ معاشرتی زندگی میں ایسے لوگ نسبتاً برائیوں سے بچے رہتے ہیں۔ ان کے برعکس آخرت کو نہ ماننے والے کسی بات سے نہیں ڈرتے۔ وہ ڈرتے ہیں تو دنیاوی زندگی کے نقصان سے اور اپنے نقصان سے بچنے کے لیے کسی کا بھی نقصان گوارا کر لیتے ہیں۔

لیکن یہ تو آخرت پر عقیدے کا ایک فائدہ بیان کیا گیا ہے۔ نہ کہ آخرت کا کوئی سائنسی ثبوت۔ مذہبی عقائد کے فوائد بعض بڑے بڑے دہریہ مفکرین نے بھی تسلیم کیے ہیں۔ مثلاً ان کا کہنا ہے کہ ''خدا کا تصور معاشرے کو قابو میں رکھنے کے لیے نہایت ضروری ہے، جبکہ اعلیٰ دماغوں کو اس طرح کی فضولیات میں نہیں پڑنا چاہیے'' اس طرح کے مفکرین کی کافی تعداد امریکہ میں پیدا ہوئی اور ایسے ہی مفکرین کی کوششوں سے امریکی عوام کے لیے ڈالر پر ...."We Trust in God" (ہم خدا پر یقین رکھتے ہیں) ...... کے الفاظ تحریر کیے گئے۔ حالانکہ امریکہ کے اعلیٰ دماغ خدا پر یقین نہیں رکھتے۔ ان کے ہاں رجعت ابدی کا جاہلانہ تصور موجود ہے جسے ''علامہ اقبالؒ'' پرلے درجے کی تقدیر پرستی سے بھی برا سمجھتے ہیں۔ آخرت کا تصور اپنی رعایا کے

Marfat.com

دماغ میں راسخ کرنے کے لیے مذہبی کنگز (Kings) نے کبھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ لیکن ان کے دلائل ہمیشہ چٹ پٹے الفاظ پر مشتمل ہوتے ہیں نہ کہ مشاہدات پر۔ بقول اقبالؒ:۔

لبھاتا ہے دل کو کلام خطیب
مگر لذت شوق سے بے نصیب
بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا
لغت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا

اور استدلال ایسا --- کہ آدمی دانا ہو تو اس کی مضحکہ خیزیت پر کھلکھلا کر ہنس دے۔ بس! کچھ ایسے ہی زور استدلال سے مذہبیوں کا کام چل رہا ہے۔ جبکہ عامۃ الناس اُسی طرح گمراہیوں میں گرے ہوئے۔ آپ مسلمانوں کے کسی مذہبی پیشوا کے سامنے جایئے اور اس سے آخرت کے بارے میں عقلی دلیل طلب کیجئے تو وہ آپ کو ایک واقعہ سنائے گا جو ممکن ہے ''حضرت علی کرم اللہ وجہہ'' کے ساتھ منسوب ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ''خواجہ حسن بصریؒ'' یا ''شاہ عبدالقادر جیلانیؒ'' کا نام لے کر آپ کو سنایا جائے۔ بہر حال واقعہ یہی ہوگا۔

''ایک دہریے نے حضرت علیؓ سے آخرت کے ہونے پر دلیل طلب کی۔ حضرت علیؓ نے اسے جواب دیا.........فرض کرو کہ آخرت نہیں ہے اور میں نے اپنی زندگی آخرت کے خوف میں مبتلا ہو کر نیکیاں کرتے ہوئے گزاری دی۔ میں دنیا کی رنگینیوں سے لطف نہ لے سکا لیکن جب میں مرا تو آخرت نہیں تھی چنانچہ مجھے نیکیوں کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس کے برعکس فرض کرو کہ

Marfat.com

آخرت ہے اور تم نے اپنی زندگی یہ سمجھتے ہوئے گزار دی کہ آخرت نہیں ہے۔ ایسی صورت میں یقیناً تم اخلاقیات سے عاری زندگی گزارو گے اور جب تم مرے اور تمہیں پتا چلا کہ آخرت ہے تو تمہارا کیا ہوگا؟ کیونکہ ایک مختصر زندگی کے گناہوں کا بدلہ ایک طویل زندگی میں دینا پڑے گا۔ حضرت علیؓ کا یہ استدلال سن کر وہ دہریہ مسلمان ہوگیا۔''

یہ واقعہ سنانے کے بعد وہ مذہبی پیشوا آپ کو خدا کے وجود پر ایک اور واقعہ سنائے گا اور یہ واقعہ بھی کبھی کسی ایک بزرگ کے نام سے سامنے نہیں آیا۔ بہر حال واقعہ یہ ہے:

''ایک بہت بڑے بزرگ کا کسی دہریے کے ساتھ مناظرہ آ گیا۔ دہریے کو یہ ثابت کرنا تھا کہ خدا نہیں ہے اور نیک بزرگ کو یہ ثابت کرنا تھا کہ خدا ہے نیک بزرگ مناظرے کے مخصوص وقت سے کافی زیادہ تاخیر کے بعد مقام مناظرہ پر پہنچے۔ وہاں ہزاروں لوگ جمع تھے۔ دہریے نے پوچھا.......... حضرت آپ دیر سے کیوں آئے ہیں؟ تو بزرگ نے جواب دیا.......... میں دیر سے اس لیے آیا ہوں کیونکہ میرے راستے میں اچانک ایک دریا نمودار ہوگیا تھا۔ میں گھبرا گیا کہ دریا کو کیسے پار کروں۔ اسی اثناء میں دریا کے کنارے پر موجود درخت خود بخود کٹ کر گر پڑے۔ ان میں سے خود بخود تختے چیرے جانے لگے پھر میں نے دیکھا کہ خود بخود ایک کشتی بن کر دریا میں اتری اور میرے سامنے آ کر کھڑی ہوگئی۔ میں اس کشتی میں بیٹھا اور دریا پار کر کے یہاں

Marfat.com

چلا آیا۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے دیر ہو گئی۔ دہریے نے یہ سن کر منہ بسورا اور طنزیہ لہجے میں پوچھا.......... بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ خود بخود دریا بن جائے؟ خود بخود درخت کٹ جائیں؟ خود بخود کشتی بن جائے؟.......... تب بزرگ نے جواب دیا.......... یہی تو ہم کہتے ہیں کہ زمین و آسمان، یہ سبزہ یہ زندگی، یہ چاند ستارے اور یہ کائنات خود بخود نہیں بن گئے بلکہ ان کو بنانے والی ایک ذات ہے اور وہی خدا ہے۔''

مذہبی طبقے سے ہمیشہ اسی طرح کی حکایتیں خدا اور آخرت کا وجود ثابت کرنے کے لیے پیش کی جاتی ہیں۔ جو موجودہ دور کی استقرائی عقل کے لیے بے حد ناکافی ہیں۔ تاریخ بدل چکی ہے۔ توہمات کا زمانہ لد گیا۔ اب علوم ہر فرد کی دسترس میں ہیں۔ اب انفرادی واقعات یا خالی خولی زورِ استدلال سے کام نہیں چلے گا۔ مذکورہ بالا دونوں واقعات میں ایسی ہی مثالوں کا سہارا لیا گیا ہے۔ بے شک یہ دونوں مثالیں اپنی جگہ درست اور اہم ہیں۔ لیکن برا مت مانیے گا موجود دور کے سائنسی طرز استدلال سے بہت دور ہیں۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آخرت کیا ہے؟

آخرت کی ماہیت کیا ہے؟ اس کی ساخت اور کمیت کیا ہے؟ یہ کیونکر پیش آئے گی؟ کیا یہ کسی سلسلے کی کوئی کڑی ہے؟ یا اچانک پیدا ہو جانے والا ایک نیا جہان؟ یہ کس کو نصیب ہو گی۔ کیا عالم ارواح کو عالم مادیات کے مقابل کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ کیا عامۃ الناس کی سطح پر ایک ایسے شعور کو نشو و نما دی جا سکتی ہے جو یقین کامل کا حامل ہو۔ جیسے ایک چھوٹا سا بچہ بھی جانتا ہے کہ پودے کو زندہ رہنے کے لیے روشنی کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیا ایسا ہی یقین آخرت کے بارے میں عام کیا جا سکتا ہے؟

Marfat.com

جو...... ہر شخص کو خود کار طریقے سے اخلاقیات کا پابند بنا دے، کیونکہ ایسا یقین کرنے کے بعد کوئی بھی شخص دیدہ دانستہ اپنا نقصان نہیں کرے گا۔ ہاں! ہم آخرت کا یقین کامل حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے لیے ہمیں قرآن کے نظریہ ارتقاء کو سمجھنا ہوگا۔ یاد رہے! قرآن کا نظریہ ارتقاء ''ڈارون'' کے نظریہ ارتقاء سے بہت بڑھ کر ہے۔ لیکن قرآن حکیم کو ہم اس وقت تک سمجھ نہیں سکتے جب تک ہم اپنے ثقافتی اور آبائی تصورات و توہمات سے خود کو الگ کر کے نہ سوچیں۔ اور یہ خود قرآن کا کہنا ہے۔

''لایمسه الا المطهرون۔

''اس کو چھوؤ بھی مت، جب تک تم پاک نہ ہو۔''

عام طور پر اس آیت کا معنی یہ لیا جاتا ہے کہ جسمانی طور پر پاک یعنی وضو یا غسل وغیرہ کا ہونا ضروری ہے۔ لیکن سیاق وسباق کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس آیت کا مطلب ہے کہ تم اس وقت تک قرآن کو نہیں سمجھ سکتے جب تک تمہارا ذہن تمام تر تصورات اور توہمات سے پاک نہ ہو۔ ہم اگلے باب میں نظریہ ارتقاء پر سیر حاصل گفتگو کرنے والے ہیں۔ ظاہر ہے اس گفتگو میں ڈارون کا نظریہ بھی زیر بحث آئے گا اور اس پر اٹھنے والے اعتراضات بھی۔ ہم ان مسلمان سائنسدانوں اور مفکرین کا ذکر بھی کریں گے جنہوں نے نظریہ ارتقاء پر سوچا اور مخالفین ارتقاء کا بھی، لیکن ہمارے مضمون کا مرکزی خیال علامہ اقبالؒ کے ان افکار پر مشتمل ہوگا جو آپ نے قرآن کریم سے اخذ کیے اور اپنی شاعری اور نثر میں جگہ جگہ بیان کیے ہیں۔ ہم اسے ''چارلس ڈارون'' کے مقابلے پر ''علامہ اقبالؒ'' کا نظریہ ارتقاء بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس نظریے کی رو سے ثابت ہے کہ آخرت بہرحال قائم ہو کر رہے گی۔ آیئے! دیکھتے ہیں۔

جدید نظریۂ ارتقاء

آخرت کیا ہے؟ اس سوال کا صحیح ترین جواب ہمیں اسلامی نظریۂ ارتقاء سے مل سکتا ہے۔ سائنسدانوں کے پیش کردہ نظریۂ ارتقاء سے نہیں۔ سائنس دانوں کے پیش کردہ نظریہ ارتقاء میں ڈارون اور ویلس سے لے کر آج تک سینکڑوں ذہین لوگوں کا حصہ ہے۔ سائنسدانوں کا نظریہ ارتقاء یہ ہے:

> ''جینز میں اچانک تبدیلی (Mutation) اور قدرتی انتخاب سے گزر کر پیدا ہونے والی زندگی ارتقاء یافتہ ہوتی ہے۔ جینز میں اچانک تبدیلی اور قدرتی انتخاب کے عمل کو ارتقاء (Evolution) کہتے ہیں۔''

یہ بتانے کے لیے کہ جینز، میوٹیشن یا قدرتی انتخاب کیا ہے؟ ہمارے لیے یہ کتاب مناسب نہیں۔ لیکن پھر بھی سائنس کے نظریۂ ارتقاء کا جائزہ لینے کے لیے ہمیں انتہائی سادہ سطح پر ان چیزوں کو سمجھنا ہوگا تاکہ ہم آخرت کے صحیح تصور تک پہنچنے کی کامیاب کوشش کریں۔

جینز (genes) ڈی این اے (DNA) پر ہوتے ہیں۔ ڈی این اے کیا ہے؟ یہ کسی جاندار کے خلیے (Cell) کے بیچوں و بیچ پائے جانے والے چھوٹے چھوٹے دھاگوں پر لکھی قدرت کی تحریریں ہیں۔ کسی جاندار کا خلیہ کیا ہوتا ہے؟ زمین پر موجود تمام جاندار خلیوں سے مل کر بنے ہیں۔ زمین پر یک خلوی جاندار بھی ہیں، مثلاً جراثیم وغیرہ اور کثیر خلوی جاندار بھی۔ مثلاً پودے، حیوانات اور انسان وغیرہ۔

Marfat.com

ہمارے جسم کی ہر چیز خلیات سے مل کر بنی ہے۔ وہ چاہے ہڈی ہو یا گوشت، خون ہو یا بال۔ ہم ایک کثیر خلوی جاندار ہیں۔ جس طرح ایک 'یک خلوی جاندار مثلاً بیکٹر یا یا آمیبا ایک مکمل جاندار ہوتے ہیں۔ اس طرح ہمارے جسم کا ایک ایک خلیہ مکمل جاندار ہوتا ہے۔ گویا ہم ہزاروں لاکھوں بلکہ اربوں کھربوں خلیات (Cells) کا مجموعہ ہیں۔ میرے بدن سے گوشت کا چھوٹا سا ٹکڑا کاٹ کر الگ کر دیا جائے تو اس چھوٹے سے ٹکڑے میں بھی کروڑوں زندہ خلیات ہوں گے۔ جو بعد میں آکسیجن اور خوراک نہ ملنے کی وجہ سے نہ بچ پائیں گے۔ خلیات بھی ہماری طرح بچے دیتے ہیں۔ جب ہم چھوٹے سے تھے تو ہمارا جسم قدرے کم خلیات کا مجموعہ تھا۔ لیکن پھر ہمارے جسم کے خلیات بچے دیتے رہے اور ہمارا جسم بڑھنے لگا۔ ہمارے جسم کا ہر ہر خلیہ ایک الگ جاندار ہے۔ وہ کھاتا ہے، پیتا ہے، سانس لیتا ہے، حرکت کرتا اور بچے بھی پیدا کرتا ہے۔ یہاں تک کہ بچے پیدا کر کے خود ختم بھی ہو جاتا ہے۔ ہمارے ہر خلیے کے اعضاء میں سب سے بڑا عضو اس کا مرکزہ (نیوکلیئس) ہے۔ یہ خلیے کے وسط میں ہوتا ہے۔ اسی میں ڈی این اے (DNA) کی تحریروں والے دھاگے ہوتے ہیں۔ ان دھاگوں پر ہماری تمام خصوصیات لکھی ہوئی ہیں۔ انسانی جسم میں پائے جانے والے خلیات کی کئی قسمیں ہیں۔ مثلاً حسی خلیے، حرکی خلیے یا عصبی اور جنسی خلیے وغیرہ۔ خون کے سرخ خلیوں کو آر۔ بی۔ سی (RBC) یعنی ''ریڈ بلڈ سیلز'' کہتے ہیں۔ اسی طرح خون کے سفید خلیوں کو WBC یعنی ''وائٹ بلڈ سیلز'' کہتے ہیں۔ ہمارے اعضائے جنسی میں جنسی خلیے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ہمارے جیسا دوسرا انسان پیدا کرنے والے خلیے ہیں۔ لیکن کسی ایک فرد کے جنسی خلیے سے نسل پیدا نہیں ہو سکتی افزائش نسل کے لیے نر اور مادہ دونوں کے جنسی خلیے درکار ہوتے ہیں۔ یہ جنسی خلیے مادہ کے رحم میں اکٹھے ہوتے ہیں اور ایک

Marfat.com

دوسرے میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ پھر ان دونوں کے ملنے سے ایک بڑا خلیہ بنتا ہے۔ جسے زائیگوٹ یا جفتہ کہتے ہیں۔ رحم مادر میں زائیگوٹ خود کو تقسیم کر لیتا ہے وہ ایک سے دو، دو سے چار، چار سے آٹھ، آٹھ سے سولہ، اور اسی طرح مسلسل تقسیم در تقسیم کے عمل سے گزرتا ہے اور یوں جفتہ بڑا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ پہلے پہلے وہ گوشت کا ایک لوتھڑا ہوتا ہے۔ لیکن بعد ازاں ایک مکمل انسان۔ کسی خلیے کے تقسیم ہونے کا عمل بیالوجی کی زبان میں می اوسس یا مائی ٹوسس کہلاتا ہے۔ دراصل تقسیم ہونے والے خلیے کے مرکزے یعنی نیوکلیئس میں پائے جانے والے دھاگے دو حصوں میں بٹ جاتے ہیں اور خلیہ درمیان میں سے پچک کر جب دو حصوں میں تقسیم ہونے لگتا ہے تو مرکزے کے مکمل دھاگے دونوں طرف آدھے آدھے چلے جاتے ہیں۔ اس عمل کے دوران کبھی کبھی قدرتی طور پر کوئی ''خطا'' بھی سرزد ہو جاتی ہے۔ مثلاً دھاگے اچھی طرح حصوں میں بٹنے کے لیے اپنے پہلے جوڑوں سے ٹوٹ نہیں پاتے اور اگر اچھی طرح سے ٹوٹ بھی جائیں تو بعض اوقات نئے بننے والے خلیے یعنی دختر خلیے میں اچھی طرح سے دوبارہ جڑ نہیں پاتے۔ تو اچانک تبدیلی (میوٹیشن) کا عمل واقع ہوتا ہے لیکن میوٹیشن یا اچانک تبدیلی صرف جنسی خلیوں میں ہی دیکھی گئی ہے۔ کیونکہ جنسی خلیوں میں ہونے والی میوٹیشن کا نتیجہ پیدا ہونے والے بچے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ بچہ چھ انگلیوں والا ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے اس کے اعضائے تناسل نہ ہوں اور وہ ہیجڑا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے اس کے ایک کی جگہ دو سر ہوں۔ ایسے بچے عموماً مر جاتے ہیں۔ اگر ایسے بچے زندہ رہتے اور ان کی تعداد بہت زیادہ ہوتی اور پھر وہ ایک دوسرے کے ساتھ جنسی ملاپ کرتے تو ان کے خلیوں میں ہونے والی میوٹیشن ان کی نسل میں منتقل ہو جاتی ہے اور انہی کے جیسے اور بچے بھی پیدا ہونے لگتے ہیں پہلا عمل جو خلیے میں واقع ہوا۔ وہ تو ارتقاء کی زبان میں

Marfat.com

میوٹیشن کہلاتا ہے لیکن دوسرا عمل جو ان کے زندہ بچ رہنے اور آپس میں بار بار ملاپ کرنے کا پیش آیا وہ قدرتی انتخاب کہلاتا ہے قدرتی انتخاب کی مزید وضاحت کے لیے ہم جانوروں کی متعدد اقسام دیکھ سکتے ہیں۔ جو قدرتی انتخاب کی چھلنی سے کامیابی کے ساتھ گزر کر اب زمین پر زندہ ہیں۔ قدرتی انتخاب میں وہ نسل باقی رہتی ہے، جس کی تبدیلیاں ماحول سے متاثر ہوئے بغیر قائم رہیں۔ بار بار ملاپ اور نسل کشی کے عمل سے وہ تبدیلیاں اگلی نسل میں بھی چلی جائیں اور اگلی نسل بھی کامیابی کے ساتھ زندہ رہے یہ جدید سائنس کا جدید نظریہ ارتقاء ہے۔ اب ''لیمارک'' اور ''ڈارون'' کے نظریے کو وہ حیثیت نہیں دی جاتی جو اُن کی پہلے تھی۔ بے شک ڈارون کو نظریہ ارتقاء کا بانی سمجھا جاتا ہے، لیکن اس کا نظریہ تبدیلیٔ انواع رد کر دیا گیا ہے۔ لیمارک اور ڈارون تبدیلی انواع کا مختلف نظریہ رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جسم کا کوئی عضو بار بار استعمال کرنے سے بڑھ جاتا ہے یا استعمال نہ کرنے سے سکڑ جاتا ہے۔ لیمارک کا یہ نظریہ تھا کہ سانپ پہلے پیروں والا ہوتا تھا۔ جھاڑیوں میں مسلسل رینگتے رہنے کی وجہ سے اس کے پیر گھس گئے۔ انسان کی دم تھی لیکن مقعد (Hips) کے بل زمین پر بیٹھنے کی وجہ سے وہ دم گھس گئی۔ مزید تفصیلی بحث آگے آئے گی۔ الغرض ڈارون اور لیمارک کا تبدیلیٔ اعضاء کا نظریہ اس وقت مسترد ہو گیا جب ''جان گریگر مینڈل'' نے پودوں اور جانوروں پر بے پناہ تجربات کرنے کے بعد اپنے مشہور قوانین پیش کیے۔ انہی قوانین کی بدولت کروموسومز یعنی خلیے کے مرکزے میں پائے جانے والے دھاگوں تک علماءِ حیاتیات کی رسائی ممکن ہو سکی اور میوٹیشن کا پتا چلا۔ اب یہ تمام سائنسی دنیا میں متفقہ طور پر تسلیم شدہ نظریہ ہے کہ:

> ''اچانک تبدیلی یعنی میوٹیشن (Mutation) اور قدرتی انتخاب کے عمل سے گزر کر جانداروں میں تبدیلیٔ نوع واقع ہوتی ہے۔''

ایک نوع سے دوسری نوع نکلتی ہے اور یوں شجر ارتقاء اپنی مختلف شاخیں پھیلاتا چلا جاتا ہے۔ یہ جدید نظریۂ ارتقاء ہے۔

اس نظریے کو تسلیم کر لینے کے بعد سائنسدانوں نے یہ مان لیا ہے کہ انسان محض ایک مرد اور عورت یعنی آدم و حوا کی اولاد نہیں۔ بلکہ یہ سمندروں کے پانی میں پیدا ہونے والے ایک ابتدائی یک خلوی جاندار یعنی ''پروٹوزوا'' سے ایک طویل عمل کے ذریعے پیدا ہوا ہے۔ سائنس یہ کہتی ہے کہ پروٹوزوا --- سے بتدریج ایک جونک نما مچھلی، پھر ساحل پر رینگنے والے کیڑے اور ان کیڑوں سے خزندے، چرندے، پرندے، درندے حتیٰ کہ انسان سب پیدا ہوئے۔ اسی ابتدائی خلیے کی ایک شکل یا ایک نسل ساحلوں پر اگنے لگی۔ تو وہ نباتات بن گئی۔ میوٹیشن اور قدرتی انتخاب کا عمل کروڑوں سال تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ زندگی اعلیٰ سے اعلیٰ مدارج طے کرتی ہوئی انسان تک آ پہنچی۔

لیکن موجودہ دور کے جدید ترین نظریۂ ارتقاء کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ یہ انسان کے دل سے روحانیت کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ یہ ساری کائنات ایک مشین کی طرح چلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور یوں لگتا ہے جیسے اس کا بنانے والا کوئی نہیں۔ نہ ہی کوئی خالق ہے اور نہ ہی کوئی آخرت۔ جیسا کہ ' کارل ساگان ' نے اپنی کتاب میں ارتقاء پر تبصرہ کرتے ہوئے خالق کے تصور کا خوب مذاق اڑایا۔ آپ بھی دیکھیے:

> ''زمین سے برآمد ہونے والے ڈھانچوں کے ثبوت بھی عظیم مصور کے تصور سے ہم آہنگ ہو سکتے ہیں۔ شاید کچھ مخلوق اس لیے ختم کر دی گئی ہو کہ بنانے والا اس سے مطمئن نہیں تھا اور بہتر ڈیزائن کے لیے نئے تجربات کیے جاتے رہے ہوں گے لیکن یہ

Marfat.com

تشریح مطمئن نہیں کرتی۔ ہر پودا اور ہر جانور پیچیدگی اور نفاست سے بنایا گیا ہے۔ کیا ایک انتہائی ماہر ڈیزائنر (خدا) پہلی ہی بار میں خواہش کے مطابق حیات کی شکلیں تخلیق نہیں کر سکتا تھا۔ زمین سے برآمد ہونے والے ڈھانچے ظاہر کرتے ہیں کہ غلطیاں ہوتی رہی ہیں اور کوشش بھی جاری رہی ہے۔ یہ غلطیاں مستقبل کے ادراک کی کمی کو ظاہر کرتی ہیں۔ یہ حقائق ایک عظیم ماہر ڈیزائنر (خدا) کے تصور کو تقویت نہیں دیتے۔''

.....اور یوں نظریہ ارتقاء مکمل ہونے کے بعد سائنس نے خدا کا انکار کر دیا۔ کیونکہ انہیں پرانے کیچڑ، مٹی اور برف کے اندر دبے ہوئے عجیب الخلقت مخلوقات کے ڈھانچے فاسلز اور ہڈیاں ملیں۔ انہوں نے دیکھا کہ زندگی نے بتدریج ارتقاء کیا ہے۔ انہوں نے دیکھا کہ اگر کوئی خالق ہوتا تو وہ ضرور مستقبل کی ضروریات سے آگاہ ہوتا۔ مستقبل میں کس قسم کی مخلوقات درکار تھیں، بنانے والے کو ضرور خبر ہوتی۔ چنانچہ وہ بار بار غلطیاں نہ کرتا اور کئی کئی مخلوقات بنا بنا کر برباد نہ کرتا۔ سائنسدانوں کو یوں لگتا ہے جیسے ہر چیز کی خالق، کوئی اندھی مشیت ہے جو آنکھیں بند کیے تجربے کرتی چلی جا رہی ہے اور اس سے غلطیوں پہ غلطیاں ہو رہی ہیں۔ لیکن وہ اتنی سمجھدار ہے کہ ایک بار کی گئی غلطی نہیں دہراتی چنانچہ زندگی بہتر سے بہتر شکل میں آگے بڑھ رہی ہے۔

سائنسدانوں کی اس غلط فہمی کی بنیاد دراصل ''دلیل غائی'' ہے۔ خدا کے وجود پر فلسفے نے آج تک جتنے دلائل پیش کیے ان کو بنیادی طور پر تین مانا جاتا ہے اور ''ادلہ ثلاثہ'' کا نام دیا جاتا ہے۔

۱۔ دلیل کونی

۲۔ دلیل غائی

۳۔ دلیل وجودی

دلیل غائی خدا کے وجود پر دلیل ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں دلیل غائی یہ ہے:

''دلیل غائی میں معلول کی علت کا مطالعہ اس اعتبار سے کیا جاتا ہے کہ ہمیں معلوم ہو جائے، اس کی نوعیت کیا ہے؟ لہٰذا جب عالم فطرت کے مشاہدے سے کچھ یوں نظر آتا ہے کہ اس کے اعمال میں پیش بینی، غرض و غایت اور مطابق و توافق کے آثار پائے جاتے ہیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ ان سے ایک ایسی شاعر بالذات ہستی کا ثبوت مل جاتا ہے جس کے علم و قدرت کی کوئی انتہا نہیں۔''

(تشکیل جدید۔ صفحہ نمبر 43)

اور پھر علامہؒ خود اس دلیل کا، رد پیش کرتے ہیں وہ دلیل غائی کو خدا کے وجود پر کوئی صحیح دلیل تسلیم نہیں کرتے۔ آپ یوں لکھتے ہیں:

''حالانکہ اس دلیل سے کوئی نتیجہ مرتب ہوتا ہے تو یہ کہ...... یہ کائنات ایک پہلے سے قائم یعنی سابق الوجود ہے لیکن جسے ایک ہنر مند صانع اپنی صنعت کی کار فرمائی سے منظم کر لیتا ہے......

یہ کائنات بے حس اور متزاحم ہیولا ہے۔ جس کے اجزاء میں بجائے خود نظم و ترتیب کی کوئی صلاحیت نہیں لیکن یاد رکھنا چاہیے اس طرح صرف ایک صانع کا ماننا لازم آتا ہے خالق کا ماننا لازم نہیں آتا۔ جس کے متعلق اگر بالفرض مان بھی لیا جائے کہ ہیولہ

Marfat.com

کائنات کو اسی نے خلق کیا ہے، جب بھی یہ اس کی حکمت و دانائی کا کوئی اچھا ثبوت نہیں۔ اول تو ایک متزاحم ہیولا کی تخلیق سے اپنے لیے طرح طرح کی مشکلات پیدا کرے اور پھر ان پر غالب آنے کے لیے ان طریقوں سے کام لے جو اس کی فطرت اصلیہ کے منافی ہیں۔ یوں بھی جس صانع کا وجود اپنے ہیولا سے خارج ہے وہ لامحالہ اس ہیولا سے محدود بھی ہے۔ لہٰذا اس طرح کا صانع ایک متناہی صانع ہوگا اور اپنے محدود ذرائع کے باعث وہی طرز عمل اختیار کرے گا جو انسان بہ حیثیت صانع اختیار کر سکتا ہے۔ دراصل دلیل غائی کی بناء ایک غلط مماثلت پر ہے۔ انسانی صنعت گری اور مظاہر فطرت کو باہم کوئی نسبت نہیں۔ انسانی صنعت گری کا دار و مدار تو اس پر ہے کہ سب سے پہلے ہم ان اشیاء کا انتخاب کریں جن سے ہم کام لینا چاہتے ہیں اور پھر ان کو ان کے فطری محل اور روابط سے جدا کر دیں، برعکس اس کے فطرت ایک نظام ہے ان اجزاء کا جن کا وجود ایک دوسرے کا محتاج ہے۔ لہٰذا فطرت کے اعمال و افعال اور ایک صنعت گر کے طریقہ کار کو باہم مماثل ٹھہرانا غلط ہے۔ صنعت گری عبارت ہے اشیاء کی بتدریج ایک دوسرے سے علیحدگی اور پھر ان کی از سر نو ترتیب سے۔ لہٰذا اس میں اور اعمال فطرت میں کوئی مماثلت نہیں۔ کیونکہ فطرت کا کام ہے نامی وحدتوں کا ارتقاء جو اپنے نشوونما کے مدارج از خود طے کر لیتی ہے۔"

کارل سا گان کے سوچنے کا انداز بھی انہی غلط نگاہ لوگوں جیسا تھا جن کی طرف علامہ اقبالؒ نے اشارہ کیا۔ جو خدا کے وجود کو مخلوق کے وجود سے الگ اور جدا تصور کرتے ہیں۔ علامہؒ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم کسی ایک ذرے کو بھی خدا سے الگ تصور کریں گے تو ہمیں اس کے اور خدا کے درمیان حد فاصل کھینچنی پڑے گی اور یوں خدا محدود ہو جائے گا۔ کارل سا گان کی غلط فہمی دلیل غائی کی بناء پر تھی۔ جو خالق کی صنعت گری اور ہماری صنعت گری کو ایک نظر سے دیکھ کر یہ کہہ اٹھتا ہے کہ غلطیاں کرنے والا مصور ماہر ڈیزائینر نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ خدا نہیں ہے۔ اس دلیل کا جواب دیتے ہوئے علامہ اقبالؒ کے اختتامی جملے نہایت خوب ہیں۔ جب انہوں نے کہا کہ فطرت تو نامی وحدتوں کا ارتقاء ہے جو اپنی نشو ونما کے مدارج خود طے کرتی ہے......... یہ ہے اسلامی نظریۂ ارتقاء۔

زندگی جب اپنی راہ میں حائل مشکلات سے نمٹنا چاہتی ہے تو خود اپنے اندر سے مقابلے کی قوت طلب کرتی ہے۔ وہ پہلے پہل اپنے ظاہری ہتھیاروں سے مشکلات کا مقابلہ کرتی ہے لیکن جب سب آلات اور ہتھیار نا کارہ ہو جاتے ہیں تو وہ اپنے اندر (قلب) سے ایک نئی طاقت کو نمو دیتی ہے۔ اگر وہ ایسا کر سکے تو باقی رہتی ہے ورنہ اس کے راستے کی مزاحمت اسے ختم کر دیتی ہے۔ زندگی کبھی ختم نہیں ہوتی۔ محض وہ مشین ختم ہوتی ہے جس میں کبھی زندگی نمودار ہوئی تھی اور مشکل پیش آنے پر اس نے باقی رہنے کی ہر کوشش کی تھی لیکن وہ مشین زندگی کا ساتھ نہ دے سکی۔ زندگی آگے بڑھنے کے لیے ہر حربہ استعمال کرتی ہے۔ وہ کبھی اپنے اوزاروں اور پرزوں سے لیس ہو کر مزاحمتوں کا مقابلہ کرتی ہے اور کبھی اندرون ذات سے ایک نئی توانائی حاصل کر کے خود کو مشکل ماحول کے مطابق ڈھال لیتی ہے۔ کبھی کبھی وہ ایک تیسرا راستہ بھی اختیار کرتی ہے اور

Marfat.com

وہ راستہ یہ ہے کہ وہ اپنے سامنے آنے والی مشکل کو دیکھ کر اس گاڑی سے ہی اتر جاتی ہے جس میں بیٹھ کر وہ یہاں تک آئی تھی۔ برانٹو سارس اور ڈائینو سارس مر گئے لیکن زندگی باقی رہی اور آگے بڑھتی چلی آئی۔

فلسفے کے زیر اثر مغربی مفکرین نے سائنسی حقائق کو تو دریافت کر لیا لیکن ان میں موجود حقیقت سرمدیہ یعنی ذات الٰہی کا دیدار نہ کر سکے۔ وہ اگر دیکھتے کہ مزاحمت سے نمٹنے کے لیے زندگی نے ہمیشہ ارتقاء کیا اور اپنے اندرون ذات سے ایک بالکل نئی توانائی حاصل کر لی تو انہیں یہ بھی نظر آ جاتا کہ ایسا آئندہ بھی ہو سکتا ہے۔

اب انسان کے سامنے ذرا مختلف قسم کی مزاحمتیں ہیں۔ جنہیں ہم عام زبان میں ڈپریشنز کہتے ہیں۔ مالی، خانگی یا کیریئر کے مسائل جن کی وجہ سے ہمارے ذہن پر دباؤ ہوتا ہے۔ گویا زندگی کی بڑھتی ہوئی ندی کے سامنے اب ان مسائل کی چٹانیں استادہ ہیں۔ روٹی، کپڑا اور مکان کے مسائل --- انہی کے حصول کی خاطر ہم ایک دوسرے سے لڑتے اور زمین پر دنگا فساد کرتے ہیں۔ ثابت ہوا کہ ذہنی دباؤ اب ہمارے یا زندگی کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ چنانچہ اس رکاوٹ سے نمٹنے کے لیے ہمیں اپنے اندرون ذات (قلب) سے ایک نئی قسم کی توانائی حاصل کرنی ہوگی۔ تاکہ ہم ارتقاء کر سکیں۔ کیونکہ ارتقاء کا قانون یہی کہتا ہے۔

قدرتی انتخاب سے یہی مراد ہے کہ مشکل حالات سے نمٹنے کے لیے زندگی اپنے لیے نئے ہتھیاروں، نئی گاڑیوں اور نئے اسباب کا انتظام کر لے۔ جدید نظریہ ارتقاء کو ماننے والے آخرت اور خدا کے بالکل نزدیک پہنچ کر بھی بھٹک رہے ہیں انہیں چاہیے کہ وہ ارتقاء کے قانون کو ایک اور نظر سے دیکھیں۔ اس نظر سے کہ زندگی اپنی مشکلات سے نمٹنے کے لیے وہ نئی توانائی کہاں سے حاصل کرتی ہے جس نے اسے قدرتی انتخاب

Marfat.com

میں کامیابی سے گزارا اور ایک نیا روپ بخشا۔

فی زمانہ سائنسدانوں کا پیش کردہ نظریہ ارتقاء اُس وقت باطل ہو جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ انسان نے زمین کی تمام مخلوقات یعنی جنگل، دریا، پہاڑ اور سمندر میں بسنے والے تمام جانداروں پر تصرف حاصل کر لیا ہے اور انسان جدید مشینری کے ذریعے اُن کی مشکلات کو دور کر رہا ہے تو ہمارے دل میں سوال اُٹھتا ہے کہ اب ارتقاء کس طرح ممکن ہوگا؟ جب زمینی مخلوقات کی تمام مشکلات ہی دور ہو چکی ہیں یا دور کی جا رہی ہیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ فطرت کی آزاد ریاست میں اب وہ خود کو پہلے کی طرح بڑھائیں یا نوعی تبدیلی کی طرف مائل ہوں، چند سال پہلے تک ''پانڈا'' ناپید ہو رہا تھا۔ پوری زمین پر کل (۱۱۸) ایک سو اٹھارہ پانڈے زندہ بچے تھے۔ تحفظِ جنگلی حیات کے مغربی اداروں نے بڑی محنت کے ساتھ پانڈے کی ختم ہوتی ہوئی نسل کو بچا لیا اور یہ خوبصورت جانور پھر سے پھلنے پھولنے لگا۔ نیشنل جیوگرافک والے صبح شام اسی قسم کی کارگزاریاں سناتے رہتے ہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب انسان نے زمین کی تمام مخلوقات کی زندگیوں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے تو ارتقاء کا قدرتی عمل اب کیونکر ممکن ہوگا؟

اس سوال کا جواب صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ اب انسان خود ارتقاء کا باعث بن رہا ہے۔ اب قدرتی انتخاب کی بجائے مصنوعی انتخاب کا عمل پروان چڑھ رہا ہے۔ انسان نے اپنے ارادے اور مشیت سے پودوں اور جانوروں کی نئی نئی اقسام اور نئی نئی انواع پیدا کرنا شروع کر دی ہیں۔ وہ ارتقاء جو قدرت کے ہاتھوں لاکھوں سال میں عمل پذیر ہوتا تھا۔ اب چند دنوں میں ممکن ہو گیا ہے۔ انسان کے ارتقاء یا انسان کے ہاتھوں ہونے والے ارتقاء کی رفتار قدرتی ارتقاء کی نسبت ہزاروں گنا تیز ہے۔

Marfat.com

چنانچہ زمین پر انسان تو انسان اب کسی بھی مخلوق کے لیے مادی اور جسمانی مشکلات نہیں رہیں اور ارتقاء پھر بھی جاری ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ارتقاء کا قانون تک نہیں بدلا...... بس فرق صرف یہ ہے کہ پہلے جسمانی مشکلات ہوتی تھیں تو جسمانی ارتقاء ہوتا تھا۔ اب انسان کے لیے ذہنی مشکلات بڑھ گئی ہیں لہٰذا ذہنی ارتقاء ہوگا...... جسے ہم چاہیں تو ''روحانی'' بھی کہہ سکتے ہیں اور یہی آخرت کا حقیقی تصور ہے۔

Marfat.com

ارتقاء پر کارل ساگان کا دلچسپ تبصرہ

کارل ساگان نے اپنی کتاب ''کاسموس (Cosmos)'' میں نظریہ ارتقاء پر اپنے مخصوص چلبلے انداز میں انتہائی دلچسپ تبصرہ پیش کیا۔ میرا جی چاہتا ہے کہ آپ بھی نہ صرف اس سے لطف اندوز ہوں بلکہ کارل ساگان کے وزنی دلائل کی روشنی میں آپ نظریہ ارتقاء پر خوب خوب ناقدانہ نظر کر سکیں۔ لیکن یاد رہے کہ نظریہ ارتقاء کو ''تصوف اور جدید سائنس'' میں تفصیل کے ساتھ پیش کرنے کا مقصد صرف اور صرف آخرت کو سائنسی طرزِ استدلال سے ثابت کرنا ہے، تاکہ ہمیں آخرت کا یقین بھی ایسے حاصل ہو جیسے پودے کے عمل ضیائی تالیف کا۔ کارل ساگان نے اپنی کتاب ''کائنات'' میں ارتقاء پر اپنے باب کو .... نغمۂ کائنات میں ایک آواز'' (One voice in the cosmic Fugue) کا نام دیا ہے۔ کارل ساگان کون ہے؟.........

کارل ساگان 9 نومبر 1934ء کو نیو یارک شہر میں پیدا ہوا۔ اپنے سائنسی لیکچروں، ٹیلی ویژن سیریز اور کتابوں کی وجہ سے اس نے کافی شہرت پائی۔ اس نے فلکیات اور علم نجوم پر پی ایچ ڈی کی کئی ڈگریاں حاصل کیں۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ ''ناسا'' (Nasa) میں بھرتی ہو گیا۔ جہاں اس نے مریخ پر بھیجے جانے والے خلائی جہازوں پائنیر 10، پائنیر 11، وائیجر 1، وائیجر 2 اور گیلیلیو کے لیے کام کیا۔ اس نے 1978ء میں اپنی کتاب "The dragons of Eden" پر پرائز حاصل کیا۔ اس کی مشہور کتابوں میں "The demond of hunted world pale

Cosmos اور Blue dot, contact broca's Brain '' شامل ہیں۔ اس نے 20 دسمبر 1996ء میں وفات پائی۔ یہاں نغمہ کائنات میں ایک آواز'' .... پیش خدمت ہے:

''نظر آنے والی پوری کائنات میں مادے کی ایک ہی برادری موجود ہے۔ ستاروں میں کئی ایسے عناصر ہیں جو ہمارے سورج اور زمین پر بھی موجود ہیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ عناصر جو لاتعداد ستاروں میں بکھرے پڑے ہیں۔ ان میں سے کچھ ہمارے سیارے کی نامیاتی حیات سے بھی منسلک ہیں۔ مثلاً ہائیڈروجن، سوڈیم، میگنیشیم اور لوہا۔ کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ کم سے کم وہ چمکدار ستارے جو ہمارے سورج کی طرح ہیں اور ایک سیاراتی نظام کا مرکز ہیں، وہ بھی خود کو حیات کا مسکن بننے کے لیے تیار کر چکے ہوں۔ (Willam Huggins-1865)

میں اپنی تمام زندگی کسی اور سیارے پر حیات کے امکانات کے بارے میں سوچتا رہا ہوں۔ وہ کیسی ہوگی؟ .... کس چیز سے بنی ہوگی؟ .... ہمارے سیارے پر تمام حیات نامیاتی سالموں سے بنی ہے۔ ایک ایسا خوردبینی ڈھانچہ جس میں کاربن کا ایٹم مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔ حیات کے وجود میں آنے سے پہلے ایک دور ایسا تھا جب زمین بنجر اور ویران تھی۔ آج دنیا حیات سے چھلک رہی ہے۔ یہ کیسے ہوا؟ حیات کی غیر موجودگی میں کاربن کی بنیاد والے نامیاتی سالمے کیسے بنے؟ پہلی زندہ چیز کیسے وجود میں آئی؟ حیات نے ارتقاء کر کے انسان جیسی پیچیدہ اور تفصیلی حیات کیسے پیدا کی؟ جو خود اپنی ابتداء کے اسرار کو دریافت کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

اور دوسرے بے شمار سیارے جو دوسرے سورجوں کے گرد گھوم رہے ہیں .... کیا ان پر حیات ہے؟ اور یہ فلکی حیات اگر اس کا وجود ہے تو کیا یہ بھی زمینی

حیات کی طرح انہی نامیاتی سالموں سے بنی ہے؟ کیا دوسری دنیاؤں کی مخلوق بھی بالکل زمینی مخلوق جیسی ہے؟ یا وہ حیرت انگیز حد تک مختلف ہے۔ یعنی دوسرے ماحول میں دوسری شکلیں۔ اس کے علاوہ اور کیا کچھ ممکن ہے؟ زمین پر حیات کی فطرت سے واقفیت اور دوسری دنیاؤں میں حیات کی تلاش ایک ہی سوال کی دو شکلیں ہیں اور وہ سوال یہ ہے کہ ہم ہیں کون؟

ستاروں کی اتھاہ تاریکی میں گیس دھول اور نامیاتی مادے کے بادل ہیں۔ ریڈیو ٹیلیسکوپ کی مدد سے وہاں درجنوں طرح کے نامیاتی سالمے دریافت کیے گئے ہیں۔ سالموں کی بہتات حیات کے ہر جگہ موجود ہونے کا اشارہ دیتی ہے۔ شاید حیات کی ابتداء اور ارتقاء اگر مناسب وقت مل جائے تو، کائناتی ناگزیریت ہے۔ ملکی وے (Milkyway) کہکشاں کے اربوں سیاروں پر شاید حیات کبھی پیدا نہ ہو اور دوسرے سیاروں پر یہ پیدا ہو اور مر جائے یا شاید اپنی ابتدائی شکلوں سے آگے اس کا ارتقاء نہ ہو اور بے شمار دنیاؤں کی چھوٹی سی تعداد پر شاید شعور اور تہذیب ہم سے بھی زیادہ ترقی یافتہ ہو۔

کچھ لوگوں کے خیال کے مطابق یہ ایک خوبصورت اتفاق ہے کہ زمین حیات کے لیے انتہائی موزوں مقام ہے۔ مناسب حرارت، رقیق پانی، آکسیجن سے لبریز فضا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ یا کم از کم اس کا ایک حصہ عمل اور ردعمل کا امتزاج ہے۔ ہم، ارضی مخلوق نے زمین کے ماحول سے بہترین مطابقت پیدا کر لی ہے۔ کیونکہ ہم یہاں پلے بڑھے ہیں۔ ہم سے پہلے کی مخلوق جو ماحول سے مطابقت پیدا نہ کر سکی فناء ہو گئی۔ ہم اس نامیات کی باقیات ہیں جس نے یہ مطابقت پیدا کر لی تھی اور جو نامیات بالکل مختلف دنیا میں پیدا ہوئی ہو گی اس نے بھی ایسا ہی کیا ہو گا۔

زمین پر تمام حیات باہمی رشتے میں بندھی ہوئی ہے۔ ہماری ایک مشترکہ نامیاتی کیمیا اور مشترکہ ارتقائی ورثہ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے Biologist کا دائرہ کار محدود ہو گیا ہے۔ وہ صرف ایک قسم کی Biology کا مطالعہ کرتے ہیں۔ حیات کے نغمے کے صرف ایک سُر کا۔ کیا یہ دھیما اور سُریلا نغمہ ہزاروں نوری سالوں کے فاصلے میں واحد آواز ہے یا کوئی کائناتی نغمہ ہے جس میں مختلف سر، راگ اور انداز ہیں اور اربوں مختلف آوازیں، کہکشاؤں میں حیات کی موسیقی لٹا رہی ہیں۔

میں آپ کو زمین پر حیات کی موسیقی کے بارے میں ایک کہانی سناتا ہوں۔ 1185ء میں جاپان کا شہنشاہ سات سالہ لڑکا تھا۔ اس کا نام انتوکو تھا۔ وہ ایک سمورائی قبیلے "Heiko" کا سربراہ تھا۔ جو ایک دوسرے سمورائی قبیلے "Ganji" سے طویل عرصے سے جنگ میں مشغول تھا۔ دونوں قبیلے اس آبائی تخت و تاج کے دعویدار تھے۔ ان کی فیصلہ کن جنگ 24 اپریل 1185ء میں جاپان کے "Danno-ura" سمندر میں ہوئی۔ شہنشاہ جہاز پر سوار تھا۔ Heiko قبیلے کو شکست ہوئی۔ بہت سے لوگ مارے گئے۔ بچنے والے سمندر میں کود کر مر گئے۔ شہنشاہ کی دادی ''لیڈی نی'' نے فیصلہ کیا کہ وہ گرفتار نہیں ہوں گے۔ اس کے بعد کیا ہوا، یہ ''Heiko'' کی داستان میں اس طرح لکھا ہے:۔

''بادشاہ اگرچہ سات سال کا تھا لیکن وہ اپنی عمر سے بڑا نظر آتا تھا۔ وہ اتنا پیارا تھا کہ اس کے چہرے کے گرد روشنی کا ہالہ محسوس ہوتا تھا۔ اس کے سیاہ لمبے بال اس کے کندھے پر بکھرے ہوئے تھے۔ اپنے چہرے پر حیرت اور پریشانی کے آثار لیے اس نے لیڈی نی سے پوچھا............ آپ مجھے کہاں لے جائیں گی؟............ وہ نوعمر شہنشاہ کی طرف مڑی۔ اس کے گالوں پر آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے شہنشاہ کو پیار کیا۔ اس

کے بالوں کو باندھا۔ آنسو بھری آنکھوں سے نوعمر شہنشاہ نے اپنے دونوں خوبصورت چھوٹے چھوٹے ہاتھ جوڑے۔ پہلے وہ دیوتا "ise" کو خدا حافظ کہنے مشرق کی طرف جھکا۔ پھر "Nembustu" کی دعا پڑھنے کے لیے مغرب کی طرف۔ لیڈی نی نے اسے مضبوطی سے اپنی بانہوں میں لے لیا اور یہ کہتے ہوئے سمندر میں اتر گئی کہ ''سمندر کی تہہ میں ہماری راجدھانی ہے۔''

Heiko کی پوری فوج تباہ ہو چکی تھی۔ صرف 43 عورتیں بچ گئی تھیں۔ شاہی دربار کی یہ خواتین پھول بیچنے اور مچھیروں کی خدمت پر مجبور کر دی گئیں۔ Heiko صفحہ ہستی سے مٹ گئے۔ لیکن ان خواتین اور ان سے پیدا ہونے والی نسل کے ایک بکھرے ہوئے گروپ نے اس جنگ کی یاد تازہ کرنے کے لیے ایک میلہ منعقد کیا۔ یہ ہر سال 24 اپریل کو آج تک منایا جاتا ہے۔ Heiko قبیلے کی نسل جواب مچھیرے ہیں، سر پر کالی پٹی باندھ کر Ahama کی درگاہ پر جاتے ہیں۔ جہاں ڈوب جانے والے شہنشاہ کی یادگاریں رکھی ہیں۔ وہاں اس جنگ کی تمثیل بھی پیش کی جاتی ہے۔ آج صدیوں بعد لوگوں کا تصور یہ ہے کہ وہ سمندر میں سمورائی فوجوں کو اپنی شکست، ذلت اور خون دھوتا ہوا دیکھتے ہیں۔

مچھیرے کہتے ہیں کہ Heiko سمورائی لڑاکوں کی بے چین روحیں اب بھی سمندر کی تہہ میں کیکڑوں کی شکل میں آوارہ گردی کرتی ہیں۔ یہاں ایسے کیکڑے پائے جاتے ہیں جن کی کمر پر نشانات اور عجیب پیٹرن ہیں۔ جو حیرت انگیز طور پر سمورائی لڑاکوں کی شکل سے ملتے ہیں۔ پکڑے جانے پر یہ کیکڑے کھائے نہیں جاتے بلکہ Danna-ura کی دردناک جنگ کے احترام میں واپس سمندر میں چھوڑ دیے جاتے ہیں۔

Marfat.com

یہ داستان ایک خوبصورت مسئلہ کھڑا کر دیتی ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک کیکڑے کی کمر پر سمورائی لڑاکا کی تصویر بنی ہو؟ جواب یہی ہو سکتا ہے کہ انسانوں نے وہ تصویر بنائی ہوگی۔ کیکڑے کی کمر پر بنی ہوئی سمورائی کی تصویر نسل در نسل چلی آ رہی ہے۔ کیونکہ انسانوں کی نسلوں کی طرح کیکڑے کی نسلوں کے مختلف سلسلے ہیں۔ فرض کریں کہ اس کیکڑے کے آباؤ واجداد میں کسی ایک کی کمر پر ایسے نشانات تھے جو کسی حد تک انسانی چہرے سے ملتے تھے۔ Danno-ura کی جنگ سے بھی پہلے مچھیرے ایسے نشانات والے کیکڑے کھانے سے پرہیز کرتے ہوں گے۔ انہیں واپس سمندر میں پھینکنے سے ارتقاء کا ایک عمل شروع ہوا۔ اگر آپ کیکڑے ہیں اور آپ کی کمر تمام کیکڑوں جیسی ہے تو لوگ آپ کو کھا لیں گے۔ آپ کی نسل بہت کم بچے گی، لیکن اگر آپ کی کمر پر کوئی شکل بنی ہو تو آپ کو واپس سمندر میں پھینک دیا جائے گا اور آپ کی نسل پھولتی پھلتی رہے گی۔ جیسے جیسے کیکڑوں اور مچھیروں کی نسلیں گزرتی رہیں۔ وہ کیکڑے جن کی کمر پر سمورائی کے چہرے جیسے نشانات تھے ترجیحی طور پر زندہ رہے۔ یہاں تک کہ ان کی کمر پر نہ صرف چہرہ، نہ صرف جاپانی چہرہ بلکہ غصے سے پھنکارتے ہوئے سمورائی کا چہرہ نمودار ہو گیا۔ اس سب کا تعلق کیکڑے کی خواہش سے نہیں ہے۔ یہ انتخاب اس پر لادا گیا ہے۔ کیکڑا جتنا سمورائی چہرے سے مشابہہ ہوگا اس کے زندہ رہنے کے اتنے ہی زیادہ مواقع ہوں گے۔ آہستہ آہستہ بے شمار سمورائی کیکڑے پیدا ہو گئے۔

یہ عمل مصنوعی انتخاب کہلاتا ہے۔ Heiko کیکڑے کے معاملے میں یہ مچھیروں سے غیر شعوری طور پر سرزد ہوا اور اس میں کیکڑے کے کسی سنجیدہ منصوبے کا عمل دخل نہیں تھا۔ لیکن انسان نے شعوری طور پر بھی بہت سے پودوں اور جانوروں کا انتخاب کیا ہے

کہ کون سے زندہ رہیں اور کون سے مر جائیں۔ ہم بچپن سے ہی کھیت اور گھر کے پالتو جانوروں، پھل، پودوں اور سبزیوں سے واقف ہوتے ہیں۔ یہ کہاں سے آئے ہیں؟ کیا وہ پہلے کبھی جنگل کی آزاد فضا میں رہتے تھے اور بعد میں انہیں سدھا کر پالتو بنالیا گیا؟...... نہیں! حقیقت اس سے بالکل مختلف ہے۔ ان میں زیادہ تر ہمارے بنائے ہوئے ہیں۔

دس ہزار سال پہلے دودھ دینے والی گائیں، ریوڑ کی رکھوالی کرنے والے کتے اور مکئی کے کھیت نہیں ہوتے تھے۔ جب ہم نے ان جانوروں اور پودوں کو پالتو بنالیا تو ہم ان کی افزائش نسل پر قادر ہو گئے۔ ہم نے اسے یقینی بنا دیا کہ کچھ قسمیں جنہیں ہم زیادہ کارآمد سمجھتے تھے...... اور زیادہ بہتر پیدا ہوں۔ جب ہم ایک ایسا کتا چاہتے تھے جو بھیڑوں کی رکھوالی میں ہماری مدد کر سکے تو ہم ایک ایسی نسل کا انتخاب کرتے تھے جو زیادہ ہوشیار، فرمانبردار اور ریوڑوں کی رکھوالی کی پہلے سے صلاحیت رکھتی ہو جو اُن جانوروں میں اکثر ہوتی ہے، جو غول کی شکل میں شکار کرتے ہیں۔ دودھ دینے والے جانوروں کے بڑھے ہوئے تھن انسان کی دودھ اور پنیر سے دلچسپی کا نتیجہ ہیں۔ ہماری مکئی اور اناج کو دس ہزار نسلوں سے بنایا اور سنوارا گیا ہے اور اس حد تک بدل چکی ہیں کہ بغیر انسانی شرکت کے خود بخود پیدا نہیں ہوسکتیں۔

Heiko کیکڑے، کتے، گائے اور مکئی کی بالی کے مصنوعی انتخاب کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ پودوں اور جانوروں کی بہت سی جسمانی اور نسلی خصوصیات اور عادات ہوتی ہیں۔ انسان بہت سی مختلف ضروریات اور وجوہات کی بناء پر جانوروں اور پودوں کی کچھ قسموں کی ہمت افزائی کرتا ہے اور کچھ کی نہیں۔ جس قسم کو ترجیح دی جاتی ہے ان کی تعداد بڑھتی جاتی ہے اور جس نسل کا انتخاب نہیں کیا جاتا وہ کم ہوتی جاتی ہے اور اکثر

Marfat.com

ناپید ہو جاتی ہے۔

لیکن اگر انسان پودوں اور جانوروں کی نئی قسمیں بنا سکتا ہے تو کیا قدرت ایسا نہیں کرسکتی۔ قدرت کا یہ عمل ''انتخاب'' کہلاتا ہے۔ حیات لاکھوں سالوں کے دوران بنیادی طور پر تبدیل ہو چکی ہے۔ زمین پر اپنے مختصر سے قیام کے دوران انسان نے جانوروں اور سبزیوں میں جو تبدیلیاں کی ہیں یہ اس سے واضح ہے اور Fassils کے آثار سے بھی۔ Fassils کا ریکارڈ، ہمیں ان جانوروں کے بارے میں واضح طور پر بتاتا ہے جو زمین پر موجود تھے، لاتعداد اور اب مکمل طور پر ختم ہو چکے ہیں۔ دنیا کی ابتداء سے آج تک اس سے زیادہ اقسام ناپید ہو چکی ہیں جتنی آج موجود ہیں۔ یہ ارتقاء کے انتخابی تجربات ہیں۔ جانوروں کو پالتو بنانے کے دوران بہت تیز genetic تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ خرگوش کو درمیانے دور تک پالتو نہیں بنایا گیا تھا۔ کافی (Coffec) پندرھویں صدی میں پیدا کی گئی۔ چینی (Sugar) انیسویں صدی میں اور Mink --- ابھی پالتو بنائے جانے کے ابتدائی دور میں ہے۔ پالتو بنانے کے عمل نے دس ہزار سالوں سے بھی کم وقت میں بھیڑ کی اون کا وزن ایک کلوگرام سے بڑھا کر دس اور بیس کلوگرام کر دیا ہے اور گائے جو دودھ کے دنوں میں چند کلو دودھ دیتی تھی اب سینکڑوں کلو دودھ دیتی ہے۔ اگر مصنوعی انتخاب اتنے مختصر وقت میں اتنی اہم تبدیلیاں کرسکتا ہے تو پھر قدرتی انتخاب اربوں سالوں میں کیا کچھ نہیں کرسکتا۔ اس کا جواب پوری دنیا میں پھیلی ہوئی لاتعداد مخلوق اور حسن ہے۔ ارتقاء ایک حقیقت ہے تھیوری نہیں۔

ارتقاء دراصل قدرتی انتخاب کا عمل ہے۔ اس دریافت کے ساتھ جو نام وابستہ ہیں وہ چارلس ڈارون اور الفریڈ رسل ہیں۔ تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے انہوں نے کہا تھا

Marfat.com

کہ قدرت بے حد ذرخیز ہے۔ وہ اس سے بھی زیادہ پودے اور جانور پیدا کرتی ہے جتنے زندہ رہ سکتے ہیں۔ حالات اور ماحول یہ انتخاب کرتے ہیں کہ کون سی چیزیں حالات سے مطابقت پیدا کرسکتی ہیں۔ مثلاً نسل میں فوری تبدیلیاں دوسری نسلوں سے ملاپ وغیرہ......... اس عمل میں کارآمد ثابت ہوتے ہیں وہ ارتقاء کا خام مال مہیا کرتے ہیں۔ ماحول ان چند نسلی ملاپوں کو قبول کرتا ہے جو حیات کو جاری رکھنے میں معاون ہو۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حیات کی ایک شکل سست رفتاری سے دوسری شکل میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے اور نئی شکلوں کی بنیاد ڈالتی ہے۔

ڈارون نے "Origine of species" میں کہا تھا.........

''دراصل انسان، تنوع نہیں پیدا کرتا وہ صرف غیر ارادی طور پر نباتاتی حیات کو نئے ماحول سے متعارف کرادیتا ہے۔ پھر قدرت اس پر عمل کرتی ہے اور تنوع پیدا کردیتی ہے۔ لیکن انسان قدرت کے پیدا کردہ تنوع سے انتخاب کرتا ہے اور اسے اپنی خواہش کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔ اسی طرح وہ جانوروں اور پودوں کو اپنی ضروریات یا خوشی کے لیے اپنا لیتا ہے۔ وہ یہ کام قاعدے سے بھی کرتا ہے اور غیر شعوری طور پر وقت کی ضروریات کے مطابق بھی۔ اور کسی نسلی تبدیلی کا سوچے بغیر اپنے فائدے کے لیے بھی۔ اس کی بظاہر کوئی وجہ نہیں ہے کہ جو اصول سدھائے جانے کے عمل میں لاگو ہوتے ہیں وہ قدرتی عمل پر لاگو نہیں ہوتے ہوں گے۔ حیاتیاتی شکلیں اس سے زیادہ پیدا ہوتی ہیں جتنی باقی رہتی ہیں۔ حیات کی کسی ایک شکل پر دوسری شکل کی معمولی سی برتری یا

Marfat.com

ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کی تھوڑی بہت صلاحیت پورے
توازن کو بدل دیتی ہے۔''

T.H Huxly اصول ارتقاء کا انیسویں صدی کا سب سے باا‌ثر حمایتی اور شہرت دینے والا تھا۔ اس نے لکھا ہے کہ ڈارون اور ویلس کے مضامین کی اشاعت اندھیرے میں بھٹکے ہوئے انسان کے لیے روشنی کا کوندا تھی۔ جس نے ایک ایسا راستہ روشن کر دیا جو اسے سیدھا گھر لے جاتا تھا یا نہیں لیکن یقیناً اس طرف جاتا ضرور تھا۔ جب میں نے "Origine of species" کو پہلی بار اچھی طرح سمجھا تو میرا تاثر یہ تھا کہ یہ کتنی احمقانہ بات ہے کہ ہم نے یہ سوچا ہی نہیں۔ میرے خیال میں کولمبس کے ساتھیوں نے بھی تقریباً یہی کہا ہوگا۔ تنوع، زندہ رہنے کے لیے جدوجہد اور حالات سے مطابقت کے حقائق کافی پیچیدہ مسئلہ ہیں لیکن ہم میں سے کسی کو یہ شبہ بھی نہیں تھا کہ Species کے مسئلے کے حل تک پہنچنے کا راستہ ان ہی سے گزر کر جاتا ہے، جب تک کہ ڈارون اور ویلس نے اندھیرا دور نہ کر دیا۔

ارتقاء اور قدرتی انتخاب کے نظریے کے بارے میں بہت سے لوگوں کے سیکنڈل بنائے گئے اور کچھ کا اب بھی بنایا جاتا ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد زمین پر پیدا ہونے والی حیات کی نفاست کو دیکھتے تھے۔ وہ سوچتے تھے کہ نامیاتی حیات کا ڈھانچہ اپنی حرکات و سکنات کے لیے کس قدر مناسب ہے اور یوں اس کے ذہن میں ایک عظیم ڈیزائنر کا تصور پیدا ہوا۔ سادہ سی یک خلیاتی حیات کسی بھی نفیس ترین گھڑی سے زیادہ پیچیدہ ہے اور یہ کہ کوئی جیبی گھڑی خود بخود تو نہیں بن جاتی نہ ہی ہمارے دادا کے زمانے کے گھنٹے آہستہ آہستہ خود بخود ارتقاء کر کے آج کی نفیس گھڑیوں کی سطح تک پہنچے ہیں۔ ایسا بھی کوئی طریقہ نظر نہیں آتا جس میں ایٹم اور خلیات خود بخود جڑ کر ایک ایسا حیرت انگیز،

Marfat.com

پیچیدہ، نفیس، فعال ڈھانچہ وجود میں لے آئیں جس سے ہماری زمین کا ہر خطہ بھرا پڑا ہے۔ ہر زندہ چیز کا ڈیزائن خاص طور پر بنایا گیا تھا۔ کیونکہ ہر مخلوق دوسری سے مختلف تھی۔ یہ بات حیات کے بارے میں ہمارے آباؤ اجداد کی محدود تاریخی معلومات سے مکمل طور پر ہم آہنگ تھی۔ یہ خیال کہ حیات کی ہر شکل کو ایک عظیم مصور نے تخلیق کیا ہے قدرت کو ایک نظر اور انسان کو ایک اہمیت عطا کرتا تھا جس کے لیے ہم آج بھی بے چین ہیں۔ ایک مصور کا تصور تمام نامیاتی حیات کے لیے ایک قدرتی، قابل قبول اور تسکین دہ انسانی تشریح ہے۔ لیکن جیسا کہ ڈارون اور ویلس نے کہا۔ ایک اور طریقہ بھی اتنا ہی دلکش زیادہ قابل قبول اور انسانی ہے اور وہ یہی قدرتی انتخاب ہے، جو زمانے گزرنے کے ساتھ حیات کی موسیقی کو اور دلکش بنا دیتا ہے۔

زمین سے برآمد ہونے والے ڈھانچوں کے ثبوت بھی عظیم مصور سے ہم آہنگ ہو سکتے ہیں۔ شاید کچھ مخلوق اس لیے ختم کر دی گئی ہو کہ بنانے والا اس سے مطمئن نہیں تھا اور بہتر ڈیزائن کے لیے نئے تجربات کیے جاتے رہے ہوں گے۔ لیکن یہ تشریح مطمئن نہیں کرتی۔ ہر پودا اور ہر جانور پیچیدگی اور نفاست سے بنایا گیا ہے۔ کیا ایک انتہائی ماہر ڈیزائینر پہلی ہی بار میں خواہش کے مطابق حیات کی شکلیں تخلیق نہیں کر سکتا تھا۔ زمین سے برآمد ہونے والے ڈھانچے ظاہر کرتے ہیں کہ غلطیاں ہوتی رہی ہیں اور کوششیں بھی جاری رہی ہیں۔ یہ غلطیاں مستقبل کے ادراک کی کمی کو ظاہر کرتی ہیں۔ یہ حقائق ایک عظیم ماہر ڈیزائنر کے تصور کو تقویت نہیں دیتے۔

میں 1950ء کی دہائی میں کالج سے گریجویشن کر رہا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے H.J Mullar کی لیبارٹری میں کام کرنے کا موقع ملا۔ وہ ایک عظیم geneticist تھا۔ اس نے دریافت کیا تھا کہ تابکاری (Radiation) سے بھی

Marfat.com

تبدیلی نوع واقع ہوتی ہے۔ Mullar ہی وہ شخص تھا جس نے مصنوعی طریقہ انتخاب کی مثال...... Heiko کیکڑے کی طرف میری توجہ دلائی تھی۔ genetics کو عملی طور پر سمجھنے کے لیے میں کئی مہینوں تک پھلوں کی مکھی (Fruit fly) پر کام کرتا رہا۔ یہ ایک چھوٹی سی دو پروں والی اور بڑی آنکھوں والی مکھی ہے۔ انہیں ہم دودھ کی بوتلوں میں رکھتے تھے۔ ہم ان کی دونسلوں کے ملاپ سے پیدا ہونے والی نسل کا معائنہ کرتے تھے کہ اُن میں قدرتی تبدیلی نوع اور مصنوعی تبدیلی نوع کس طرح رونما ہوتی ہے مادہ ٹیکنیشن کے رکھے ہوئے شیرے پر انڈے دیتی تھی۔ بوتل بند کر دی جاتی تھی۔ ہم دو ہفتے تک انڈوں سے لاروا نکلنے اور لاروا سے پیوپا اور پیوپا سے ایک نئی بالغ مکھی بننے کا انتظار کرتے تھے۔

ایک دن میں خوردبین سے نئی بننے والی بالغ مکھیوں کے جھنڈ کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ جنہیں دوا کے ذریعے بیہوش کر دیا گیا تھا۔ میں مختلف قسموں کو اونٹ کے بالوں کے برش سے الگ کرتا جارہا تھا کہ میں...... ایک بالکل نئی نسل کو ان کے درمیان دیکھ کر حیران رہ گیا۔ فرق معمولی نہیں تھا مثلاً لال آنکھوں کے بدلے سفید آنکھیں یا بالوں والی گردن کے بدلے بے بالوں کی گردن۔ یہ ایک بہتر کارکردگی کرنے والی مخلوق تھی جس کے پر زیادہ واضح اور انٹینا لمبا اور بالوں والا تھا۔ میں نے سوچا قسمت نے ایک ہی نسل میں کافی بڑی تبدیلی کا اظہار کیا ہے۔ جس کے بارے میں (Muller) کا کہنا تھا کہ ایسا کبھی نہیں ہوتا اور یہ واقعہ خود اس کی ہی لیبارٹری میں ہی ہو گیا اور اسے اس واقعہ کی اطلاع دینا میری ناخوشگوار ذمہ داری ٹھہری۔

بھاری دل کے ساتھ میں نے اس کے دروازے پر دستک دی۔ اندر آ جاؤ۔ دبی دبی سی غراہٹ میں جواب دیا گیا۔ میں داخل ہوا تو دیکھا کہ کمرہ تاریک ہے اور صرف

Marfat.com

خوربین کا لیمپ جل رہا ہے جس پر وہ کام کر رہے تھے۔ اس نیم تاریک ماحول میں میں نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں اپنی دریافت کی کہانی سنائی کہ میں نے ایک نئی مکھی دریافت کر لی ہے اور مجھے یقین ہے کہ اسی بوتل کے پیوپا سے برآمد ہوئی ہے۔ میں (Muller) کے کام میں مخل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ کیا...... یہ لیپی ڈوپٹرا (Lepidoptera) سے زیادہ Deptera لگتی ہے؟ اس نے پوچھا۔ اس کے چہرے پر نیچے سے روشنی پڑ رہی تھی۔ میری سمجھ میں اُس کا سوال نہ آیا چنانچہ اُسے تشریح کرنی پڑی۔ کیا اس کے بڑے پر ہیں اور انٹینا پر بال بھی ہیں۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

Muller نے کمرے کی روشنی جلا دی اور شفقت سے مسکرائے۔ یہ پرانی کہانی ہے۔ ایک پتنگا جو لیبارٹری کے ماحول کا عادی ہو گیا تھا۔ اسے ان تجرباتی مکھیوں سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ تو دودھ کی بوتل کے اس شیرے کے لیے آتا تھا جس پر مکھیاں پیدا ہوتی تھیں۔ جتنی دیر میں ٹیکنیشن مکھیوں کے لیے بوتل کھول کر دوبارہ بند کرتا اس مادہ پتنگے نے چھلانگ لگائی اور شیرے کی طرف لپکا۔ اس بھاگ دوڑ میں باہر نکلتے ہوئے اس نے اپنے انڈے اس شیرے پر چھوڑ دیے، چنانچہ میں نے کوئی حیرت انگیز تبدیلی دریافت نہیں کی تھی بلکہ میں نے محض قدرت کی ایک خوبصورت مطابقت دیکھی تھی۔ ایک نفیس تبدیلی نوع اور قدرتی انتخاب کی پیداوار۔

ارتقاء کے راز موت اور وقت میں پوشیدہ ہیں۔ موت، حیات کی لاتعداد شکلوں...... جو ماحول سے مطابقت پیدا نہ کر سکیں اور وقت، چھوٹی چھوٹی تبدیلی نوع کا وہ سلسلہ ہے جس میں حیات کی لاتعداد شکلیں ماحول سے مطابقت پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ بہت سست رفتار، ہم آہنگ تبدیلیوں کا ایک طویل دور۔ ڈارون اور

Marfat.com

ویلس کے اخذ کردہ نتائج سمجھنے میں ہمارے سامنے ایک رکاوٹ لاکھوں سال کا طویل دور بھی ہے۔ سات کروڑ سال ہماری جیسی مخلوق کے لیے کتنے معنی رکھتے ہیں جو اس کا لاکھواں حصہ ہی جیتی ہو۔ ہم ان تتلیوں کی طرح ہیں جو صرف ایک دن کے لیے وجود میں آتی ہیں اور جو اسی کو ازل سمجھتی ہیں۔ حیات کے ارتقاء میں اس زمین پر جو کچھ ہوا وہ اور بھی بہت سی دنیاؤں میں ہوا ہوگا لیکن اگر ہم تفصیلات میں جائیں جیسے پروٹین کی کیمسٹری یا دماغ کی پیچیدگی، (Neurology) تو پھر حیات کی کہانی شاید پوری Milky way کہکشاں میں منفرد ہو۔ زمین تقریباً ½4 ملین سال پہلے کائناتی گیس اور دھول سے وجود میں آئی۔ ہمیں Fassils کے ریکارڈ سے پتا چلتا ہے کہ تقریباً اس کے فوراً بعد سمندروں اور تالابوں میں نباتات بھی وجود میں آئی ہوگی۔ شاید 4 ملین سال پہلے۔ پہلی زندہ چیز ایک خلیاتی حیات جتنی پیچیدہ نہیں تھی .... خلیہ حیات کی کافی ترقی یافتہ شکل ہے۔ حیات کی پہلی کروٹ سادہ تھی۔ ان ابتدائی دنوں میں بجلی کی چمک اور سورج کی الٹراوائلٹ (Ultra violet) شعاعیں قدیم ماحول کے ہائیڈروجن سے مالا مال Molecules کو توڑ رہی تھیں۔ ٹوٹے ہوئے حصے خود بخود زیادہ پیچیدہ سالمات میں ڈھل رہے تھے۔ اس ابتدائی کیمیاء کی پیداوار سمندر میں گھل کر ایک نامیاتی سوپ کی شکل اختیار کرتی جا رہی تھی کہ یکا یک ایک دن ایک سالمہ وجود میں آیا جو سوپ میں موجود دوسرے سالموں کو جوڑ کر خود کی بھدی سی نقل بنانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ ہم اس موضوع کی طرف بعد میں آئیں گے۔

یہ "Deoxyribonucleic Acid" ڈی آکسی رائبو نیوکلیک ایسڈ کا جد اعلیٰ تھا۔ یعنی DNA زمین پر حیات کا سب سے اہم سالمہ۔ یہ ایک بل کھاتی ہوئی سیڑھی کی شکل کا ہے۔ اس سیڑھی کے پائیدان چار مختلف سالماتی حصوں میں ملتے ہیں

Marfat.com

جس پر genetic code کے چار حروف ہوتے ہیں۔ سیڑھی کے یہ پائیدان---Nuleotide کہلاتے ہیں۔ جو ایک مخصوص موروثی ساخت بنانے کی ہدایات جاری کرتے ہیں۔ زمین پر حیات کی ہر مختلف شکل بنانے کے لیے ہدایات کا ایک مجموعہ ہے جو ایک ہی زبان میں لکھا ہوا ہے۔ تمام مخلوق کی ساخت مختلف ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ہر ایک کے نیوکلی اک ایسڈ (Nucliec Acid) کی ہدایات میں فرق ہے۔ تبدیلی نوع Nucleotide Mutation...... نیوکلیوٹائیڈ کی وہ تبدیلی ہے جو اگلی نسل میں ظاہر ہوتی ہے۔ کیونکہ تبدیلی نوع...... نیوکلیوٹائڈ Nucleotide کی اتفاقیہ تبدیلی ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ زیادہ تر نقصان دہ اور جان لیوا ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ فالتو Enzyne (خامرے) پیدا کرنے کی ہدایات دے دیتی ہے۔ اس کے باوجود یہی وہ دوراز کار لمحہ ہے جو ایک سینٹی میٹر کے لاکھویں حصے کے برابر لمبے چوڑے Nuecleotide میں کار آمد تبدیلی کی وجہ سے ارتقاء کے عمل کو جاری رکھتا ہے۔

چار بلین سال پہلے زمین ایک سالماتی جنت تھی۔ اس وقت تک شکاری پیدا نہیں ہوتے تھے۔ کچھ سالمے خود کو اپنی نقل بنانے کا اہل ثابت نہیں کر سکے انہوں نے تعمیری بلاکس (Building Blocks) کے لیے مقابلہ کیا اور اپنی بھدی شکلیں چھوڑ گئے۔ نسل پیدا کرنا، تبدیلی نوع اور نااہل اقسام کے مٹ جانے کے عمل کے ذریعے ارتقاء کا قافلہ رواں دواں ہو چکا تھا۔ حتیٰ کہ سالماتی سطح پر بھی۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا بہتر پیدائش کی صلاحیتیں پیدا ہوتی گئیں۔ مخصوص عمل کے حامل سالموں نے اتحاد کر لیا اور ایک متحدہ سالمہ (مالیکیول) تیار کر لیا' یعنی پہلا خلیہ۔ ایک پودے کے خلیے میں آج سالماتی فیکٹریاں لگی ہوئی ہیں جنہیں کلوروپلاسٹ (Choloroplast) کہا جاتا

Marfat.com

ہے۔ جو ضیائی تالیف (Photosynthises) کی ذمہ دار ہیں۔ یعنی سورج کی روشنی کو پانی اور کاربن ڈائی آکسائیڈ (Co2) اور آکسیجن (O2) میں تبدیل کرنے کی ذمہ داری۔ خون کی ایک بوند کے خلیوں میں ایک مختلف قسم کی سالماتی فیکٹری ہوتی ہے۔ یعنی Mitochondrio جو غذا کو آکسیجن سے ملا کر کارآمد انرجی پیدا کرتی ہیں۔ پودوں اور جانوروں کے خلیوں میں آج یہ فیکٹریاں موجود ہیں۔ لیکن شاید ایک دور میں یہ آزاد رہنے والے خلیات تھے۔

تین بلین سال پہلے کچھ یک خلیاتی پودوں نے اتحاد کر لیا۔ شاید اس لیے کہ کسی تبدیلی نوع نے ایک خلیے کو دو میں تقسیم ہونے کے بعد مزید تقسیم سے روک دیا۔ پہلا کثیر الخلیاتی جسم وجود میں آ گیا۔ آپ کے جسم کا ہر خلیہ ایک طرح سے ایک قبیلہ ہے۔ ایک دور میں آزاد رہنے والے خلیات نے اجتماعی مفاد کے لیے اتحاد کر لیا تھا۔ آپ اربوں، کھربوں خلیات سے مل کر بنے ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک، ایک مجموعہ ہے۔

جنس (Sex) شاید دو بلین سال پہلے ایجاد ہوئی۔ اس سے پہلے نئی اقسام صرف اتفاقی تبدیلی نوع سے وجود میں آ سکتی تھیں۔ ارتقاء کا عمل تکلیف دہ حد تک ست تھا۔ جنس کی ایجاد کے ساتھ حیات کی وہ شکلیں اپنے DNA کا پورا پیرا گراف، صفحات ار کتاب کا تبادلہ کر سکتی تھیں۔ انتخاب کی چھلنی سے گزرنے کے لیے نئی اقسام وجود میں آ گئیں۔ حیات، جنسی عمل کے لیے انتخاب کرتی ہے۔ جنہیں یہ عمل غیر دلچسپ لگا وہ فوراً ہی ناپید ہو گئیں اور یہ دو ارب سال پہلے کے Microbe (مائیکروب) کے لیے ہی سچ نہیں ہے بلکہ ہم انسان آج بھی DNA کے مختلف حصوں کے تبادلے کی جذباتی خواہش رکھتے ہیں۔

ایک بلین سال پہلے پودوں کے باہمی عمل اور تعاون نے زمین کے ماحول میں

Marfat.com

حیرت انگیز تبدیلی پیدا کر دی۔ سبز پودے سالماتی آکسیجن پیدا کرتے ہیں کیونکہ اس وقت تک سمندر سارے سبز پودوں سے بھر چکے تھے۔ آکسیجن زمین کے ماحول کا غالب حصہ بنتی جا رہی تھی اور اس کے ہائیڈروجن سے پر کردار کو بدل رہی تھی۔ زمین کی تاریخ کا وہ دور ختم ہو رہا تھا جب حیات کا مادہ غیر حیاتیاتی عمل سے تیار ہوتا تھا۔ لیکن آکسیجن کا رجحان یہ ہے کہ وہ نامیاتی سالموں کو توڑتی ہے، ہماری آکسیجن میں اتنی دلچسپی کے باوجود یہ غیر محفوظ نامیاتی مادے کے لیے زہریلی ہے۔ ماحول میں آکسیجن کے اضافے نے حیات کی تاریخ میں بہت بڑا بحران پیدا کر دیا۔ اور حیات کی وہ بہت سی قسمیں جو اس آکسیجن سے مطابقت نہ پیدا کر سکیں فنا ہو گئیں۔ صرف چند ابتدائی قسمیں مثلاً Botulism اور Bacilla Tetanus صرف آکسیجن سے آزاد فضا میں آج بھی زندہ ہیں۔ زمین کی فضا میں نائٹروجن کیمیائی طور پر آکسیجن کے مقابلے میں زیادہ غیر موثر چنانچہ زیادہ سازگار ہے۔ لیکن یہ بھی فضا میں حیات کی وجہ سے قائم ہے۔ چنانچہ زمین کی %99 فضا کی بنیاد حیاتیات ہے۔ آسمان حیات نے بنایا ہے۔"

حیات کی ابتداء سے یعنی چار بلین (چار ارب) سال کے زیادہ تر حصے میں حیات کی جو شکل زمین پر حاوی رہی وہ خوردبینی Blue green Algea ہے جس سے سمندر بھرے پڑے تھے۔ لیکن تقریباً 600 ملین سال پہلے زمین پر Algea کی اجارہ داری ختم ہو گئی اور حیات کی لاتعداد قسمیں وجود میں آ گئیں۔ یہ واقعہ Cambarian Explosion کہلاتا ہے۔ حیات تقریباً زمین کے وجود میں آتے ہی پیدا ہو چکی تھی۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حیات زمین جیسے سیاروں پر ایک ناگزیر کیمیائی عمل ہے۔ لیکن تین بلین سال تک حیات Blue green

Marfat.com

algea سے کچھ زیادہ ارتقاء نہیں کر سکی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مخصوص عمل کے حامل اعضاء رکھنے والی حیات کی شکلوں کا ارتقاء دشوار عمل ہے۔ خود حیات کی پیدائش سے بھی زیادہ دشوار ہوسکتا ہے آج بھی کائنات میں ایسے بہت سے سیارے ہوں گے جو Microbes سے بھرے پڑے ہوں۔ لیکن وہاں بڑے جانور اور سبزیاں نہ ہوں گی۔

Cambarian Explosion کے فوراً بعد سمندر حیات کی مختلف شکلوں سے بھر گئے (50 کروڑ) پانچ سو ملین سال پہلے Trilobites کے غول کے غول موجود تھے۔ یہ خوبصورت جاندار، بڑے کیڑے کی طرح چھوٹی مخلوق تھی۔ یہ غول کی شکل میں سمندر کی سطح پر شکار کی تلاش میں پھرتے رہتے تھے۔ آج کوئی Trilobite زندہ نہیں ہے۔ تقریباً بیس کروڑ سال سے اُس دور میں جو پودے اور جانور موجود تھے آج ان کا کوئی نشان باقی نہیں ہے۔ موجودہ حیات کی تمام شکلیں اُس دور میں کوئی وجود نہیں رکھتی تھیں۔ پرانی چٹانوں میں آج کے جانوروں کے کوئی آثار موجود نہیں۔ مختصر سے وقت کے لیے حیات کی مختلف شکلیں جھلملائیں اور غائب ہوگئیں۔

Cambarian Explosion سے پہلے حیات کا قافلہ ایک دوسرے کے پیچھے سست رفتار سے رواں دواں تھا۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ہم جتنا ماضی میں جھانکتے ہیں ہماری اطلاعات کا خزانہ کم سے کم تر ہوتا نظر آتا ہے۔ ہمارے سیارے کی ابتدائی تاریخ میں سخت جسمانی اعضاء رکھنے والی حیات بہت کم تھی اور ملائم جسم والی حیات کے Fossils (فاسلز) بہت کم باقی رہتے ہیں۔ لیکن وقفے وقفے سے حیات کی نئی شکلوں کا ظہور ایک حقیقت ہے۔ سالموں کے ڈھانچے اور کیمیا کے طویل ارتقاء

کی بیرونی شکلوں کا اظہار فوری طور پر Fossils کے ریکارڈ سے نہیں ہوتا۔ Cambarion Explosion کے بعد حیات کی نئی پیچیدہ شکلیں حیرت انگیز تیز رفتاری سے ایک دوسرے کے بعد نمودار ہوتی ہیں۔ پہلی مچھلی اور پہلی ریڑھ کی ہڈی والی حیات کا ظہور۔ پودے جو سمندر تک محدود تھے زمین پر آباد ہونا شروع ہوئے۔ پہلا کیڑا وجود میں آیا اور ان کی نسلیں زمین پر آباد ہونے والے جانوروں کی بنیاد بنیں۔ Amphibians کے ساتھ پیروں والے کیڑے وجود میں آئے۔ Lung fish کی طرح کی مخلوق جو خشکی اور پانی دونوں جگہ رہ سکتی تھی، پہلا درخت اور رینگنے والے کیڑے نمودار ہونے شروع ہوئے۔ ڈائنوسارس (Dinosaurs) وجود میں آئے۔ دودھ پلانے والے جانور اور پھر پہلے پرندے، پہلے پھول۔ ڈائنوسارس فنا ہوگئے۔ پہلے Cetaceans نمودار ہوئے پھر وہیل مچھلی اور ڈالفن کے آباؤ اجداد اور اسی دور میں Primates وجود میں آئے، جو بندر، بن مانس اور انسان کے پرکھے تھے۔ ایک کروڑ سال سے بھی کم ہو جب انسان سے ملتا جلتا پہلا جانور وجود میں آیا۔ عام جانور سے بڑا دماغ لیے ہوئے اور صرف چند لاکھ سال پہلے حقیقی انسان نمودار ہوا۔

انسان کی پرورش جنگلوں میں ہوئی۔ ان سے ہمارا فطری تعلق ہے۔ درخت کتنا خوبصورت ہوتا ہے آسمان کی طرف بڑھتا ہوا۔ اس کی پتیاں سورج کی کرنیں جمع کرکے (Photo syntheses) ضیائی تالیف کرتی ہیں۔ چنانچہ درخت اپنے پڑوسیوں سے مقابلہ کرتے ہیں۔ اگر آپ کبھی غور سے دیکھیں تو دو درخت ایک دوسرے کے ساتھ بڑے شاہانہ وقار سے چھیڑ چھاڑ کرتے نظر آئیں گے۔ درخت بہت خوبصورت اور بڑی بڑی فیکٹریاں ہیں جو سورج کی روشنی سے توانائی حاصل کرتی

Marfat.com

ہیں۔ زمین سے پانی اور ہوا سے کاربن ڈائی آکسائیڈ اور ان چیزوں کو غذا میں تبدیل کر دیتی ہیں خود اپنے لیے بھی اور ہمارے لیے بھی۔ پودے کاربوہائیڈریٹ بناتے ہیں اور اسے اپنی مشین چلانے کے لیے استعمال کرتے ہیں اور ہم جانور جوان پودوں کے لیے جونکیں ہیں ان کے کاربوہائیڈریٹ چرا لیتے ہیں۔ تاکہ ہم اپنے کام کو جاری رکھ سکیں۔ پودوں کو کھا کر ہم کاربوہائیڈریٹ کو آکسیجن سے ملا دیتے ہیں اور یوں ہم وہ قوت حاصل کرتے ہیں جو ہمیں زندہ رکھتی ہے۔ اس عمل میں ہم کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج کرتے ہیں جو پودے اپنے لیے کاربوہائیڈریٹ بنانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ کس قدر خوبصورت باہمی تعاون کا نظام ہے۔ پودے اور جانور ایک دوسرے کی خارج کی ہوئی ہوا میں سانس لیتے ہیں۔ پورے کرے پر امداد باہمی کا یہ عمل جاری ہے اور اس نازک عمل کو 150 ملین کلومیٹر دور ایک ستارہ توانائی عطا کرتا ہے۔

دنیا میں کروڑوں اربوں طرح کے حیاتیاتی سالمے ہیں۔ لیکن ان میں صرف 150 ایسے ہیں جو زندگی کے عمل میں ضروری ہیں۔ ایک ہی طرح کے نمونے بار بار دہرائے جاتے ہیں۔ مختلف عمل کے لیے مختلف ترتیب اور طریقے سے۔ زمین پر حیات کی بنیاد وہ پروٹین ہیں جو خلیاتی کیمیا کو کنٹرول کرتے ہیں اور وہ Nucliec Acid ہیں جو موروثی ہدایات کے حامل ہوتے ہیں۔ ایسے سالمے تمام جانوروں اور درختوں میں یقینی طور پر ہم شکل ہوتے ہیں۔ ایک نیم کا درخت اور میں، بنیادی طور پر ایک ہی مادے سے بنے ہیں۔ اگر ہم بہت پیچھے ماضی میں جائیں تو ہمارے آباؤ اجداد ایک ہی تھے۔

زندہ خلیے کا تانا بانا بھی اتنا ہی خوبصورت اور پیچیدہ ہے جتنا کہکشاؤں اور ستاروں کا۔ خلیے کی یہ نفیس اور پیچیدہ فیکٹری چار بلین سال میں آہستہ آہستہ تیار ہوئی

Marfat.com

ہے۔ غذا کے ذرات، جیسے جادو کے زور سے خلیاتی مشینوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ خلیہ یہ کیسے کرتا ہے۔ اس کے اندر ایک پیچیدہ اور نازک تانا بانا ہے جو اس کے ڈھانچے کو برقرار رکھتا ہے۔ سالمات کو تبدیل کرتا ہے توانائی محفوظ کرتا ہے شاید اپنی نقلیں بنانے کے لیے۔ اگر ہم کسی طرح ایک خلیے میں داخل ہو سکیں تو ہمیں نظر آنے والے تمام تر سالماتی دھبے پروٹین کے سالمے ہوں گے۔ کچھ جنونی انداز سے کام میں مشغول ہوں گے، کچھ اپنی باری کے منتظر۔ سب سے اہم پروٹین Enzymes ہوتے ہیں۔ یہ وہ سالمے ہیں جو خلیے کے کیمیائی عمل کو کنٹرول کرتے ہیں۔ Enzymes وہ ہنرمند مزدور ہیں جن میں سے ہر ایک مخصوص سالماتی کام کا ماہر ہے۔ لیکن Enzymes اس پورے کارخانے کو نہیں چلاتے وہ ہدایات حاصل کرتے ہیں اور وہ خود بھی بنائے جاتے ہیں ان کے حکم پر جو اس کام کے انچارج ہیں۔ اصل باس.......... Nucleic Acid ہیں۔ وہ خلیے کے مرکز میں گوشہ نشینی کی حالت میں رہتے ہیں۔

اگر ہم کسی مسام کے ذریعے کسی خلیے کے مرکز میں پہنچ جائیں تو کچھ ایسا منظر دیکھنے کو ملے گا جیسے سویوں کی فیکٹری میں کوئی بیل گھس گیا ہو۔ لاتعداد سویوں کے جال بے ترتیبی سے اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ دو طرح کے Nucleic Acids ہیں۔ DNA، جسے معلوم ہوتا ہے کہ کیا کرنا ہے اور RNA، جو DNA سے حاصل ہونے والی ہدایات تمام خلیوں کو بھیجتا ہے۔ یہ وہ بہترین شکل ہے جو چار ارب سال کا ارتقاء ہی پیدا کر سکتا ہے۔ اس میں وہ تمام مکمل ہدایات موجود ہیں کہ ایک درخت یا انسان کے خلیے کو کس طرح بننا اور کام کرنا ہے۔ انسانی DNA میں لکھی ہوئی معلومات اتنی زیادہ ہیں کہ اگر انہیں عام زبان میں لکھا جائے تو سو، موٹی موٹی جلدیں تیار ہو

Marfat.com

جائیں۔ اس کے علاوہ خاص بات یہ ہے کہ DNA کے سالمے جانتے ہیں کہ خود کی ہمشکل نقلیں کیسے بنائی جائیں۔ اس کے پاس بے حد معلومات ہیں۔

DNA ایک دوہری سیڑھی ہے۔ دو، ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے کانٹے دار تار، یہ ایک بل کھاتی ہوئی سیڑھی کی طرح ہوتے ہیں۔ .... Nucleotide کی ترتیب یا سلسلہ ہی حیات کی زبان ہے۔ پیداوار کے دوران ایک مخصوص بل کھولنے والے پروٹین کی مدد سے یہ سیڑھیاں الگ ہو جاتی ہیں اور مرکزہ کے رقیق تانے بانے میں آوارہ گردی کرتے ہوئے Nucliotides کے بلاکس کے جوڑے ایک دوسرے کی ہم شکل نقلیں بناتے رہتے ہیں۔ بل کھانے کے عمل کے دوران ایک حیرت انگیز Enzyme اس بات کا دھیان رکھتا ہے کہ نقلیں ٹھیک بن رہی ہیں یا نہیں۔ ایسا Enzyme بھی ہے جو غلط Nucleotide کی جگہ درست Nucleotide لگا دیتا ہے۔ یہ Enzyme ایک ایسی مشین ہیں جس کے پاس بے حد توانائی ہے۔

اپنی بالکل ٹھیک نقلیں بنانے کے علاوہ (جو دراصل موروثیت ہے) Nuclear DNA خلیے کو ان حرکات کے بارے میں ہدایات دیتا ہے جو غذا کے جسم کا حصہ بننے کے سلسلے میں ہوتی ہیں۔ یہ ایک اور Nucleic Acid کو ہموار کرتا ہے۔ جسے پیغام بر RNA کہتے ہیں۔ ان میں ہر ایک Extranuclear علاقے سے گزرتا ہے اور صحیح وقت اور صحیح مقام پر ایک Enzyme کی تعمیر کو کنٹرول کرتا ہے۔ جب یہ سب کچھ ہو چکتا ہے ایک واحد Enzyme سالمہ وجود میں آ جاتا ہے جو پھر خلیے میں ہونے والے کیمیائی عمل کے ایک مخصوص پہلو کے بارے میں ہدایات جاری کرنا شروع کر دیتا ہے۔

انسانی DNA ایک کئی بلین لمبی سیڑھی ہے۔ Nucleotide کے ممکنہ امتزاج،

Marfat.com

زیادہ تر مہمل ہوتے ہیں۔ وہ پروٹین کا مرکب بنا دیتے ہیں جو کوئی فائدہ مند عمل نہیں کرتے۔ نیوکلی اِک ایسڈ سالموں کی ایک بہت محدود تعداد حیات کی انسان جیسی پیچیدہ شکلوں کے لیے کار آمد ہے۔ اس کے باوجود Nucliec Acid کے کار آمد امتزاج (Combinations) کے ممکنات بے شمار ہیں۔ شاید اس سے بھی زیادہ جتنے اس کائنات میں الیکٹران اور پروٹون ہیں۔ اس طرح مختلف خصوصیات کے حامل افراد کی ممکنہ تعداد بھی اس سے کہیں زیادہ ہے۔ جتنے آج تک پیدا ہوئے ہین۔ انسانی نسل کی غیر دریافت شدہ صلاحیت بے حد زیادہ ہے۔ نیوکلی اِک ایسڈ کو جوڑنے کے ایسے بھی طریقے ہوں گے جو آج پیدا ہونے والے انسان سے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر سکیں۔ ہمارے کسی بھی مقرر کردہ معیار سے بہتر۔ کسی بھی ایسے انسان سے بہتر جو آج تک پیدا ہوا ہے۔ خوش قسمتی سے ہم ابھی تک "Nucleotides" کی نئی متبادل ترتیب بنانے کے قابل نہیں ہو سکے۔ جو متبادل انسان بنا سکیں۔ مستقبل میں شاید ہم نیو کلیوٹائیڈ کی ترتیب اپنی مرضی سے بنانے کے قابل ہو جائیں گے اور انسان میں وہ خصوصیات پیدا کر سکیں گے جنہیں ہم بہتر سمجھتے ہیں۔ یہ ایک ہوش اڑا دینے والا امکان ہے۔

ارتقاء، تبدیلی نوع اور انتخاب کے ذریعے آگے بڑھتا ہے۔ تبدیلی نوع Mutation (میوٹیشن) نقلیں بنانے کے دوران ہو سکتی ہے۔ مثلاً اگر Enzyme کوئی غلطی کر دے تو ---- لیکن وہ غلطی سے ہی کوئی غلطی کرتا ہے۔ تبدیلی نوع سورج سے خارج ہونیوالی الٹراوائیلٹ کرنوں Radio Activty اور فضا میں موجود مختلف کیمیکلز سے بھی ہو سکتی ہے۔ یہ تمام چیزیں نیوکلیوٹائیڈز کو تبدیل کر سکتی ہیں اور نیوکلی اِک ایسڈ کو گرہوں میں جکڑ سکتیں ہیں۔ اگر تبدیلی نوع کی شرح بہت زیادہ

ہو گی تو چار بلین سال کا ارتقائی اثاثہ ضائع ہو جائے گا۔ اگر اس کی شرح کم ہو گی تو آنے والے زمانے میں ماحول کی تبدیلی سے مطابقت پیدا کرنے والی حیات کی نئی شکلیں میسر نہیں ہوں گی۔ حیات کا ارتقاء تبدیلی نوع اور انتخاب کے درمیان بہت نازک توازن کا متقاضی ہے۔ جب یہ توازن قائم ہوتا ہے تو لاجواب تبدیلی نوع واقع ہوتی ہے۔

ایک واحد DNA نیوکلیوٹائیڈ میں تبدیلی پروٹین میں ایک واحد امائینو ایسڈ میں تبدیلی پیدا کرتی ہے۔ جس کی وہ DNA ہدایت دیتا ہے۔ یورپی نسل سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے سرخ خون کے خلیے گول ہوتے ہیں۔ افریقی نسل سے تعلق رکھنے والے کچھ لوگوں کے خون کے لال خلیے نئے چاند یا درانتی کی طرح نظر آتے ہیں۔ درانتی کی شکل کے خلیوں میں کم آکسیجن جمع کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے، چنانچہ یہ ایک طرح کا انیمیا (Animia) پیدا کرتے ہیں۔ وہ ملیریا کے خلاف سب سے زیادہ مدافعت کرنے والے خلیے بھی ہوتے ہیں۔ اس میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ مردہ ہونے کے مقابلے میں انیمک (Animac) ہونا زیادہ بہتر ہے۔ خون کے عمل پر اثر انداز ہونے والا یہ فرق جو سرخ خلیے کی تصویر تک میں واضح ہے' یہ فرق انسان کے مخصوص خلیے کے DNA کے تین بلین نیوکلیوٹائڈ میں سے صرف ایک میں تبدیلی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ہم ابھی تک دوسرے نیوکلیوٹائیڈ میں تبدیلی سے پیدا ہونے والے اثرات سے لاعلم ہیں۔

ہم انسان درختوں سے ذرا مختلف نظر آتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم دنیا کو درخت کے مقابلے میں مختلف نظر سے دیکھتے ہیں۔ لیکن بہت گہرائی میں سالماتی سطح پر ہم اور درخت یکساں ہیں۔ ہم دونوں موروثیت کے لیے نیوکلی اِک ایسڈ استعمال کرتے ہیں۔ ہم دونوں اپنے خلیوں کی کیمیا کو کنٹرول کرنے کے لیے پروٹین کے

Marfat.com

Enzymes کو استعمال کرتے ہیں۔ سب سے زیادہ اہم یہ کہ ہم دونوں Nucleic Acid کی اطلاعات کو پروٹین کی اطلاعات میں ترجمہ کرنے کے لیے ایک ہی لغت استعمال کرتے ہیں۔ جیسا کہ اس سیارے پر تمام حیات کرتی ہے۔ عام طور پر اس سالماتی مماثلت کی تشریح یہ ہے کہ ہم سب انسان، درخت، اودھ بلاؤ، سٹارفش، ہاتھی اور جھینگر سب اس سیارے کے ابتدائی دنوں میں ایک ہی ابتدائی حالت میں نمودار ہوئے ہیں تو پھر یہ مخصوص سالمے پیدا کیسے ہوئے۔

Cornell یونیورسٹی کی اپنی لیبارٹری میں ہم دوسری چیزوں کے علاوہ قبل از نباتیاتی حیات کی کیمیا Pre-biological organic chemistry پر بھی کام کرتے تھے۔ ہم زمین پر ابتدائی دور میں موجود ہائیڈروجن، پانی، امونیا، میتھین اور سلفائیڈ......... گیسوں کو ملاتے تھے۔ (جو آج بھی مشتری میں موجود ہیں اور تمام کائنات میں پھیلی ہوئی ہیں) اور انہیں Spark دیتے تھے یہ Spark روشنی کے ان جھماکوں کے مماثل ہوتے تھے جو آج بھی مشتری پر ہوتے ہیں اور زمین پر ابتدائی دور میں ہوتے تھے۔ جس برتن میں ہم یہ تجربات شروع کرتے تھے وہ شفاف ہوتا تھا اور یہ تمام گیسیں بھی نظر نہ آنے والی ہیں۔ دس منٹ Spark کے بعد ہم دیکھتے تھے کہ عجیب سے بھورے رنگ کے ذرات آہستہ آہستہ برتن کے اندر رینگ رہے ہیں۔ برتن کا اندرونی حصہ دھندلا جاتا ہے۔ اور گہرے براؤن رنگ کا مادہ اس پر چھا جاتا ہے۔ اگر ہم الٹراوائیلٹ روشنی استعمال کرتے جو اس وقت زمین پر موجود تھی تو بھی یہی نتیجہ نکلتا۔ یہ مادہ ایک انتہائی پیچیدہ حیاتیاتی سالموں سے لبریز تھا۔ جس میں پروٹین اور Nucleic Acid کے اجزاء بھی شامل تھے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حیات کا خمیر بڑی آسانی سے تیار ہو سکتا ہے۔ اسی طرح کے تجربات سب سے پہلے

Stanley Miller نے کیے تھے جو ایک کیمسٹ Harold uray کا شاگرد تھا۔ Urey کا کہنا تھا کہ گیسوں کو Spark دینا چاہیے۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ وہ ان تجربات سے کیا حاصل کرنا چاہتا ہے۔ Uray نے جواب دیا ''باٹلسائن (Beitslein)''...... یہ 28 جلدوں پر مشتمل جرمن زبان کی وہ کتاب ہے جس میں آج تک کے جانے ہوئے تمام حیاتیاتی سالموں کے نام لکھے ہوئے ہیں۔

کوئی توانائی کا سرچشمہ جو کیمیائی بندھن کو توڑ سکے، مل جائے تو زمین پر قدیم دور کی طرح صرف زیادہ مقدار میں موجود گیسوں کی مدد سے ہم حیات کی بنیادی اینٹیں پیدا کر سکتے ہیں لیکن ہمارے اس برتن میں حیات کی موسیقی کے چند سر ہیں حیات کا نغمہ نہیں ہے۔

حیات یقیناً اس امائنو ایسڈ (Amino Acid) سے زیادہ ہے جو پروٹین بناتا ہے اور Nucleotide سے بھی زیادہ جو Nucleic Acid بناتا ہے۔ لیکن ان تعمیری اینٹوں کو سالموں کی لمبی زنجیر میں ترتیب دینے کے سلسلے میں لیبارٹری میں کافی پیش رفت ہوئی ہے۔ قدیم زمین کے ماحول میں Amino Acid نے مل کر ایسے سالمے بنائے جو پروٹین سے ملتے جلتے تھے۔ ان میں سے کچھ کارآمد کیمیائی عمل کو کنٹرول کرتے تھے جیسا کہ Enzyme کرتے ہیں۔ Nucleotides نے مل کر چند درجن یونٹ لمبے Nucleic Acid کی شکل اختیار کر لی۔ مناسب ماحول میں چھوٹے Nucliec Acid ایک ٹسٹ ٹیوب میں خود اپنی ہم شکل نقلیں بنا سکتے ہیں۔

ابھی تک کوئی بھی، قدیم زمین کی گیسیں اور پانی .... اس طرح نہیں ملا سکا کہ کوئی چیز ٹیسٹ ٹیوب سے رینگتی ہوئی باہر آ جائے۔ زمین پر جانی ہوئی حیات کی سب

Marfat.com

سے چھوٹی شکل "Viroid" دس ہزار سے بھی کم ایٹم سے بنتی ہے۔ یہ پودوں میں مختلف قسم کی بیماریاں پیدا کرتا ہے اور شاید ابھی حال ہی میں سادہ کی بجائے زیادہ پیچیدہ حیات سے پیدا ہوا ہے۔ ابھی اس سے زیادہ مادی حیات کے بارے میں سوچنا مشکل ہے۔ Viruses کے برعکس Viroid خصوصاً Nucleic ایسڈ سے بنے ہیں جن پر پروٹین کی تہہ چڑھی ہوئی ہے۔ وہ RNA کے ایک دھاگے سے زیادہ نہیں ہیں جو لمبی یا گول شکل میں ہوتے ہیں۔ Viroids اتنے چھوٹے ہونے کے باوجود بہت تیزی سے بڑھتے ہیں کیونکہ یہ ان تھک اور سخت جان طفیلی جراثیم ہیں۔ Viruses کی طرح یہ اپنے سے بڑی اور ٹھیک چلتی ہوئی خلیے کی سالماتی مشین پر قبضہ کر لیتے ہیں اور خلیے بنانے والی فیکٹری کو Viroids بنانے والی فیکٹری میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

سب سے چھوٹی آزاد اور زندہ مخلوق (Pleuro pneumonica Like Organism) PPLO ایک ایسے ہی دوسرے خوردبینی درندے ہیں۔ یہ تقریباً 50 ملین ایٹم سے مل کر بنتے ہیں۔ اس طرح کی حیات جو زیادہ خود انحصاری پر مبنی ہے۔ Viroides اور Viruses سے زیادہ پیچیدہ بھی ہوتی ہے۔ آج زمین کا ماحول اس سادہ حیات کے لیے زیادہ سازگار نہیں ہے۔ انہیں زندہ رہنے کے لیے زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے اور شکار خوروں سے بھی زیادہ محتاط رہنا پڑتا تھا۔ ہمارے سیارے کی ابتدائی تاریخ میں جب سورج کی روشنی ہائیڈروجن سے پر ماحول میں لاتعداد نامیاتی سالمے بنا رہی تھی اس وقت سادہ، غیر تفصیلی حیات کے پاس کم ہی سہی لیکن پھر بھی کچھ چانس تھا۔ ابتدائی زندہ چیز شاید چند ہزار Nucleotides لمبی Viroids نما کوئی چیز ہو گی۔ ایسی چیز کو شروع سے بنانے کا کام شاید اس صدی کے آخر تک شروع ہو سکے گا۔ ابھی تک حیات کی ابتداء

Marfat.com

کے بارے میں مع Genetic Code کے بہت کچھ سمجھنا باقی ہے۔ لیکن ہم نے اس طرح کے تجربات تقریباً پچھلے تیس سال سے شروع کئے ہیں۔ قدرت کو ہم پر چار بلین سال کی سبقت حاصل ہے۔ مجموعی طور پر ہماری کارکردگی بھی کچھ بری نہیں ہے۔

ان تجربات میں کوئی بھی چیز زمین سے مخصوص نہیں ہے۔ ابتدائی گیس اور توانائی کے مخرج پوری کائنات میں یکساں ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ کائنات میں پھیلا ہوا نامیاتی مادہ اور شہاب ثاقب میں پائے جانے والے Amino Acid اس کیمیائی ردعمل کا نتیجہ ہوں جیسا کہ ہماری لیبارٹری کے تجربات میں ہوتا ہے۔ کچھ اس طرح کا کیمیائی عمل ملکی وے (Milky way) کہکشاں کی اربوں دنیاؤں میں بھی واقع ہوگا۔ کائنات حیات کے سالموں سے بھری پڑی ہے۔

لیکن اگر کسی سیارے پر حیات کی سالماتی کیمیا ویسی ہی ہے جیسی ہمارے سیارے پر تو بھی یہ امید کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس کی شکل بھی ہمارے سیارے کی مخلوق سے ملتی جلتی ہوگی۔ ذرا ہمارے سیارے پر حیات کی لاتعداد شکلوں کا تصور کیجئے جو سب کی سب ایک ہی سیارے پر ایک ہی طرح کے سالمات سے بنی ہیں دوسرے سیارے پر درندے اور سبزیاں شاید ہمارے سیارے سے بنیادی طور پر مختلف ہوں۔ مثلاً Bionuclar vision کے لیے دو آنکھیں۔ لیکن عمومی طور پر ارتقائی عمل کے اتفاقی کردار نے دوسرے سیارے کی مخلوق کو ایسی کسی بھی شکل سے مختلف بنایا ہوگا جتنی ہم جانتے ہیں۔

میں آپ کو نہیں بتا سکتا کہ کائناتی مخلوق کس شکل کی ہوگی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں صرف ایک طرح کی حیات سے واقف ہوں جیسی یہاں زمین پر ہے۔ لیکن کچھ سائنسی ناول لکھنے والوں اور آرٹسٹوں نے یہ تصور کیا ہے کہ دوسری حیات کس طرح کی ہوگی۔

Marfat.com

میں ان تصورات کے بارے میں مشکوک ہوں۔ لگتا ہے وہ حیات کی زیادہ تر ان ہی شکلوں پر انحصار کرتے ہیں جو ہم جانتے ہیں۔ حیات کی کوئی مخصوص شکل انفرادی اور غیر متوقع واقعات کے ایک لمبے سلسلے سے وجود میں آتی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کسی اور جگہ زندگی رینگنے والے جانوروں۔ کیڑے مکوڑوں یا انسانوں جیسی ہوگی۔ یا چھوٹی موٹی تبدیلیوں کے ساتھ سبز کھال، نوکدار کان اور Antena والی ہوگی۔ اگر آپ مجھے مجبور کریں تو میں حیات کی کچھ مختلف تصویر بنانے کی کوشش کرتا ہوں۔

مشتری گیس کا ایک دیو قامت سیارہ ہے۔ جس کی فضا میں ہائیڈروجن ہیلیئم۔ میتھین، پانی اور امونیا وافر مقدار میں موجود ہیں۔ اس کی کوئی ٹھوس سطح نہیں بلکہ گہرے بادلوں سے بھرا ہوا ماحول ہے اور نامیاتی سالمے آسمان سے من وسلویٰ کی طرح برس رہے ہیں۔ جیسا کہ ہماری لیبارٹری کے تجربے میں ہوتا ہے۔ ایسے سیارے پر حیات کے راستے میں کچھ رکاوٹیں حائل ہوں گی۔ فضا طوفان خیز ہے اور نیچے گہرائی میں بے حد گرمی۔ حیات کو محتاط رہنا پڑے گا کہ زیادہ نیچے جا کر جل بھن نہ جائے۔

یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اتنے مختلف سیارے پر بھی حیات ناممکن نہیں ہے.......... میرے ساتھ E.E.Salpeter نے کچھ اندازے لگائے ہیں۔ ظاہر ہے ہم یقین سے تو نہیں کہہ سکتے کہ وہاں حیات کس شکل کی ہوگی۔ ہم صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ طبیعات اور کیمیا کے قوانین کی حدود میں رہتے ہوئے کیا اس طرح کے سیارے پر حیات کا وجود ممکن ہے؟

اس طرح کے ماحول میں زندہ رہنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اس سے پہلے کہ آپ جل بھن جائیں آپ ایسی اولاد پیدا کریں جسے گیسوں کا نظام فضا کی بالائی اور ٹھنڈی جگہ لے جائے۔ اس طرح کی نامیات بہت چھوٹی ہوگی ہم انہیں Sinker کہتے

ہیں۔لیکن آپ Floater بھی ہو سکتے ہیں۔ بہت بڑے ہائیڈروجن کے غبارے جو بھاری گیسوں کو خارج کرتے رہتے ہیں اور صرف ہلکی گیسوں کو بچا کر رکھتے ہیں۔ یا ایک گرم ہوا کا ایسا غبارہ جو اندرونی گرمی کی وجہ سے اپنی لچک برقرار رکھتا ہے اور غذا سے حاصل ہونے والی توانائی استعمال کرتا ہے۔ Floater جتنا نیچے جائے گا اس کی لچک اسے اتنا ہی اوپر ٹھنڈے اور محفوظ علاقے میں جانے کے قابل بنا دے گی۔ ایک Floater شاید پہلے سے موجود نامیاتی سالمے کھاتا ہوگا یا پھر سورج اور ہوا کی مدد سے خود بناتا ہوگا جیسے ہماری زمین پر پودے کرتے ہیں۔ جتنا Floater بڑا ہوگا اتنا ہی چاق وچوبند ہوگا۔ Salpeter اور میرے تصور میں Floater ایک کلومیٹر لمبے چوڑے ہوں گے۔ اس وہیل مچھلی سے بے حد بڑے جو کبھی تھی۔ شاید شہروں کے برابر۔

ممکن ہے یہ Floater سیارے کی فضا میں گیس کے بادل چھوڑتے...... ادھر ادھر تیرنے کے قابل بھی ہوں۔ ایک راکٹ کی طرح۔ ہم نے انہیں بڑے بڑے ریوڑوں کی شکل میں تصور کیا ہے۔ جو نظر کی آخری حد تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے جسم پر پیٹرن بنے ہوئے ہیں جو خود کو چھپانے کا طریقہ ہے جس کا مطلب ہے کہ ان کے سامنے بھی خطرات ہیں۔ کیونکہ اس طرح کے ماحول میں کم سے کم ایک مسئلہ ضرور ہے۔ شکاری، شکاری پھرتیلے اور چالاک ہیں۔ وہ Floater کو ان کی خالص آکسیجن اور نامیاتی سالموں کی وجہ سے کھا جاتے ہیں۔ Sinker ارتقاء کر کے پہلے فلوٹر (Floater) بنے ہوں گے اور خود حرکت کرنے والے Floaters پہلے شکاری۔ وہاں بہت زیادہ شکاری نہیں ہو سکتے کیونکہ اگر وہ تمام Floaters کو کھا جائیں گے تو خود بھی ختم ہو جائیں گے۔

فزکس اور کیمسٹری اس طرح کی حیات کی اجازت دیتی ہے۔ آرٹ ان میں ایک

Marfat.com

کشش پیدا کرتا ہے۔ قدرت بہر حال ہمارے اندازوں کی پابند نہیں ہے۔ لیکن اگر ملکی وے کہکشاں میں اربوں آباد دنیائیں ہیں تو ان میں سے کچھ پر شاید Floaters, Sinkers اور شکاری بھی آباد ہوں گے۔ جنہیں ہمارے تصورات نے کیمسٹری اور طبیعات کے قوانین کی مدد سے تیار کیا ہے۔

Bioiogy (بائیولوجی) طبیعات کے مقابلے میں تاریخ سے زیادہ قریب ہے۔ حال کو سمجھنے کے لیے ماضی کو جاننا ضروری ہے اور وہ بھی بہت تفصیل سے۔ ابھی تک Biology کی کوئی پیش گوئی کرنے والی تھیوری نہیں ہے جیسے کہ تاریخ کی کوئی پیش گوئی کرنے والی تھیوری نہیں ہے۔ وجوہات ایک ہی جیسی ہیں۔ دونوں موضوعات ابھی تک ہمارے لیے بہت ہی پیچیدہ ہیں۔ لیکن ہم دوسرے لوگوں کو جان کر خود کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ کسی اور دنیا کی حیات کا مشاہدہ خواہ وہ کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو، Biology میں انقلاب بپا کر دے گا۔ پہلی بار ماہر جسمیات کو معلوم ہوگا کہ کتنی دوسری قسموں اور شکلوں کی حیات ممکن ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ کائنات میں کسی اور جگہ حیات کی تلاش اہم ہے تو ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ اسے تلاش کرنا آسان ہے بلکہ صرف اتنا ہے کہ وہ تلاش کیے جانے کے قابل ہے۔

ہم نے ابھی تک صرف ایک چھوٹی سی دنیا پر حیات کی آواز سنی ہے۔ لیکن آخر کار ہم نے کائناتی نغمے میں دوسری آوازوں کو سننے کی ابتداء کر دی ہے۔''

(کائنات (Cosmos) از کارل ساگان۔ ترجمہ منصور سعید)

Marfat.com

نظریہ ارتقاء پر سیر حاصل گفتگو

یہ بہت دلچسپ موضوع ہے۔ اب تک خاصی قد آور شخصیات نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور اپنا اپنا نقطۂ نظر بیان کیا ہے۔ بڑے بڑے جرنیل فلسفیوں اور جغادری دانشوروں نے ہمیشہ سے اس موضوع کو اپنے میدان تحقیق میں صف اول پر رکھا۔ عقل و شعور کے آغاز کے ساتھ ہی اس کائنات کی پیدائش اور زندگی کے ارتقاء پر غور وفکر شروع ہو گیا تھا۔ لیکن نظریہ ارتقاء ایک نظریہ کے طور پر اس وقت دنیا کے سامنے آیا جب ''چارلس ڈارون'' نے اپنی کتاب "The origine of species" لکھی۔ ڈارون سے بہت پہلے ہزاروں لوگوں نے اس نظریہ پر بے شمار تحقیقات کیں۔ جو وقت کے ساتھ ساتھ مختلف انداز میں انسانوں کے سامنے پیش کی جاتی رہیں۔ عام معنوں میں نظریہ ارتقاء انسان کی پیدائش یعنی پہلے انسان کی پیدائش کے حوالے سے مشہور ہے۔ لیکن انسان کی پیدائش فی الحقیقت اس نظریہ کی ایک چھوٹی سی شاخ ہے۔ یہ ایک بہت وسیع نظریہ ہے۔ جو ازل سے ابد تک یوں پھیلا ہوا ہے کہ سلسلہ در سلسلہ انسان کائنات کی ساری کہانی پر بہت اچھی طرح سے غور کر سکتا ہے۔ یہاں تک کہ آخرت کو سمجھنے کے لیے جس قدر مدلل اور قابل عمل مواد نظریہ ارتقاء سے حاصل ہوتا ہے اور کہیں سے حاصل نہیں ہوتا۔ اس نظریہ کے مخالفین کی تعداد ہر دور میں زیادہ رہی ہے۔ لیکن فی زمانہ بڑی تیزی کے ساتھ نظریہ ارتقاء کو سمجھنے والے افراد کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ دراصل اس نظریہ کی بدنامی اور بری شہرت محض اس وجہ سے ہے کہ بعض نادان اپنے آپ کو ارتقاء کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مخلوق کہتے

ہوئے اپنی توہین محسوس کرتے ہیں۔ پاکستان کے ایک بہت بڑے مذہبی سکالر نے ''ڈاکٹر عبدالودود'' کی کتاب.......... ''مظاہر فطرت اور قرآن پر''.......... تبصرہ کرتے ہوئے کہا..........

''وہ ہوں گے بندروں کی اولاد! ہم تو نہیں ہیں۔''

یہ ایک جاہلانہ روش ہے۔ دلیل کے بغیر کسی بھی دعوے کا رد ایک جاہل ہی پیش کر سکتا ہے۔ صرف ہمارے ہاں ہی نہیں، مغربی ممالک میں بھی نظریہ ارتقاء کے مخالفین یہی زبان بولتے ہیں۔ ہم اگر سستی زبان بولنے والے معترضین کو نظر انداز بھی کر دیں تو بھی ہزاروں ایسے دانشور اور بعض سائنسدان ہیں جو نظریہ ارتقاء کو جھٹلاتے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم ایسے ہی افراد کے اعتراضات پر غور کریں۔ ہماری زندگی میں یہ بات بہت اہمیت رکھتی ہے کہ:

ہم کس طرح پیدا ہوئے؟

ہماری آخرت کا بہت گہرا تعلق.......... اس سوال کے ساتھ ہے۔ وہ کیوں؟

..........اس لیے کہ قرآن حکیم نے ہمیشہ اس سوال کا یہی جواب دیا ہے۔ جب بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا کہ مر کر دوبارہ زندہ کیسے ہوں گے تو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے ہمیشہ یہی فرمایا۔

''ان سے کہہ دو، جیسے تمہیں پہلے پیدا کیا گیا۔''

ذرا ایک نظر اس سوال و جواب پر ڈالیے اور خود بتایئے کہ کیا آخرت کا یقین حاصل کرنے کے لیے اپنی پیدائش کا علم حاصل کرنا لازمی نہیں کیونکہ قرآن سے جب بھی پوچھا جاتا ہے کہ مر کر زندہ کیسے ہوں گے تو وہ یہی جواب دیتا ہے جیسے تم پہلے زندہ کیے گئے۔ اب یہ تو ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم اپنے پیدا کیے جانے کے عمل پر غور کریں۔

Marfat.com

جس طرح دنیا کی زندگی سلسلہ ارتقاء کا ایک حصہ ہے، بعینہٖ اسی طرح آخرت کی زندگی بھی اسی سلسلے کا اگلا حصہ ہے۔ چنانچہ اگر ہمارے پاس کوئی ذریعہ ہے کہ ہم آخرت کا قلبی یقین حاصل کریں تو وہ یہی کہ ہم نظریۂ ارتقاء کو اچھی طرح سے سمجھیں۔ یہ بہت آسان ہے۔ ایک سیدھا سیدھا راستہ جس میں کوئی پیچیدگی، کوئی الجھاؤ اور کوئی رکاوٹ نہیں۔ جو ازل اور ابد کی دیوار سے پار دیکھنے کی ہمت پیدا کرتا اور انسان کو آگے سے آگے بڑھنے کی دعوت دیتا ہے۔

انسان کی پیدائش کے بارے میں کئی نظریات پائے جاتے ہیں۔ جنہیں زمین پر بسنے والے انسانوں نے ہزاروں سال کی محنت سے تیار کیا۔ مختلف اقوام اور ممالک میں جس قدر بھی نظریات انسان کی پیدائش سے متعلق پائے جاتے ہیں۔ ان سب کی ابتداء بہر حال ایک جیسی ہی ہے۔ عیسائیوں کی مقدس کتاب بائبل کے علاوہ بھی بہت سی قدیم کتابوں میں ....جن میں ہندوستانی ویدیں یا یونانی تاریخیں شامل ہیں۔ تخلیق آدم کا قصہ تقریباً ایک جیسا ہی ہے۔ قرآن حکیم نے اس موضوع کو بے پناہ اہمیت دی۔ چنانچہ قرآن کی کوئی سورۃ اس قضیے سے خالی نہیں۔ ہم جب عام انسان کی جگہ پر رہ کر سوچتے ہیں، تب بھی ہم یہی دیکھتے ہین کہ عام انسان کے تمام عقائد کی بنیاد اس کے نظریہ تخلیق پر ہوتی ہے۔ یعنی تخلیق آدم کے بارے مین وہ کس قسم کے نظریے کا مالک ہے۔

علامہ اقبالؒ نے زندگی بھر اس مقدمے پر کام کیا اور قرآن وحدیث اور سائنس کی روشنی میں بہتر سے بہتر تصور قائم کرنے کی کوشش۔ خصوصاً آپ نے اپنی آخری تصنیف یعنی ''مدراس'' والے خطبات میں اس تصور کی تمام تر تفاصیل بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کی۔

Marfat.com

المیہ یہ ہے کہ جب کبھی کسی شخص کی زبان پر نظریۂ ارتقاء کے الفاظ آتے ہیں تو مذہبی حلقہ کی طرف سے ڈارون ازم کا الزام فوری طور پر عائد کر دیا جاتا ہے۔ بے شک ڈارون نے اس موضوع پر بڑی باریک بینی سے کام کیا۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ وہ حقیقت کی تہہ تک نہ پہنچ سکا۔ اس کا نظریۂ ارتقاء ہزار دلائل سے رد کیا جا سکتا ہے۔ وہ ایک مبہم اور نامکمل نظریہ ہے۔ لیکن ہمیں لفظ ارتقاء سے برگشتہ نہیں ہو جانا چاہیے۔ کیونکہ محض کسی لفظ کا استعمال کسی غلط نظریے سے الحاق کا ثبوت نہیں ہوتا۔ آپ چاہیں تو ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کے مقابلہ میں اسلامی نظریہ کو ''نظریۂ ارتفاع'' کا نام دے دیں۔ معنوی اعتبار سے یہ بالکل درست ہے۔ یہ اسلامی نظریۂ ارتقاء کے لیے ایک خالص قرآنی اصطلاح ہوگی۔ جیسا کہ ''ورفعنا لک ذکرک'' یا حضرت عیسیٰؑ کے ''رفع'' سے ثابت ہے۔

لیکن اس لفظ کا استعمال اصل مقدمے کی اہمیت کو کم کر دیتا ہے۔ ایک طرح سے علامہ اقبالؒ کا نظریہ بھی ''نظریۂ ارتفاع'' ہی ہے۔ بہرحال اس مضمون میں ہم انسان کی پیدائش پر موجود تمام نظریات پر خوب بحث کرنے والے ہیں۔

سب سے پہلے ہمیں ''نظریۂ مخصوص تخلیق'' پر نظر ڈالنی ہوگی۔ یہ انگریزی میں "Special Creation" کے نام سے مشہور ہے۔ سب سے پہلے اس پر نظر ڈالنے کی وجہ یہ ہے کہ تاریخی اعتبار سے یہی نظریہ ہی سب تصورات پر مقدم ہے۔ انسان نے سب سے پہلے اپنی اولین پیدائش کے بارے میں یہی نظریہ اختیار کیا۔ اس نظریے کی رو سے جب خدا نے زمین و آسمان، نباتات اور چرند پرند تخلیق کر لیے تو اس نے انسان کو بنانے کا فیصلہ کیا۔ تب خدا نے زمین کی مٹی لے کر ایک ایسا مجسمہ بنایا جس کی دو ٹانگیں اور دو بازو تھے۔ اس مجسمے میں اللہ نے اپنی روح ڈال دی۔ تو اس میں

Marfat.com

جان پڑ گئی اور وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ دوسرے جانوروں سے مختلف تھا اور دو پاؤں پر چلتا تھا۔ جب یہ جاندار، اداس ہوا تو اس کے لیے اس کا ایک ساتھی پیدا کیا گیا۔ اس کی ایک پسلی میں سے عورت کو نکالا گیا جو اس کی مونس و غم خوار بنی۔ ان دونوں کا نام آدم اور حوا تھا۔ خدا نے ان کو جنت میں رکھا۔ جہاں نہریں بہتی تھیں اور اشیائے خورد و نوش کی فراوانی تھی، ان دونوں کے بدن پر لباس نہیں تھا۔ جنت کے درختوں میں ایک درخت تھا۔ جس کا پھل کھانے سے خدا نے ان دونوں کو منع کیا تھا۔ لیکن شیطان کے بہکانے پر ان دونوں نے وہ پھل کھایا اور خدا کی نافرمانی کی۔ تب خدا نے آدم اور حوا کو جنت سے نکال دیا۔ وہ زمین پر بھیج دیے گئے جہاں ان سے نسل پیدا ہوئی اور ساری زمین انسانوں سے بھر گئی۔

یہ ہے نظریۂ مخصوص تخلیق! جو تقریباً تمام مذاہب اور تمام اقوام میں ہلکی پھلکی تبدیلی کے ساتھ اسی طرح رائج ہے۔ خود مسلمانوں میں بھی یہی نظریہ سب سے زیادہ مقبول ہے۔ مسلمانوں سے پہلے توریت، زبور اور انجیل نے بھی کچھ ایسی روایات پیش کیں جن سے بظاہر نظریۂ مخصوص تخلیق ہی کی تائید ہوتی ہے۔ عیسائیوں اور یہودیوں کی مقدس کتاب کا آغاز ہی تخلیق کائنات اور پھر تخلیق آدم سے ہوتا ہے۔ ثبوت کے طور پر بائبل کی مندرجہ ذیل آیات غور سے ملاحظہ فرمائیے:

> ''خدا نے ابتداء میں زمین و آسمان کو پیدا کیا اور زمین ویران و سنسان تھی اور گہراؤ کے اوپر اندھیرا تھا اور خدا کی روح پانی کی سطح پر جنبش کرتی تھی اور خدا نے کہا کہ روشنی ہو جا اور روشنی ہو گئی اور خدا نے دیکھا کہ روشنی اچھی ہے اور خدا نے روشنی کو تاریکی سے جدا کیا اور خدا نے روشنی کو تو دن کہا اور تاریکی کو رات اور

Marfat.com

شام ہوئی اور صبح ہوئی۔ سو پہلا دن ہوا۔

اور خدا نے کہا کہ پانیوں کے درمیان فضا ہو تاکہ پانی پانی سے جدا ہو جائے۔ پس خدا نے فضا کو بنایا اور فضا کے نیچے کے پانی کو فضا کے اوپر کے پانی سے جدا کیا اور ایسا ہی ہوا اور خدا نے فضا کو آسمان کہا اور شام ہوئی اور صبح ہوئی۔ سو دوسرا دن ہوا۔

اور خدا نے کہا کہ آسمان کے نیچے کا پانی ایک جگہ جمع ہو کر خشکی نظر آئے اور ایسا ہی ہوا اور خدا نے خشکی کو زمین کہا اور جو پانی جمع ہو گیا تھا اس کو سمندر اور خدا نے دیکھا کہ اچھا ہے اور خدا نے کہا کہ زمین گھاس اور بیج دار بوٹیوں کو اور پھلدار درختوں کو جو اپنی اپنی جنس کے موافق پھلیں اور جو زمین پر اپنے آپ ہی بیج رکھیں اگائے اور ایسا ہی ہوا۔ تب زمین نے گھاس اور بوٹیوں کو جو اپنی اپنی جنس کے موافق بیج رکھیں اور پھلدار درختوں کو جن کے بیج ان کی جنس کے موافق ان میں ہیں........ اگایا اور خدا نے دیکھا کہ اچھا ہے اور شام ہوئی اور صبح ہوئی۔ سو تیسرا دن ہوا۔

اور خدا نے کہا کہ فلک پر نیر ہوں کہ دن کو رات سے الگ کریں اور وہ نشانوں اور زمانوں اور دنوں اور برسوں کے امتیاز کے لیے ہوں اور وہ فلک پر انوار کے لیے ہوں کہ زمین پر روشنی ڈالیں اور ایسا ہی ہوا۔ سو خدا نے دو بڑے نیر بنائے۔ ایک نیر اکبر کہ دن پر حکم کرے اور ایک نیر اصغر کہ رات پر حکم کرے اور اس نے ستاروں کو بھی بنایا اور خدا نے ان کو فلک پر رکھا کہ زمین

Marfat.com

پر روشنی ڈالیں اور دن پر اور رات پر حکم کریں اور اجالے کو اندھیرے سے جدا کریں اور خدا نے دیکھا کہ اچھا ہے اور شام ہوئی اور صبح ہوئی، سو چوتھا دن ہوا۔

اور خدا نے کہا کہ پانی جانداروں کو کثرت سے پیدا کرے اور پرندے زمین کے اوپر فضا میں اڑیں اور خدا نے بڑے بڑے دریائی جانوروں کو اور ہر قسم کے جاندار کو جو پانی سے بکثرت پیدا ہوئے تھے ان کی جنس کے موافق اور ہر قسم کے پرندوں کو ان کی جنس کے موافق پیدا کیا اور خدا نے دیکھا کہ اچھا ہے اور خدا نے ان کو یہ کہہ کر برکت دی کہ پھلو اور بڑھو اور ان سمندروں کے پانی کو بھر دو اور پرندے زمین پر بہت بڑھ جائیں اور شام ہوئی اور صبح ہوئی، سو پانچواں دن ہوا۔

اور خدا نے کہا کہ زمینی جانداروں کو ان کی جنس کے موافق، چوپائے اور رینگنے والے جانداروں اور جنگلی جانور، ان کی جنس کے موافق پیدا کرے اور ایسا ہی ہوا اور خدا نے جنگلی جانوروں اور چوپایوں کو ان کی جنس کے موافق اور زمین کے رینگنے والے جانداروں کو ان کی جنس کے موافق بنایا اور خدا نے دیکھا کہ اچھا ہے۔ پھر خدا نے کہا کہ ہم انسان کو اپنی صورت پر اپنی شبیہ کی مانند بنائیں اور وہ سمندر کی مچھلیوں اور آسمان کے پرندوں اور چوپایوں اور تمام زمین اور سب جانداروں پر جو زمین پر رینگتے ہیں اختیار رکھیں اور خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ خدا

Marfat.com

کی صورت پر اس کو پیدا کیا۔ نر و ناری، ان کو پیدا کیا اور خدا نے ان کو برکت دی اور کہا کہ پھلو اور بڑھو اور زمین کو معمور و محکوم کرو اور سمندر کی مچھلیوں اور ہوا کے پرندوں اور کل جانوروں پر جو زمین پر چلتے ہیں اختیار رکھو اور خدا نے کہا دیکھو میں تمام روی زمین کی کل بیج دار سبزی اور ہر درخت جس میں اس کا بیج دار پھل ہو تم کو دیتا ہوں۔ یہ تمہارے کھانے کو ہوں اور زمین کے کل جانوروں کے لیے اور ہوا کے کل پرندوں کے لیے اور ان سب کے لیے جو زمین پر رینگنے والے ہیں جن میں زندگی کا دم ہے، کل ہری بوٹیاں کھانے کو دیتا ہوں اور ایسا ہی ہوا اور خدا نے سب پر جو اس نے بنایا تھا نظر کی اور دیکھا کہ بہت اچھا ہے اور شام ہوئی اور صبح ہوئی' سو چھٹا دن ہوا۔

سو آسمان اور زمین اور ان کے کل لشکر کا بنانا ختم ہوا اور خداوند نے اپنے کام کو جسے وہ کرتا تھا ساتویں دن ختم کیا اور اپنے سارے کام سے جسے وہ کر رہا تھا ساتویں دن فارغ ہوا اور خدا نے ساتویں دن کو برکت دی اور اسے مقدس ٹھہرایا کیونکہ اس میں خدا ساری کائنات سے جسے اس نے پیدا کیا اور بنایا فارغ ہوا۔

یہ ہے آسمان و زمین کی پیدائش جب وہ خلق ہوئے جس دن خداوند نے زمین و آسمان کو بنایا اور زمین پر اب تک کھیت کا کوئی پودا نہ تھا اور نہ میدان کی کوئی سبزی اب تک اگی تھی کیونکہ خداوند

Marfat.com

نے زمین پر پانی نہیں برسایا تھا اور نہ زمین جوتنے کو کوئی انسان تھا۔ بلکہ زمین سے کہر اٹھتی تھی اور تمام روی زمین کو سیراب کرتی تھی اور خداوند نے زمین کی مٹی سے انسان کو بنایا اور اس کے نتھنوں میں زندگی کا دم پھونکا تو انسان جیتی جان ہوا۔

اور خدا نے مشرق کی طرف عدن میں ایک باغ لگایا اور انسان کو جسے اس نے بنایا تھا وہاں رکھا اور خداوند خدا نے ہر درخت کو جو دیکھنے میں خوشنما اور کھانے کے لیے اچھا تھا زمین سے اگایا اور باغ کے بیچ میں حیات کا درخت اور نیک و بد کی پہچان کا درخت بھی لگایا اور عدن سے ایک دریا باغ کو سیراب کرنے کو نکلا اور وہاں سے چار ندیوں میں تقسیم ہوا۔ پہلی کا نام فیسون ہے جو حویلہ کی ساری زمین کو جہاں سونا ہوتا ہے گھیرے ہوئے ہے اور اس کا سونا چوکھا ہے اور وہاں موتی اور سنگ سلیمانی بھی ہیں اور دوسری ندی کا نام جیحون ہے جو کوش کی ساری زمین کو گھیرے ہوئے ہے اور تیسری ندی کا نام دجلہ ہے جو اسور کے مشرق کو جاتی ہے اور چوتھی ندی کا نام فرات ہے اور خداوند خدا نے آدم کو لے کر باغ عدن میں رکھا کہ اس کی باغبانی اور نگہبانی کرے اور خداوند خدا نے آدم کو حکم دیا اور کہا کہ تو باغ کے ہر درخت کا پھل بے روک ٹوک کھا سکتا ہے لیکن نیک و بد کی پہچان کے درخت کو کبھی نہ کھانا کیونکہ جس روز تو نے اس میں سے کھایا تو مرا۔

اور خداوند خدا نے کہا کہ آدم کا اکیلا رہنا اچھا نہیں۔ میں اس کے

Marfat.com

لیے ایک مددگار اس کی مانند بناؤں گا اور خداوند خدا نے کل دشتی جانور اور ہوا کے کل پرندے مٹی سے بنائے اور ان کو آدم کے پاس لایا کہ دیکھے کہ وہ ان کے کیا نام رکھتا ہے اور آدم نے جس جانور کو جو کہا وہی اس کا نام ٹھہرا اور آدم نے کل چوپایوں ہوا کے پرندوں اور کل دشتی جانوروں کے نام رکھے پر آدم کے لیے کوئی مددگار اس کی مانند نہ ملا اور خداوند خدا نے آدم پر گہری نیند بھیجی اور وہ سو گیا اور اس نے اس کی پسلیوں میں سے ایک کو نکال لیا اور اس کی جگہ گوشت بھر دیا اور خداوند خدا نے اس پسلی سے جو اس نے آدم میں سے نکالی تھی ایک عورت بنا کر اسے آدم کے پاس لایا اور آدم نے کہا یہ تو اب میری ہڈیوں میں سے ہڈی اور میرے گوشت میں سے گوشت ہے اس لئے وہ ناری کہلائے گی کیونکہ وہ نر سے نکالی گئی۔ اس واسطے مرد اپنے ماں باپ کو چھوڑ دے گا اور اپنی بیوی سے ملا رہے گا اور وہ ایک تن ہوں گے اور آدم اور اس کی بیوی دونوں ننگے تھے اور شرماتے نہ تھے۔

اور سانپ کل دشتی جانوروں سے جن کو خداوند خدا نے بنایا تھا چالاک تھا اور اس نے عورت سے کہا کیا واقعی خدا نے کہا ہے کہ باغ کے کسی درخت کا پھل تم نہ کھانا؟ عورت نے سانپ سے کہا کہ باغ کے درختوں کا پھل تو ہم کھاتے ہیں۔ پر جو درخت باغ کے بیچ میں ہے اس کے پھل کی بابت خدا نے کہا ہے کہ تم نہ تو اسے کھانا اور نہ چھونا ورنہ مر جاؤ گے۔ تب سانپ نے عورت سے

Marfat.com

کہا کہ تم ہرگز نہ مرو گے۔ بلکہ خدا جانتا ہے کہ جس دن تم اسے کھاؤ گے تمہاری آنکھ کھل جائے گی اور تم خدا کی مانند نیک و بد کو جاننے والے بن جاؤ گے۔ عورت نے جو دیکھا کہ وہ درخت کھانے کے لیے اچھا اور آنکھوں کو خوشنما معلوم ہوتا ہے اور عقل بخشنے کے لیے خوب ہے تو اس کے پھل میں سے لیا اور کھایا اور اپنے شوہر کو بھی دیا اور اس نے کھایا۔ تب دونوں کی آنکھیں کھل گئیں اور ان کو معلوم ہوا کہ وہ ننگے ہیں اور انہوں نے انجیر کے پتوں کو سی کر اپنے لیے لنگیاں بنائیں اور انہوں نے خداوند خدا کی آواز جو ٹھنڈے وقت باغ میں پھرتا تھا سنی اور آدم اور اس کی بیوی نے اپنے آپ کو خداوند خدا کے حضور سے باغ کے درختوں میں چھپایا۔ تب خداوند خدا نے آدم کو پکارا اور اس نے کہا کہ تو کہاں ہے؟ اس نے کہا کہ میں نے باغ میں تیری آواز سنی اور ڈرا کیونکہ میں ننگا تھا اور میں نے اپنے آپ کو چھپایا۔ اس نے کہا تجھے کس نے بتایا کہ تو ننگا ہے؟ کیا تو نے اس درخت کا پھل کھایا جس کی بابت میں نے تجھ کو حکم دیا تھا کہ اسے نہ کھانا؟ آدم نے کہا کہ جس عورت کو تو نے میرے ساتھ کیا ہے اس نے مجھے اس درخت کا پھل دیا اور میں نے کھایا۔ تب خداوند خدا نے عورت سے کہا یہ تو نے کیا کیا؟ عورت نے کہا کہ سانپ نے مجھ کو بہکایا تو میں نے کھایا اور خداوند خدا نے سانپ سے کہا اس لیے کہ تو نے یہ کیا تو سب چوپایوں اور دشتی جانوروں میں ملعون ٹھہرا۔ تو پیٹ

کے بل چلے گا اور اپنی عمر بھر خاک چاٹے گا اور میں تیرے اور عورت کے درمیان اور تیری نسل اور عورت کی نسل کے درمیان عداوت ڈالوں گا۔ وہ تیرے سر کو کچلے گا اور تو اس کو ایڑھی پہ کاٹے گا۔

پھر اس نے عورت سے کہا کہ میں تیرے دردِ حمل کو بہت بڑھاؤں گا۔ تو درد کے ساتھ بچے جنے گی اور تیری رغبت اپنے شوہر کی طرف ہوگی اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا۔ اور آدم سے اس نے کہا چونکہ تو نے اپنی بیوی کی بات مانی اور اس درخت کا پھل کھایا جس کی بابت میں نے تجھے حکم دیا تھا کہ اسے نہ کھانا اس لیے زمین تیرے سبب سے لعنتی ہوئی۔ مشقت کے ساتھ تو اپنی عمر بھر اس کی پیداوار کھائیگا اور وہ تیرے لیے کانٹے اور اونٹ کٹارے اگائے گی اور تو کھیت کی سبزی کھائے گا۔ تو اپنے منہ کے پسینے کی روٹی کھائے گا جب تک کہ زمین میں تو پھر لوٹ نہ جائے۔ اس لیے کہ تو اس سے نکالا گیا ہے کیونکہ تو خاک ہے اور خاک میں پھر لوٹ جائے گا اور آدم نے اپنی بیوی کا نام حوا رکھا۔ اس لیے کہ وہ سب زندوں کی ماں ہے اور خداوند خدا نے آدم اور اس کی بیوی کے واسطے چمڑے کے کرتے بنا کر ان کو پہنائے۔

اور خداوند خدا نے کہا دیکھو! انسان نیک و بد کی پہچان میں، ہم میں سے ایک کی مانند ہو گیا ہے۔ اب کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنا ہاتھ بڑھائے اور حیات کے درخت سے بھی کچھ لے کر کھائے اور

ہمیشہ جیتا رہے۔ اس لیے خداوند خدا نے اس کو باغ عدن سے باہر کر دیا۔ تا کہ وہ اس زمین کی، جس سے وہ لیا گیا تھا کھیتی کرے۔ چنانچہ اس نے آدم کو نکال دیا اور باغ عدن کے مشرق کی طرف کروبیوں کو اور چوگرد گھومنے والی شعلہ زن تلوار کو رکھا کہ وہ زندگی کے درخت کی راہ کی حفاظت کریں۔''

(عہد نامہ قدیم، کتاب پیدائش، باب 1 تا 4 تک)

آپ نے ملاحظہ فرمایا قدیم ترین آسمانی صحیفہ یعنی عہد نامہ قدیم آدم کی پیدائش کا وہی قصہ بیان کرتا ہے جو ہم نے بچپن میں سنا تھا۔ ماہرین ارتقاء نے اس قصے کو باطل قرار دیا ہے۔ حالانکہ اسے ہمیشہ ارتقاء کا قدیم ترین تمثیلی نظریہ ہی سمجھا جانا چاہیے تھا۔ صرف بائبل میں ہی نہیں، دنیا کے ہر مذہب اور ہر ملک میں تھوڑی تھوڑی تبدیلیوں کے ساتھ یہی تمثیل بیان کی گئی ہے۔ قدیم آثاروں کے ڈھونڈنے والوں کو مختلف علاقوں سے بہت سے ایسے کتبے ملے ہیں جن پر اسی تمثیل کی تصویریں بنائی گئی ہیں۔ قرآن کریم نے بھی اس تمثیل کو بیان کیا۔ لیکن قرآن کریم کا انداز تمام قصوں کی نسبت زیادہ فلسفیانہ لیکن زیادہ واضح ہے............ دراصل ماضی قدیم کی کہانیاں جو ہزاروں سالوں پر محیط ہیں بیان کرنے کے لیے اسی تمثیل کا ہی سہارا لیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ہم ایک چھوٹی سی مثال پر غور کرتے ہیں۔

ہم فرعون کو جانتے ہیں یہ ایک بادشاہ تھا جس نے موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو ستایا اور موسیٰ نے اس سے ٹکر لی۔ کیا ہمیں یہ معلوم ہے کہ فرعون کوئی ایک شخص نہیں تھا؟ فرعون تو اس عہدے کا نام تھا جس عہدے پر مصر کا بادشاہ موجود ہوتا۔ کیا فرعون دو تھے یا چار، پانچ .... مصر کے فرعونوں کا سلسلہ تین ہزار سال تک جاری رہا۔ کسی فرعون

Marfat.com

کے ساتھ کوئی کہانی بیتی، کسی کے ساتھ کوئی۔ صدیوں پہلے جب حضرت یوسف علیہ السلام مصر کے بازار میں فروخت ہونے کے لیے گئے تھے تب بھی مصر کے حکمران کا نام فرعون ہی تھا۔ لیکن جب ہم عام انداز میں محو گفتگو ہوتے ہیں تو فرعون کو کہانی کے محض ایک کردار کے طور پر لیتے ہیں۔ حالانکہ یہ تین ہزار سال پر محیط ایک طویل سلسلے کا نام ہے۔

ایران کی تاریخ اٹھا کر دیکھیے! آپ کو ایک ہی نام کے کئی کئی حکمران نظر آئیں گے۔ جو نسل در نسل بادشاہ بنتے اور ایک ہی طرز کی حکومت کرتے رہے۔ مشینیں تو تھی نہیں نہ ہی مواصلات کا کوئی سائنسی نظام تھا جس سے دنیا میں تیزی سے ترقی ہوتی۔ ہر چیز جیسی ہوتی تھی صدیوں تک ویسی ہی رہتی تھی۔ نہ علوم، نہ مدرسے، نہ کتابیں، نہ کمپیوٹر۔ ایک ایک بادشاہ سو سو سال جیتا۔ لیکن حالات پوری صدی میں ایک جیسے ہی رہتے۔ بادشاہوں کے بعد بادشاہ آتے جاتے اور صدیوں پر صدیاں بیتتی چلی جاتیں اور حالات ایک جیسے ہی رہتے۔ یہاں تک کہ بادشاہوں کے نام بھی ایک جیسے ہوتے۔ ایران کے ایک بادشاہ ''ضحاک'' یا ''جمشید'' کو ہزار ہزار سال کی عمر کا حکمران مانا جاتا ہے۔ ''ضحاک'' نے ہزار سال حکومت کی اور ''جمشید'' نے سات سو سال۔ اس کا کیا مطلب ہے؟......... ماسوائے اس کے' اس کا کیا مطلب ہوسکتا ہے کہ ضحاک ہو یا جمشید یا فراعین مصر......... یہ دراصل بادشاہتوں کے کسی نہ کسی سلسلے کا نام ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں، میں اپنی رائے محفوظ رکھتا ہوں۔ البتہ اتنا عرض کرتا ہوں کہ نوح بھی انبیاء کے ایک سلسلے کا نام ہے، جو ساڑھے نو سو سال تک ایک ہی قوم کے سامنے تبلیغ کرتا رہا۔ اُن میں ایک حضرت نوح علیہ السلام بھی ضرور ہوں گے' جن کے زمانے میں طوفان آیا۔ بہر حال اس گفتگو کا مقصود یہ تھا کہ تمثیلی انداز

Marfat.com

میں بیان کیے گئے قدیم قصوں کی حکمت سمجھی جانی چاہیے۔اب ذرا ہندوستان میں نظر دوڑائیے! ہندوؤں کی مذہبی کتابیں ہیں ''رامائن، گیتا اور مہا بھارت'' وغیرہ۔ رام کا باپ ''دسرتھ'' یا ''مہا بھارت'' کے کردار جنھوں نے کئی کئی سو سال کی عمریں پائیں، کیا تھے؟ رامائن اٹھا کر دیکھیے! صاف پتا چل جائے گا۔ یہ سلسلے تھے، ایسے سلسلے جنھوں نے ایک جیسا دور گزارا۔ اس لیے تمثیلی قصوں میں کسی ایک نام سے مشہور ہو گئے۔

قدیم زمانے میں لکھنے پڑھنے کا فن رائج نہیں تھا۔ آثار قدیمہ کے ماہرین قریہ قریہ گھوم کر پرانی چیزیں اکٹھی کرتے اور انسانی تاریخ کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ دنیا بھر کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں آثار قدیمہ پر تحقیقات کے لیے خصوصی ادارے قائم ہیں۔ ماہرین علوم نے قدیم تاریخ کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے۔

(۱) زمانۂ قبل از تاریخ (یہ وہ زمانہ ہے جب انسان غاروں میں رہتا تھا)

(۲) زمانۂ تاریخ (یہ وہ زمانہ ہے جب انسان نے معاشرتی زندگی کی ابتداء کی)

ماہرین کو اب تک جتنی چیزیں ملی ہیں ان میں شہروں کے کھنڈرات، روزمرہ استعمال کی چیزوں کے علاوہ مذہبی نشانیاں اور آثار شامل ہیں۔ مثلاً دیوتاؤں کے مجسمے، مالائیں، مورتیاں اور خاص طور پر کتبے۔ غالباً کتبوں سے بہت پہلے انسان نے غاروں اور پہاڑی چٹانوں میں پتھروں کی کھدائی کر کے بعض تحریریں اور تصویریں رقم کی تھیں۔ ایسی بہت سی تحریریں اور تصویریں بھی اب عجائبات میں شامل ہیں۔ ذرا تصور میں لائیے! جب سہولیات نہیں تھیں اور لوگ یہ چاہتے تھے کہ کسی بہادر یا نیک انسان کی کہانی ہمیشہ کے لیے باقی رہ جائے .... تو ایسا کرنے کے لیے وہ کیا کرتے ہوں گے؟ ایک کتبے میں تو بیس پچیس سطروں سے بڑھ کر کچھ تحریر کرنا ممکن ہی نہیں تھا

Marfat.com

اور پھر تحریر بھی تو اپنی ابتدائی شکل میں تھی۔ خط نخی، ہیروغلفی، سریانی یا عبرانی......
یہ تمام قدیم "خط" اپنی ابتدائی شکل میں تھے اور چھوٹی سی بات بتانے کے لیے بھی بڑی بڑی علامتیں استعمال ہوتی تھیں۔ مثلاً "گھر" کا ذکر کرنے کے لیے گھر کی شکل بنائی جاتی تھی۔ تو پھر یونکر ممکن ہوسکتا ہے کہ کسی قصے کو تفصیل کے ساتھ لکھا جاتا۔ ظاہری بات ہے تفصیل کو اجمال بنانے کے لیے علامتوں اور تمثیلوں کا سہارا لیا جاتا ہوگا۔ قدیم "بابل" کے کھنڈرات سے ایک کتبہ ملا۔ جس میں ایک مرد ایک عورت ایک سانپ اور ایک سیب کی تصویر کندہ ہے۔ عورت سیب کو مرد کی خدمت پیش کرتی ہوئی دکھائی گئی ہے۔ جبکہ سانپ زمین پر رینگ رہا ہے۔ اس تصویر کا ذکر علامہ اقبالؒ نے اپنے "خطبات" میں کیا ہے۔ جو ہم آگے بیان کرنے والے ہیں۔ یہ کتبہ ظاہر کرتا ہے کہ آدم اور حوا کا مخصوص قصہ جو دراصل نظریہ ارتقاء کی تمثیل ہے قدیم ترین کندہ کاروں نے تصویری رنگ میں پیش کرنے کی کوشش بھی کی۔

کتبوں یا کندہ کاری کے علاوہ اپنے بہادروں کی داستانیں یاد رکھنے کا ایک اور طریقہ بھی تھا اور وہ تھا سینہ بہ سینہ روایت کا طریقہ۔ ایسے قصے کہانیاں جنہیں دیر تک زندہ رکھنا مقصود ہوتا منظوم کر لیے جاتے اور انہیں مذہبی گیتوں کا درجہ دے دیا جاتا۔ اس طرح پرانی روایتیں ایک نظم کی صورت امر ہو جاتیں۔ پوری کی پوری رامائن، مہا بھارت، گیتا، سلیمان علیہ السلام کی غزل الغزلات یا ایران کا حماسہ ملی...... نظمیں ہی تو ہیں اور یہ تو سب جانتے ہیں کہ کسی واقعے کو نثر کی بجائے شعر میں بیان کرنے کے لیے ہمیشہ استعاروں اور تمثیلوں سے کام چلایا جاتا ہے۔ ہندوؤں کی رامائن میں "ہنومان" ایک پہاڑ کی چوٹی سے چھلانگ لگاتا ہے اور سری لنکا میں جا گرتا ہے۔ "راون" کا رتھ جس میں کئی گھوڑے جتے ہیں، ہوا میں اُڑتا ہے اور "رام" کا عقاب

Marfat.com

آسمان میں اڑتے ہوئے راون کے رتھ پر حملہ کرتا ہے............ یہ سب کیا ہے؟ تمثیل ہی ہے! تاکہ شعر کی خوبصورتی اور وزن کی وجہ سے اسے سر میں گایا جاسکے۔ کیونکہ یہ سر میں گایا جائے گا تو زبان زد عام ہو جائے گا اور ہر کسی کو یاد رہے گا۔ رامائن ''والمیکی'' نے منظوم کی ہے۔ لیکن قصۂ آدم وحوا تمام آسمانی کتابوں کے علاوہ تمام مذاہب کے مذہبی گیتوں اشلوکوں اور مٹی کے کتبوں میں ملتا ہے۔ یہ قصہ ہر جگہ تقریباً ایک جیسا ہے۔ اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ قصہ وحی کے طور پر انسان کو بتایا گیا ہوگا۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ اس قصے کو دو افراد یعنی اماں حوا اور بابا آدم کا قصہ سمجھ کر اس کی اہمیت بہت حد تک کم کر دی گئی ہے۔ حالانکہ یہ ایک تمثیل تھا۔ ہزاروں سال پر پھیلی ہوئی ایک تمثیل۔ جسے نظریہ ارتقاء کے ماہرین نے خوب خوب سمجھا اور جیسا کہ اس کا حق تھا اس کی تشریح کی۔ ''ٹی۔ ایچ ہکسلے'' نے 1887ء میں کہا تھا:

> ''تمام فلسفوں میں سب سے قدیم نظریۂ ارتقاء ہے۔ جو دینیات کی تفسیروں کی گرم بازاری مین ہاتھ پاؤں باندھ کر تاریکی میں ڈال دیا گیا تھا۔ لیکن ڈارون نے اس کے قدیم ڈھانچے میں نیا خون شامل کیا۔ زنجیریں ٹوٹیں اور کائنات کی نظم و ترتیب کے بارے میں قدیم یونان کے نظریات کی جدید تفسیر نے خود کو ان تمام نظریات سے بہتر ثابت کیا۔ جنہیں آنے والی ستر نسلوں نے ضغیف الاعتقادی کے ساتھ قبول کیا اور ان کی خوش اعتقادی نے خوش آمدید کہا۔''

ٹی۔ ایچ ہکسلے نے بات تو ٹھیک کی لیکن اس کے لہجے میں تعصب صاف دکھائی دیتا ہے تخلیق آدم کے ڈھانچے میں اصل خون قرآن کریم نے دوڑایا، ڈارون نے

نہیں۔ قرآن کریم کے بعد احادیث اور پھر مفکرین اسلام ''حضرت علی رضی اللہ عنہ، امام ابن غلدونؒ، ابن مسکویہ، مولانا رومؒ اور علامہ اقبال رحمۃ اللہ نے اچھی طرح سے تمثیل آدم وحوا کو سمجھا اور اسے حقیقی نظریہ ارتقاء قرار دیا۔ علامہ اقبالؒ...... اپنے خطبات میں تحریر فرماتے ہیں:

''قرآن مجید کی تعلیمات بھی جس کا یہ کہنا ہے کہ انسان عمل صالح اور قوائے طبیعی کی تسخیر پر دسترس رکھتا تھا............ رجائیت کی ہیں نہ قنوطیت کی، بلکہ فلاح کی ہیں۔ جس کا لب لباب یہ ہے کہ کائنات اضافہ پذیر ہے اور جس کو اس امید نے سہارا دے رکھا ہے کہ انسان ایک نہ ایک دن شر پر غالب آئے گا۔

لیکن اس مشکل کے حل کی تلاش ہے۔ تو بہتر ہوگا...... ہم اس قصے سے رجوع کریں جس کا تعلق ہبوطِ آدم سے ہے۔ قرآن مجید نے اس قصے کی بعض قدیم علامات کو تو بعینہٖ برقرار رکھا لیکن نفس مضمون بہت کچھ بدل دیا۔ جس سے اس کے اندر ایک نئے معنی پیدا ہوگئے۔ قرآن مجید کا یہ انداز کہ قصص میں جزوی یا کلی تبدیلیوں سے ان کو نئے نئے خیالات کا حامل بنایا جائے تاکہ وہ زمانے کی بڑھتی ہوئی رو کا ساتھ دے سکیں۔ ایک بڑا ہی اہم نقطہ ہے۔ جس پر مسلمان ہوں یا غیر مسلم، اسلام کے مطالعے میں کسی نے پوری توجہ نہیں کی۔ قرآن مجید میں جب کوئی قصہ بیان کیا جاتا ہے تو اس سے مقصد بالعموم یہ نہیں ہوتا کہ کسی تاریخی واقعے کا ذکر کیا جائے۔ اس سے عام طور پر کوئی عالمگیر اخلاقی سبق دیا جاتا یا

Marfat.com

کوئی عالمگیر فلسفیانہ حقیقت اجاگر کی جاتی ہے۔ ہذا قرآن پاک نہ تو افراد کے ناموں کا ذکر کرتا ہے نہ مقامات کا۔ ناموں کے استعمال سے قصے عموماً تاریخی رنگ اختیار کر لیتے ہیں اور ان کے معنی محدود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ قرآن پاک ان جزیات کو بھی نظر انداز کر دیتا ہے جن کا تعلق جذبات و احساسات کے کسی مخصوص عالم سے ہو۔ قصوں سے فائدہ اٹھانے کا یہ طریق کچھ ایسا شاذ نہیں۔ غیر مذہبی ادب میں تو اس کی مثالیں عام ہیں۔ مثلاً فاؤسٹ (Faust) ہی کی داستان ہے جسے گوئٹے کی ذہانت اور فطانت نے بالکل نئے معنی پہنا دیے۔

بہر حال ادب قدیم کا جائزہ لیجئے! تو ہبوط آدم کے قصے کی ایک نہیں کئی شکلیں ملیں گی۔ رہا یہ سوال کہ اس روایت کا ارتقاء کس طرح ہوا سو یہاں اس کی تفصیل ممکن نہیں۔ ہم ان مراحل کی حد بندی بھی نہیں کر سکتے جن سے گزر کر اس نے مختلف شکلیں اختیار کیں۔ بعینہٖ ہم ان مقاصد سے بھی بے خبر ہیں جو بتدریج ان گونا گوں تبدیلیوں کا سبب بنے۔ البتہ جہاں تک اس روایت کی سامی شکل کا تعلق ہے ہم کہہ سکتے ہیں، اس میں غالباً شروع شروع کے انسان کی یہ خواہش کام کر رہی تھی کہ ایسے ماحول میں جس سے وہ قطعاً نامانوس تھا۔ جس میں موت ارزاں اور بیماریاں عام تھیں اور جہاں اس کو اپنا آپ برقرار رکھنے میں قدم قدم پر روکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا' اپنی زبوں حالی اور دکھ درد کا

اظہار کر سکے۔ وہ اس قابل تو تھا نہیں کہ قوائے فطرت کی تسخیر کرے لہٰذا زندگی کے بارے میں اس نے قدرتاً ایک ایسا نظریہ اختیار کر لیا جس پر یاس اور قنوط کا غلبہ تھا۔ چنانچہ قدیم بابل کے ایک کتبے میں سانپ (لنگ) اور درخت اور عورت .... مرد کو سیب (علامت بکر) نذر کرتے ہوئے .... سب ہی موجود ہیں۔ یہاں یہ کہنا لا حاصل ہوگا کہ اس قصے کا اشارہ کس طرف ہے۔

مسرت اور سعادت کی ایک مفروضہ حالت سے انسان کے اخراج کی طرف مرد وزن کے سب سے پہلے جنسی فعل کی پاداش میں لیکن جونہی ہم اس روایت کا مقابلہ جو قرآن مجید میں بیان ہوئی، کتاب پیدائش کی روایت سے کرتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ اول الذکر (قرآن مجید) کا انداز کس قدر مختلف ہے۔ لہٰذا قرآن مجید اور عہد نامہ قدیم کی روایات کا یہی فرق اس امر کی دلیل ہے کہ قرآن پاک کا اس قصے سے کچھ اور ہی مقصد ہے۔

(۱) قرآن مجید نے سانپ اور پسلی کا مطلق ذکر نہیں کیا۔ اول الذکر کا تو اس لیے کہ قصہ مذکور کو اس کے جنسی ماحول سے الگ کرنا مقصود تھا۔ علیٰ ھذا زندگی کے اس قنوطیت پسند نظریے سے الگ کرنا مقصود تھا جس کی اس سے ترجمانی ہو رہی ہے اور پسلی کا اس لیے ذکر نہیں کیا کہ قرآن مجید کی نظر عہد نامہ عتیق کی طرح کسی تاریخی واقعے پر نہیں۔ برعکس اس کے عہد نامہ عتیق کا مقصود

Marfat.com

اسرائیل کی تاریخ بیان کرنا ہے اور وہ مرد و زن کے سب سے پہلے جوڑے کا ذکر کرتا ہے تو بطور اس کی تمہید کے۔ یوں بھی بحیثیت ایک ذی روح انسان کی آفرینش کا جہاں کہیں ذکر آیا ہے قرآن پاک نے اس کے لئے بشر اور انسان کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ آدم کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ لفظ آدم سے مقصود تو صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ انسان کے اندر اللہ کا نائب بننے کی صلاحیت موجود ہے۔ انی جاعل فی الارض خلیفة .... لہٰذا قرآن پاک نے وہ سب اسمائے معرفہ حذف کر دیے جو عہد نامہ عتیق کی اس روایت میں مذکور ہیں، آدم، حوا وغیرہ .... تاکہ اس کی نگاہیں جس حقیقت پر ہیں اس کے متعلق کوئی غلط فہمی باقی نہ رہے۔ آدم کا لفظ بے شک حذف نہیں ہوا لیکن یہاں اس کا اشارہ کسی مخصوص انسان کی طرف نہیں۔ اس کی حیثیت ایک تصور کی ہے۔ جس کی تائید قرآن پاک سے ہی ہو جاتی ہے اور جس کا ذیل کی آیت ایک قطعی اور واضح ثبوت ہے۔

ولقد خلقنکم ثم صورنکم ثم قلنا للملائکة اسجدوا لآدم فسجدوا الا ابلیس. (۷:۱۰)

(۲) قرآن مجید نے اس قصے کو دو الگ الگ حکایتوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک جس میں ''الشجرہ'' کا ذکر آیا ہے۔ دوسری وہ جس میں ''شجرۃ الخلد'' اور ''ملک لا یبلی'' کا۔ پہلی حکایت ساتویں اور

Marfat.com

دوسری بیسوئیں سورۃ میں ملے گی۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے کہ شیطان نے جس کا کام ہی یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں وسوسے پیدا کرتا ہے، آدم اور اس کی بیوی کو ورغلایا اور انہوں نے ان درختوں کا پھل چکھ لیا۔ برعکس اس کے عہد نامہ عتیق کا کہنا یہ ہے کہ جونہی آدم سے نافرمانی کا پہلا جرم سرزد ہوا اسے باغ عدن سے نکال دیا گیا اور پھر جس پر خداوند نے اس کی مشرقی سمت میں کچھ ملائکہ متعین کر دیے، نیز ایک آتشیں تلوار بھی۔ جو اس کے ارد گرد گھومتی رہتی ہے تا کہ شجر حیات کا راستہ روک لے۔

(۳) عہد نامہ عتیق نے آدم کے جرم نافرمانی کی بناء پر زمین کو ملعون ٹھہرایا، برعکس اس کے قرآن مجید کے نزدیک وہ انسان کا مستقر اور متاع ہے جس کے لیے اسے اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہونا چاہیے۔

ولقد مکنکم فی الارض و جعلنا لکم فیھا معایش قلیلا ماتشکرون. (۷:۹)

پھر اس امر کا بھی کوئی ثبوت نہیں کہ لفظ جنت کا اشارہ یہاں اس فوق الحواس بہشت کی طرف ہے جس سے کہا جاتا ہے کہ انسان، زمین پر آ گرا تھا۔ قرآن پاک نے کہیں یہ نہیں کہا کہ انسان کی حیثیت اس زمین میں ایک اجنبی کی ہے۔

"واللہ انبتکم من الارض نباتا. (۷۱:۱۷)

ترجمہ: اور اللہ نے تم سب کو زمین سے نباتات کی طرح اگایا۔"

لٰہذا یہ جنت جس کا اس قصے میں ذکر آیا ہے نیکو کاروں کا وہ مسکن نہیں جہاں وہ ہمیشہ رہتے چلے جائیں گے۔ کیونکہ ان معنوں میں جہاں ہیں جنت کا ذکر آیا ہے اس کی تعریف قرآن کریم نے ان الفاظ میں کی ہے۔

''یتنازعون فیھا کاساً ولغو فیھا ولا تاثیما (۲۳:۵۲)

لیکن وہ جنت جس کا ذکر اس قصے میں آیا ہے اس میں تو انسان نے سب سے پہلے گناہ ہی کا ارتکاب کیا جس کی پاداش میں اسے وہاں سے نکال دیا گیا۔ دراصل قرآن مجید جہاں کہیں کوئی لفظ استعمال کرتا ہے وہیں اس کے معنی بھی بیان کر دیتا ہے۔ چنانچہ آگے چل کر اس قصے کی دوسری حکایت میں اسی باغ کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

''ان لک الا تجوع فیھا ولا تعری ٥ و انک لا تظموا فیھا ولا تضحی. (۱۱۸:۲۰)

اور اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ قرآن پاک کی اس روایت میں لفظ جنت کا اشارہ حیات انسانی کے اس ابتدائی دور کی طرف ہے جس میں انسان کا اپنے ماحول سے ابھی عملاً کوئی رشتہ قائم نہیں ہوا تھا اور جس میں وہ اس تکلیف دہ احساس سے بے خبر تھا جو اپنی ضروریات میں محتاجی کو دیکھتے ہوئے ہمارے دل میں پیدا ہوتا تھا لیکن جو گویا تمہید ہے تہذیب وتمدن کی۔

لٰہذا قرآن مجید نے ہبوط آدم کا ذکر کیا تو یہ بیان کرنے کے لیے نہیں کہ کرۂ ارض میں انسان کا ظہور کس طرح ہوا۔ اس کے پیش

Marfat.com

نظر حیات انسانی کا وہ ابتدائی دور ہے جب اس پر جبلی خواہشات
کا قبضہ تھا اور جس سے گزر کر اس نے رفتہ رفتہ محسوس کیا کہ وہ اپنی
ذات میں آزاد اور اسلیے شک اور نافرمانی دونوں کا اہل ہے۔
مختصر یہ کہ ہبوط آدم کا اشارہ کسی اخلاقی پستی کی طرف نہیں بلکہ
اس کا اشارہ.........
اس تغیر کی طرف ہے جو شعور کی صاف اور سادہ حالت میں شعور
ذات کی اولین جھلک سے اس نے اپنے اندر محسوس کیا۔ وہ
خواب فطرت سے بیدار ہوا اور سمجھا کہ اس کی حیثیت خود بھی اپنی
جگہ پر ایک سبب کی ہے۔ یوں بھی قرآن مجید میں یہ کہیں مذکور
نہیں کہ کرۂ ارض ایک دارالعذاب ہے۔ جہاں انسان جس کا
خمیر ہی بدی سے اٹھایا گیا ہے کسی اولین گناہ کی پاداش میں قید و
بند کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ برعکس اس کے اس کی پہلی نافرمانی وہ
پہلا اختیاری عمل تھا جو اس نے اپنے ارادے اور اپنی مرضی سے
کیا اور یہی وجہ ہے کہ ارشاد قرآنی کے مطابق آدم کا یہ گناہ
معاف کر دیا گیا۔

"فتلقی آدم من ربه کلمات فتاب علیه".

اب تو آپ نے اچھی طرح سے ملاحظہ کر لیا ہوگا کہ حضرت علامہ اقبالؒ تخلیق آدم کے باب میں کس قسم کا موقف رکھتے ہیں۔ حیرت ہے ہم پاکستانی جو اپنے ملک کی نظریاتی اساس علامہ اقبالؒ کے افکار پر اٹھانے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ حضرت علامہؒ کے افکار و نظریات سے بالکل ناواقف ہیں۔ دراصل یہ مذہبی پیشوایت کی شدت پسندی کا

Marfat.com

نتیجہ ہے کہ ہم نے اپنے ذہن کے تمام دریچے پوری طرح سے بند کر رکھے ہیں۔ مدت ہوئی ہمارے حبس زدہ خیالات کو تازہ ہوا کا جھونکا نصیب نہیں ہوا۔ وہ دن گئے جب خلیل میاں فاختہ اڑایا کرتے تھے۔ اب تو فاختہ گزشتہ پانچ سو سال سے ہمارے ذہن کے قفس میں بند، بری طرح پھڑ پھڑا رہی ہے۔ ہمارے سوچنے پر پابندی ہے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے جو زیادہ سوچے گا' وہ ایمان سے جاتا رہے گا۔

مذہبی پیشوایت نے اس طرح ہماری شاہراہ فکر پر رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔ حالانکہ قرآن حکیم کا کثرت سے پایا جانے والا ارشاد یہ ہے کہ.........تم غور کرو، فکر کرو، تدبر کرو، سمجھ حاصل کرو، شعور حاصل کرو، عقل استعمال کرو.........تم خود کیوں نہیں سوچتے، غور کیوں نہیں کرتے وغیرہ وغیرہ۔ یہاں تک کہ ایک مقام پر قرآن نے یہ بھی کہہ دیا کہ قرآنی آیات کو پڑھتے ہوئے بھی ہمیں اندھے اور بہرے ہو کر ان پر گر نہیں پڑنا چاہیے۔ الغرض پیشوایت نے قصہ آدم کو اماں حوا اور بابا آدم کی کہانی کے طور پر ماننے کے لیے عامۃ الناس کو مجبور کر رکھا ہے۔ نظریہ مخصوص تخلیق سب سے پرانا ہے اور یہ دراصل ایک تمثیل ہے جس میں انسان کی آفرینش کو کماحقہ، سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ بائبل مقدس، قرآن کریم دیگر مذاہب اور سائنس سب کا کہنا ایک جیسا ہے لیکن ہمارا سمجھنا ایک جیسا نہیں۔ ہم جان بوجھ کر کچھ سمجھنا نہیں چاہتے۔ اگر ہم خود کو اپنے آغاز و انجام پر غور کرنے کا اہل بنالیں تو شاید کائنات میں کوئی مسئلہ ہی باقی نہ رہے۔ علامہ اقبالؒ کے بقول:

> ''جو انسان اپنے آغاز و انجام کے بارے میں نہیں جانتا، وہ کچھ بھی نہیں جان سکتا''۔

نظریہ مخصوص تخلیق ایک مرد اور ایک عورت کا قصہ نہیں بلکہ مردوں اور عورتوں کا

Marfat.com

قصہ ہے۔ علامہ اقبالؒ نے جس آیت کا ذکر کیا ہے وہ اتنی واضح صاف اور سیدھے الفاظ میں ہے کہ اس کا رد ممکن ہی نہیں۔ دنیا کا کوئی بھی مفسر اس آیت کی معنوی حقیقت سے بھاگ نہیں سکتا۔ یوں لگتا ہے جیسے پیشوایت کی نظروں سے یہ آیت کبھی گزری ہی نہیں۔ اب ذرا پوری توجہ سے دیکھیے! ارشاد ہے:

ولقد خلقنکم ثم صورنکم ثم قلنا للملائکة اسجدوا لادم فسجدوا الا ابلیس. (۷:۱۰)

ترجمہ: اور تحقیق ہم نے تم سب کو (پہلے) پیدا کیا پھر تم سب کو صورتیں عطا کیں پھر ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو! انہوں نے سجدہ کیا، لیکن ابلیس نے نہیں۔"

"خلقنکم" اور "صورنکم" میں........."کم".........کا لفظ قابل غور ہے۔ اگر فرد واحد ہوتا تو جمع کا صیغہ استعمال نہ کیا جاتا۔ بے شک آدم علیہ السلام انسانوں کے پہلے نبی ہوں گے اور بے شک اماں حوا ان کی بیوی ہوں گی لیکن یہ آدم و حوا بقول علامہ اقبالؒ دراصل بنی اسرائیل کے جد امجد ہیں۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ یہ ہیں:

"قرآن مجید کی نظر عہد نامہ عتیق کی طرح کسی تاریخی واقعے پر نہیں برعکس اس کے عہد نامہ عتیق کا مقصود اسرائیل کی تاریخ بیان کرنا ہے اور وہ مرد و زن کے سب سے پہلے جوڑے کا ذکر کرتا ہے تو بطور اس کی تمہید کے۔" (تشکیل جدید)

آپ بائبل اٹھا کر دیکھیے! آدم و حوا سے پیدا ہونے والی اولاد.........ساری کی ساری فی الحقیقت بنی اسرائیل کا سلسلہ نسب ہے۔ مشتے از خروارے کے طور پر یہ

Marfat.com

دیکھئے:۔

''اور آدم ایک سو تیں برس کا تھا جب اس کی صورت و شبیہ کا ایک بیٹا اس کے ہاں پیدا ہوا۔ اور اس نے اس کا نام ''سیت'' رکھا اور سیت کی پیدائش کے بعد آدم آٹھ سو برس جیتا رہا اور اس سے بیٹے اور بیٹیاں پیدا ہوئیں اور آدم کی کل عمر نو سو تیں برس کی ہوئی تب وہ مرا۔

اور سیت ایک سو پانچ برس کا تھا جب اس سے ''انوس'' پیدا ہوا اور انوس کی پیدائش کے بعد سیت آٹھ سو سات برس جیتا رہا اور اس سے بیٹے اور بیٹیاں پیدا ہوئیں اور سیت کی کل عمر نو سو بارہ برس کی ہوئی تب وہ مرا۔'' (کتاب پیدائش۔ باب ۵)

اس سے آگے بائبل کی ہر آیت جو کتاب پیدائش میں ہے تقریباً اس طرح شروع ہوتی ہے:

''اور انوس نوے برس کا تھا جب اس سے قینان پیدا ہوا۔
اور قینان ستر برس کا تھا جب اس سے محلل ایل پیدا ہوا۔
اور محلل ایل پینسٹھ برس کا تھا جب اس سے یارد پیدا ہوا
اور یارد ایک سو باسٹھ برس کا تھا جب اس سے حنوک پیدا ہوا۔
اور حنوک پینسٹھ برس کا تھا جب اس سے متوسلح پیدا ہوا۔
اور متوسلح ایک سو ستاسی برس کا تھا جب اس سے لمک پیدا ہوا۔
اور لمک ایک سو بیاسی برس کا تھا جب اس سے ایک بیٹا پیدا ہوا
اور اس نے اس کا نام ''نوح'' رکھا۔

Marfat.com

اور نوح پانچ سو برس کا تھا جب اس سے سم، ہام اور یافت پیدا ہوئے۔''

اور نوح کے بیٹے سم سے ابراہیم تک ''ارفکسد''، سلح، عبر، فلج، رعو، سروج، نحور، تارح، آٹھ پشتیں ہیں جن کے بعد ''بنی اسرائیل'' کا آغاز ہو جاتا ہے۔ چنانچہ علامہ اقبالؒ نے سچ کہا کہ عہد نامہ عتیق کا مقصود اسرائیل کی تاریخ بیان کرنا ہے اور عہد نامہ قدیم مرد و زن کے پہلے جوڑے کا ذکر کرتا ہے تو بنی اسرائیل کی تمہید کے طور پر۔

اماں حوا اور بابا آدم بنی اسرائیل کے علاوہ بھی کئی دیگر اقوام کے ابوالآ باء ہیں۔ لیکن زمین پر بسنے والی کل انسانیت نے آپ کی اولاد ہونے کا شرف حاصل نہیں کیا۔ بہتر تو یہ ہے کہ ہم اس بات کو سمجھنے کے لیے قرآن کریم سے رجوع کریں۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ زمین پر پیٹ کے بل رینگنے والے حشرات الارض چار پاؤں پر چلنے والے چوپایے اور دو پاؤں پر چلنے والے دو پائے پیدا کیے گئے۔ آیت ملاحظہ ہو:

وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَابَّةٍ مِن مَاءٍ فَمِنْهُمْ مَنْ يَمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ وَمِنْهُمْ مَن يَمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ وَمِنْهُمْ مَن يَمْشِيْ عَلٰى اَرْبَعٍ ط يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَاءُ ط اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

ترجمہ: اور اللہ نے زمین پر ہر چلنے والا پانی سے بنایا تو اُن میں کوئی اپنے پیٹ پر چلتا ہے اور اُن میں کوئی دو پاؤں پر چلتا ہے اور اُن میں کوئی چار پاؤں پر چلتا ہے۔ اللہ بناتا ہے جو چاہے، بے شک اللہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ (سورۃ نور آیت نمبر ۴۵، ترجمہ احمد رضا خان بریلوی)

Marfat.com

''قرآن کی زبان میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام اور اماں حوا علیہا السلام کے اطراف واکناف میں بہت سے دوپائے آباد تھے، جن کے دماغ ترقی یافتہ نہیں تھے۔ آدم علیہ السلام کو اللہ نے وحی کی روشنی سے بہرہ ور کیا اور آپ کی اولاد میں بھی نبوت کا سلسلہ چل نکلا۔ جو آگے چل کر بنی اسرائیل کے انبیاء کا سلسلہ بن گیا۔ ہم زمین کے جغرافیہ پر نظر کریں تو ہم مجبور ہو جاتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کے علاوہ بھی زمین پر بہت سے دو پائیوں کا تصور کریں جنہیں قرآن کریم نے ...... یمشی علی رجلین ...... کہہ کر پکارا۔ جغرافیہ کیا ہے؟ خشکی کے سات ٹکڑے جو عظیم سمندروں میں مختلف مقامات پر پڑے ہیں۔ جنوبی اور شمالی امریکہ ایشیا اور افریقہ سے اتنے دور ہیں کہ بیچ میں پورا، بحر اوقیانوس حائل ہے اور اگر ہم چین سے امریکہ کی طرف سفر شروع کریں تو دنیا کا سب سے بڑا سمندر بحر عظیم یا بحر الکاہل عبور کرنا پڑتا ہے۔ جسے آج کے تیز رفتار دور میں بھی عبور کرتے ہوئے ہفتوں لگ جاتے ہیں۔ چلو! امریکہ اور ایشیا کے درمیان سائبیریا اور الاسکا کو نزدیک مان کر ہم یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ شاید یہاں پہلے خشکی ہوگی اور انسان، ایشیاء سے چل کر امریکہ چلے گئے ہوں گے۔ لیکن آسٹریلیا کا کیا کریں گے؟ جو سمندر کے بیچوں و بیچ ایک بالکل الگ براعظم ہے۔ وہاں کی تاریخ بھی ہزاروں سال پرانی ہے۔ وہاں انسان کیسے پہنچا؟ آسٹریلیا کے علاوہ انڈونیشیا، فلپائن اور جاپان جو بڑے بڑے جزیرے ہیں اور ہزاروں سالہ پرانی تاریخ کے حامل۔ سب سے بڑھ کر یہ بات کہ سری لنکا خود ایک جزیرہ ہے جس کے چاروں طرف سمندر کا پانی ہے اور ہمارے مذہبی پیشواؤں کا یہ کہنا ہے کہ آدم اور حوا جنت سے پھینکے گئے تو سری لنکا میں آ کر گرے اور تو اور سری لنکا میں آدم علیہ السلام کے پیر کا نشان بھی محفوظ ہے جو عام تصویروں میں دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ سری لنکا میں پیدا ہونے کے بعد آدم

Marfat.com

علیہ السلام کی اولاد قریبی ملک ہندوستان یا خشکی کے دیگر ٹکڑوں پر کیسے منتقل ہوئی۔ نوح علیہ السلام کی کشتی تو بہت بعد میں بنائی گئی۔ جبکہ ہندوستان اور ایران میں تو اس وقت بہت سے انسان موجود تھے۔ یہ جغرافیہ ہی ہے جسے دیکھنے کے بعد یہ یقین پختہ ہو جاتا ہے کہ آدم اور حوا محض دو افراد کا نام نہیں بلکہ یہ ایک سلسلے کا نام ہے جو ہزاروں سال جاری رہا۔

نظریۂ مخصوص تخلیق کے علمبردار نظریۂ ارتقاء کی بڑی شدت کے ساتھ مخالفت کرتے ہیں۔ جبکہ نظریۂ ارتقاء کو ماننے والے نظریۂ مخصوص تخلیق کی بالکل مخالفت نہیں کرتے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ آدم و حوا کا قصہ ایک تمثیل ہے جس سے ہم آدمؑ کی آفرینش کو اچھی طرح سے سمجھ سکتے ہیں۔ آدم کا مٹی سے پیدا ہونا، پھر اس سے جنس مخالف کا پیدا ہونا۔ ان کا ہرے بھرے باغات میں بے فکری سے گھومتے رہنا اور پھر ان کا نیکی اور بدی کی پہچان کا پھل کھا لینا وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب واقعات حقیقی اہل ارتقاء کے نزدیک درست ہیں۔ نظریۂ ارتقاء تو خود ایک ارتقاء ہے۔ ایک ایسا ارتقاء جو اپنی پیدائش کے بارے میں انسان کے افکار و خیالات میں پیدا ہوا۔ نظریۂ ارتقاء کو بہت پہلے مسلمانوں نے سمجھ لیا تھا۔ لیکن ایک مسلمان مفکر ''امام ابن مسکویہؒ'' نے سب سے پہلے بڑی وضاحت کے ساتھ نظریۂ ارتقاء کو بیان کیا۔ جس کی تفصیل ہم آگے بیان کریں گے۔ امام ابن مسکویہ کے علاوہ علامہ اقبالؒ کے پیر مولانا جلال الدین رومیؒ جیسے عظیم فلسفی صوفی نے بھی نظریۂ ارتقاء کی جزئیات پر نظر ڈالی۔ مثنوی مولانا رومؒ کے مندرجہ ذیل اشعار علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں پیش کئے ہیں:۔

آمدہ اول بہ اقلیم جماد ۔۔۔ وز جمادی در نباتی اوفتاد
سال ھا اندر نباتی عمر کرد ۔۔۔ وز نباتی یاد نا ورد از نبرد

Marfat.com

وزنباتی چوں بہ حیوانی فتاد نامدش حالِ نباتی ہیچ یاد
جز ہماں میلے کہ دارد سوے آں خاصہ در وقت بہار ضیمراں
ھم چنیں اقلیم تا اقلیم رفت تا شد اکنوں عاقل و دانا و زفت

ترجمہ: انسان شروع میں جمادات تھا پھر جمادات سے نباتات بنا۔ پھر سالہا سال نباتات رہا لیکن نباتی زندگی اُسے یاد نہیں۔ نباتات سے جب حیوان بنا تو نباتی حالت اُس کو یاد نہ رہی۔ ہاں! سوائے اُس میلان کے جو اُس کو نباتات کی طرف ہے۔ خصوصاً موسم بہار میں ضیمران کے پھول کھلنے کے وقت۔ اس طرح وہ ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف چلتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ عاقل و دانا و فربہ بن گیا۔

اب ہم اپنی بحث کو نظریۂ ارتقاء پر مرکوز کرتے ہیں۔ سب سے پہلے ہم اس نظریے کا جائزہ لیں گے جو ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کے طور پر مشہور ہے۔ بعض لوگ اسے ڈارون ازم بھی کہتے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے ایک بات عرض کر دینا ضروری ہے اور وہ یہ کہ...... یہ صرف ڈارون ہی نہیں تھا، جس نے انیسویں صدی میں یہ نظریہ پیش کیا بلکہ ٹھیک اسی زمانہ میں الفریڈ رسل ویلس نامی ایک سائنسدان نے بھی یہی نظریہ پیش کیا تھا۔ یوں لگتا ہے گویا...... وقت آ گیا تھا کہ اب انسان کی پیدائش کا اصل حال انسانوں کے احاطۂ علم میں دے دیا جاتا۔ چنانچہ اس وقت جو لوگ اس اہل تھے، انہیں یہ خیالات ودیعت کر دیئے گئے۔ بہرحال ڈارون کا نظریہ ارتقاء یہ ہے۔

۱۔ کارخانۂ قدرت میں افراد اور انواع کے اندر بے پناہ اور ہر درجہ کا تبدل پایا جاتا ہے۔

۲۔ ہر نوع کا تعداد میں بڑھنے کی طرف رجوع بڑی حد تک ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ انواع کی آبادی قریباً ایک جیسی رہتی ہے۔ کیونکہ دشمن کے حملے، بیماری، مقابلہ اور موسم کی وجہ سے بہت سے افراد ختم ہو جاتے ہیں۔

۳۔ زندگی کو بچانے کے لیے کشمکش جاری ہے۔ جن افراد کی امتیازی خصوصیات حالات کا مقابلہ نہیں کر سکتیں وہ مٹ جاتے ہیں اور جن کی امتیازی خصوصیات موافق ہوں وہ زندہ رہتے ہیں اور تولیدی عمل سے آگے بڑھتے ہیں۔

۴۔ اس لیے قدرتی انتخاب کا عمل جاری ہے جس سے رعایت یافتہ انواع باقی رہتی ہیں۔

یاد رہے کہ ڈارون کا نظریۂ ارتقاء موجودہ نظریۂ ارتقاء نہیں۔ یہ صرف ڈارون کا نظریۂ ارتقاء ہے۔ اس بات کا ذکر ہم پہلے بھی کر چکے ہیں۔ دراصل جیسا کہ میں نے کہا شاید تخلیق آدمؑ کا اصل علم انسان کو عطا ہونے کا وقت آ گیا تھا۔ کیونکہ ہم پیچھے کی طرف دیکھتے ہیں تو گزشتہ چند صدیوں میں نظریۂ ارتقاء کے پے در پے کئی نظریات نظر آتے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ نظریات مختلف زمانوں میں آتے رہے چنانچہ خود بخود ایک ایسا ماحول پیدا ہو گیا، جس سے علمائے انسانیات کی پوری توجہ اسی طرف مبذول ہو گئی۔ دراصل جن قوتوں کے ذریعے ارتقاء کا عمل وقوع پذیر ہوا وہ دھیرے دھیرے انسان کی سمجھ میں آنا شروع ہوئیں اور آہستہ آہستہ سمجھ میں آتی چلی گئیں۔ لیکن اب وہ پوری طرح انسان کے حیطۂ ادراک کے اندر ہیں۔

ہزاروں سال سے وحی کی کتابوں میں نظریۂ ارتقاء موجود ہے۔ لیکن انسان کا ناپختہ ذہن اس کی صحیح تعبیر نہیں کر سکا۔ توریت کے زمانے سے مخصوص تخلیق کا نظریہ چلا آ رہا ہے اور اس کا انحصار اس فقرے کی غلط تعبیر پر ہے جس میں کہا گیا ہے:

Marfat.com

''خدا نے کائنات کو چھ دنوں میں بنایا اور انسان سب سے آخر میں آیا۔''

یہ جملہ مسلمانوں اور عیسائیوں...... ہر دونوں میں یکساں مقبول ہے۔ لیکن بدقستی سے پیشواؤں نے کبھی ''چھ'' دنوں کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ قرآن کریم، ان چھ دنوں کو چھ ادوار سے تشبیہ دیتا ہے۔ کیونکہ قرآن حکیم میں دو مختلف مقامات پر اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک دن کو ہم انسانوں کے ایک دن سے بہت مختلف بتایا ہے۔ ایک جگہ ہے کہ اللہ کا ایک دن ایک ہزار سال کا ہے اور دوسری جگہ ہے کہ اللہ کا ایک دن پچاس ہزار سال کا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خود قرآن نے ہی سب سے پہلے نظریۂ ارتقاء کو کھول کھول کر بیان کیا اور اب تو چھ دنوں کا قضیہ خود بخود سلجھ جانا چاہیے تھا کیونکہ زمین کے زیادہ تر انسان یہ جان گئے ہیں کہ ہمارا سورج بہت چھوٹا ہے اور ہمارے سورج کا طلوع و غروب یعنی ہماری زمین کا ایک دن تخلیق کے معاملے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ یہ کائنات بہت وسیع ہے۔ اس میں کھربوں کہکشائیں اور کھربوں ستارے ہیں۔ چنانچہ یہ ممکن ہی نہیں کہ ہماری زمین کا ایک دن پوری کائنات کی تخلیق میں اہمیت رکھتا ہو اور پھر زیادہ تر علماء نے چھ دنوں کو چھ ایام یعنی چھ دور کہا ہے۔ قرآن کریم کی آیت یہ ہے:

''ان ربکم اللہ الذی خلق السموات و الارض فی ستة ایام ثم استوی علی العرش یدبر الامر............ (۳:۱۰)

ترجمہ: تمہارا پروردگار وہ ہے جس نے ارض وسموات کو چھ ایام میں پیدا کیا۔ پھر تخت پر قائم ہوا۔ وہی ہر ایک کام کا انتظام کرتا ہے۔''

اس آیت میں ایام کا لفظ ادوار کے معانی دیتا ہے نہ کہ دنوں کے۔ ایک اور جگہ

Marfat.com

قرآن کریم میں ارشاد ہے:

''بالذی خلق الارض فی یومین............ (۹:۴۱)

ترجمہ: ''اس نے زمین کو دو ایام میں پیدا کیا۔''

اسی طرح ایک اور جگہ ارشاد ہے:

''فقضھن سبع سموات فی یومین............ (۹:۴۱)

ترجمہ: ''پھر دو ایام میں سات آسمان بنائے۔''

چنانچہ مختلف قرآنی آیات کی روشنی میں اور خاص طور پر مندرجہ ذیل آیت کے ہوتے ہوئے ہم یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ چھ دن سے مراد سورج کے طلوع و غروب، والے چھ دن ہیں۔ آیت یہ ہے۔

''فی یوم کان مقدارہ' خمسین الف سنۃ'' ٥ (۴:۷۰)

ترجمہ: ''اس دن میں، جس کی مقدار پچاس ہزار برس ہے۔''

اب یہ طے ہے کہ ان چھ دنوں سے مراد چھ بڑے بڑے ادوار ہیں، نہ کہ محض چھ دن۔ یاد رہے کہ ان ادوار کی مدت کا تعین سائنس نے بھی کیا ہے۔ ظاہر ہے یہ ادوار گزشتہ اربوں سالوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ پچاس ہزار سال یا ایک ہزار سال کا دن تو محض نمونہ ہے۔ اللہ کے دن کتنے لمبے ہوتے ہیں یہ تو ہمیں اس وقت پتا چلے گا جب ہم اللہ کے زمانے پر غور کریں گے۔ عصر حاضر کے انسان کو کیسے معلوم ہوا کہ ہر دور، جسے قرآن یوم کہتا ہے، کتنی مقدار کا تھا؟ کب شروع ہوا اور کب ختم؟ سائنس کے پاس ایسی عجیب حجری گھڑیاں (Fassil clocks) ہیں جو زمین کی تہوں میں موجود ہیں۔ جب زمین کی سطح پر کوئی جانور مرتا ہے تو اس کا جسم گل سڑ کر ختم ہو جاتا ہے۔ گوشت پوست تو جلدی ختم ہو جاتا ہے لیکن ہڈیاں کافی مدت تک باقی رہتی ہیں۔ آخر

Marfat.com

میں وہ بھی درختوں کی جڑوں سے پیدا ہونے والے تیزابی مادے اور جراثیم کے ذریعے چورا چورا ہو کر ختم ہو جاتی ہیں۔ بعض ہڈیاں زمین کی تہہ میں دب کر محفوظ ہو جاتی ہیں۔ گرمی کی شدت اور دباؤ کی وجہ سے ہڈی بمعہ اپنے اردگرد کی مٹی کے، بتدریج سخت ہو جاتی ہے۔ آخر میں مٹی اور ہڈی یک جان ہو کر ایک سخت پتھر بن جاتا ہے۔ اس قدر سخت کہ روئے زمین کی کوئی شے اتنی سخت نہیں ہوتی۔ اس میں ہڈی بھی پتھر بن جاتی ہے۔ لیکن اس کی اندرونی ساخت ویسے ہی قائم رہتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہڈی ٹھوس نہیں بلکہ مسام دار (Porous) شے ہے۔ ان مساموں میں مٹی اور دیگر مادے داخل ہو کر ہڈی کو پتھر بنا دیتے ہیں۔ اگر ہم پتھر کو کاٹ کر دیکھیں تو اس میں ہڈی کی شکل صاف دکھائی دیتی ہے۔ ذرا قرآن کریم کی یہ آیت دیکھیے

”وقالوا ء اذا کنا عظاماً و رفاتاً ء انا لمبعوثون خلقاً جدیداo قل کونوا حجارة اوحدیداً o اوخلقاً مما یکبر فی صدورکم فسیقولون من یعیدنا ط قل الذی فطرکم اول مرة..... (۱۷:۴۹۔۵۱)

ترجمہ: اور کہتے ہیں جب ہم ہڈیاں اور چورا چورا ہو جائیں گے تو کیا ازسرنو پیدا ہو کر اٹھیں گے؟ کہہ دو! کہ پتھر ہو جاؤ یا لوہا یا کوئی اور چیز جو تمہارے نزدیک (پتھر اور لوہے سے بھی سخت) بڑی ہو۔ (جھٹ کہیں گے کہ بھلا) ہمیں دوبارہ کون جلائے گا! کہہ دو! کہ وہی جس نے تم کو پہلی بار پیدا کیا۔“

تو یہ ہیں وہ حجری گھڑیاں جنہیں نہ صرف سائنس نے ڈھونڈا بلکہ مدتوں پہلے قرآن نے بھی ان کا ذکر کیا۔ لیکن صرف ہڈیاں ہی فاسل نہیں بنتیں، بال، جلد کے

Marfat.com

ٹکڑے، آنتوں میں موجود خوراک، پاخانہ، اور بعض اوقات تو گوشت تک فاسل بن جاتا ہے۔ برف کے اندر دبے، پورے کے پورے مردہ جسم بچ جاتے ہیں۔ الغرض زمین میں ہر زمانے کے فاسلز موجود ہیں اور اس ترتیب سے کہ جو ایک لاکھ سال پہلے فاسل بنا وہ نچلی تہہ میں ہوگا اور جو پچاس ہزار سال پہلے فاسل بنا وہ اوپر کی تہہ میں۔ ان کو حجری گھڑیاں کہتے ہیں۔ یہ کیسے معلوم ہوتا ہے کہ فاسل کی عمر کتنی ہے۔ فاسل سے عمر معلوم کرنے کے طریقے کو سائنس کی زبان میں (Dating) کہتے ہیں۔ دیکھا یہ جاتا ہے کہ فاسل میں موجود پتھر کی جو عمر ہوگی؟ ہڈی کی وہی عمر ہوگی۔ اب سوال یہ ہے کہ پتھر کی عمر کیسے معلوم ہوگی۔ یہ ایک نہایت دلچسپ تجربہ ہے۔ مادی کائنات جن کیمیائی اجزاء سے مل کر بنی ہے انہیں عناصر کہتے ہیں جن کی تعداد ایک سو چھ یا نو دریافت ہوئی ہے۔ ہائیڈروجن، ہیلیم، کاربن، ناوٹروجن، آکسیجن وغیرہ.......... عناصر ہیں۔ ان سب عناصر کو ان کے ایٹموں میں موجود الیکٹرانوں، پروٹانوں اور نیوٹرانوں کی تعدادادوں کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے۔ ہر عنصر کا ایک ایٹمی نمبر ہوتا ہے۔ ان عناصر میں بعض ایسے بھی ہیں جن سے توانائی کی لہریں ہر وقت خارج ہوتی رہتی ہیں۔ جس کے نتیجے میں ایک لمبی مدت کے بعد وہ عنصر بتدریج ضائع ہو کر نچلی سطح کے کسی اور عنصر میں بدل جاتا ہے۔ اسے ''ریڈی ایکٹو عنصر'' (Radioactive Element) کہتے ہیں۔ ایک عنصر میں کتنی مدت میں انتشار واقع ہوتا ہے؟ یہ مدت سائنسدانوں کو صحیح صحیح معلوم ہے۔ مثال کے طور پر ریڈیم کا عنصر ایک خاص مدت کے بعد سکہ (Lead) میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اگر ایک فاسل میں ریڈیم اور سکہ دونوں دھاتیں بیک وقت ہوں گی تو ان دونوں کی مقدار پہلے معلوم کی جائے گی اور پھر یہ دیکھا جائے گا کہ کتنا ریڈیم سکہ میں تبدیل ہو چکا ہے۔ ایک فیصد یورینیم چھ کروڑ ساٹھ

Marfat.com

لاکھ سال میں سکہ میں تبدیل ہو جائے گی۔ فاسلز کی (Dating) ڈیٹنگ زیادہ تر کاربن، پوٹاشیم اور آرگون کے ذریعے کی جاتی ہے۔

اس ڈیٹنگ (Dating) کی بنیاد پر علم معدنیات کے سائنسدانوں نے ایک ٹائم ٹیبل قائم کیا ہے جس سے زمینی پتھروں کی مختلف تہوں کی عمریں معلوم کی جاتی ہیں اور اس کی بنیاد پر تخلیق کائنات کے عمل کو سائنسدانوں نے پانچ مختلف ادوار میں تقسیم کر رکھا ہے۔ سائنس کی زبان میں ان کے نام یہ ہیں۔

۱۔ ایزوئیک (AZOIC)

۲۔ پروٹیروزوئیک (ProteroZOIC)

۳۔ پالائیڈزوئیک (PALAEDZOIC)

۴۔ میسوزوئیک (MESOZOIC)

۵۔ کینوزوئیک (CAINOZOIC)

یہ پانچ ادوار ہیں جنہیں سائنس نے تسلیم کیا اور چھٹا دور ہے...... وہ جب انسان کو شعور دیا گیا۔ ماسوائے علم نفسیات کے چونکہ سائنس کا شعور کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، اس لیے انسان کے چھٹے دور کو سائنسی گھڑیوں میں کوئی جگہ نہیں دی گئی۔

جبکہ یہ وہ دور ہے جب انسان نے نیکی اور بدی کی پہچان کے درخت کا پھل کھایا۔ حجری گھڑیاں عام گھڑیوں سے بھی زیادہ صحیح وقت دیتی ہیں۔ چنانچہ یہ قضیہ حل ہو چکا ہے کہ قرآن یا بائبل کے چھ دن..........

"فی ستہ ایام"

ترجمہ: چھ دنوں میں"

دراصل چھ طویل ترین ادوار ہیں۔

مخصوص تخلیق کا نظریہ، یہ ہے کہ ہر قسم کا حیوان یا پودا جو آج موجود ہے وہ بالکل اسی شکل میں معرض وجود میں آیا۔ جس شکل میں کہ وہ آج نظر آ رہا ہے۔ بائبل کے حوالے سے ہم پہلے اس نظریے پر کافی گفتگو کر چکے ہیں۔ اس نظریے کی رو سے ہر جاندار کو اسی شکل میں جیسی کہ اس کی اب ہے چھ دنوں کے دوران اچانک پیدا کیا گیا تھا۔ چنانچہ اس نظریے کے مطابق جب سے زندگی کا آغاز ہوا اس وقت سے لے کر آج تک کسی شے کی شکل نہیں بدلی اور کسی میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ چنانچہ انواع غیر متبدل ہیں اور نسلاً بعد نسلٍ اسی طرح چلی آ رہی ہیں۔

گزشتہ صدی تک بہت سے لوگ جن کے ساتھ بعض سائنس دان بھی شامل تھے...... مثلاً لیناکس، کوویئر، اگاسز اور اوون وغیرہ شامل ہیں......... نظریہ مخصوص تخلیق پر ہی یقین رکھتے تھے۔ نظریۂ ارتقاء بھی اگرچہ بہت قدیم تھا۔ لیکن محض فلاسفروں تک محدود تھا۔ قدیم یونانی فلاسفر، انیکسی مانڈر، ایم پی ڈوسل اور ارسطو (4 تا 6 صدی ق م) اپنے اپنے دور میں اس نتیجہ پر پہنچے کہ اشیا غالباً اتفاقیہ اور الگ الگ پیدا نہیں ہوئیں بلکہ یکے بعد دیگرے تسلسل سے وجود میں آئی ہیں۔ جس زمانے میں ابھی مغربی مفکرین.......... سائنس کی تحقیق کے خلاف تھے، عرب مسلمان سائنسدانوں مثلاً ابن باجہ، ابو نصر الفارابی اور امام ابن مسکویہ نے ارتقاء کے نظریے کو تقویت دی۔ سب جانتے ہیں کہ مسلمان علم کیمیاء کے موجد ہیں۔ جب انہوں نے دیکھا کہ حیوانات اور نباتات میں بنیادی عناصر ایک ہی ہیں تو ارتقاء پر ان کا یقین کامل ہو گیا۔ زمین کی سب چیزیں ایک دوسرے کو کھانے کے قابل اسی لیے ہوئیں کہ ان میں کیمیائی مادے ایک جیسے تھے۔ مسلمانوں کے بعد اہل مغرب نے نظریۂ ارتقاء پر کام کیا۔ اٹلی کے ایک طبیب فرانسسکو ریڈی نے سب سے پہلے اپنے تجربوں سے یہ ثابت کیا کہ مخصوص تخلیق

Marfat.com

کا نظریہ بے بنیاد ہے۔ پہلے یہ خیال عام تھا کہ دیر تک پڑے رہنے والے گوشت میں خود بخود سنڈیاں پڑ جاتی ہیں۔ ریڈی نے یہ ثابت کیا کہ جب تک گوشت پر مکھیاں نہ بیٹھیں سنڈیاں پیدا نہیں ہوتیں یہ سترھویں صدی کا واقعہ ہے۔

ڈارون سے پہلے لیمارک نے اس زاویے پر نگاہ ڈالی کہ انسان ارتقاء کے ذریعے پیدا ہوا۔ جین بپٹسٹ ڈی لیمارک فرانس کا.........علم تشریح الابدان کا ماہر تھا۔ جس نے 1801ء میں پہلی مرتبہ یہ نظریہ پیش کیا کہ مختلف حیوانات میں بتدریج نئی نئی صورتیں پیدا ہوئیں۔ لیمارک کا نظریہ فی زمانہ باطل تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کی بعض جزئیات کو اب بھی اصل نظریہ ارتقاء میں جگہ دی گئی ہے۔ لیمارک کا نظریہ یہ تھا۔

حیوانات کی شکل اور جسمانی تنظیم پر ماحول کا اثر ہوتا ہے۔ جسم کے کسی عضوء کو بار بار اور مسلسل استعمال کیا جائے تو وہ عضو بڑھ جاتا ہے اور جس عضوء کو استعمال نہ کیا جائے وہ ختم ہو جاتا ہے اور جو کچھ ماحول کے اثر سے اور مسلسل استعمال یا عدم استعمال سے حاصل یا ضائع ہوتا ہے وہ عمل تولید کے ذریعے اگلی نسل میں منتقل ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں جو تبدیلی، استعمال یا عدم استعمال سے ایک فرد میں پیدا ہوتی ہے وہ اگلی نسل کو منتقل ہو جاتی ہے۔ اپنے نظریے کے حق میں اس نے یہ دلیلیں دیں۔

۱۔ اس نے کہا کہ پرندے پہلے سطح زمین پر چلتے تھے۔ ایک خشکی کا جانور جب پانی کے اندر جاتا تھا تو پانی کے اندر بار بار چلنے کے لیے بار بار مسلسل پاؤں مارنا پڑتا تھا اس سے ٹانگوں کی طرف خون زیادہ منتقل ہوتا تھا۔ چنانچہ پاؤں کی انگلیوں کے درمیان جلد چپٹی ہو گئی جیسا کہ بطخوں میں ہے۔

۲۔ لیمارک نے دوسری مثال سانپ کی دی۔ سانپ بھی ایک خزندہ ہے۔ خزندے ٹانگوں پر چلتے ہیں۔ لیکن سانپ چونکہ جھاڑیوں کے اندر مسلسل رینگتا رہا اس

Marfat.com

لیے اس کی ٹانگیں گھس گئیں۔

۳۔ لیمارک نے تیسری مثال یہ دی کہ چھوٹی گردن والے جانور کھڑے ہو کر درختوں کے پتے کھاتے رہے۔ جب نچلے پتے ختم ہوتے تو اوپر کے پتوں کو حاصل کرنے کے لیے گردن کو لمبا کرنا پڑتا تھا۔ ایسا مسلسل کرنے سے گردن کی لمبائی بتدریج بڑھتی گئی اور ہر نسل میں زیادہ سے زیادہ لمبی ہوتی گئی۔ اس طرح زمانہ گزرنے کے بعد لمبی گردن والے جانور مثلاً اونٹ اور زرافہ وغیرہ پیدا ہو گئے۔

لیمارک کے نظریے پر اتنی شدت کے ساتھ اعتراضات ہوئے کہ اس عظیم شخص کے عظیم کام کو مارے ڈر کے نظر انداز کیا جانے لگا۔ لیمارک کے نظریات کو غلط ثابت کرنے کے لیے بعض لوگوں نے نہایت اوٹ پٹانگ تجربات کیے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ لیمارک غلط کہتا تھا۔ بعض لوگوں نے چوہوں پر اس طرح کے تجربات کیے۔ مثلاً چند چوہوں کی دُمیں کاٹ دیں۔ پھر ان کی اگلی نسل کی دُمیں بھی کاٹ دیں۔ اس طرح سات آٹھ نسلوں تک دُمیں کاٹتے رہے لیکن اگلی نسل میں پھر دُم پیدا ہوتی رہی اور اس طرح یہ ثابت کیا گیا کہ لیمارک کا عضویاتی تبدیلی کا نظریہ غلط تھا۔ حالانکہ یہ تجربہ درست نہیں تھا۔ اگر ان چوہوں کی دُمیں کسی دھاگے سے کس کر باندھ دی جاتیں تا کہ ان چوہوں کو زندگی بھر اذیت ہوتی رہے اور پھر ان کی اگلی نسل کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا جاتا اور پھر آئندہ کئی نسلوں کے ساتھ بھی.......... تو چوہے یقیناً اپنی مسلسل تکلیف سے تنگ آ کر دُم سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتے۔ ارتقاء کا یہ اصول ہے کہ اُس کے راستے میں آنے والی رکاوٹ جب وبالِ جان بن جاتی ہے تو اُسے ترک کر دیا جاتا ہے اور متبادل راستہ اختیار کیا جاتا ہے۔ ارتقاء کا جدید ترین نظریہ جس طرح کے الفاظ میں بھی بیان کیا جاتا ہے، وہ درست نہیں۔ درست تعریف یہ ہے جو میری نظر

Marfat.com

میں...... خالص قرآنی نظریہ ارتقاء ہے۔ اس تعریف کی رو سے کوئی مادی یا رُوحانی مشکل باقی نہیں رہتی، اور اس لحاظ سے یہ تعریف آئندہ زندگی کا بھی احاطہ کرتی ہے جس سے ڈارون یا دوسرے ارتقاء پرستوں کو انکار ہے۔ ارتقاء یہ ہے:

''کسی فرد کا اپنے داخلی یا خارجی ماحول میں موجود خدشات و خطرات اور مشکلات سے اس طرح نمٹنا کہ وہ ایک نئی توانائی حاصل کر لے، ارتقاء کہلاتا ہے۔''

دراصل ارتقاء کی شرط اولین یہ ہے کہ آپ کسی مشکل میں ہوں، کوئی روکاوٹ آپ کے راستے میں آ کر کھڑی ہو، جسے عبور کرنا آپ کے لیے لازمی ہو، بصورت دیگر آپ کو موت کا اندیشہ ہو، ایسی صورت میں آپ کیا کریں گے؟ آپ چاہے کسی بھی سطح کے جاندار ہیں، ایک جرثومہ ہیں یا انسان........ آپ لازمی طور پر اس مشکل سے نکلنا چاہیں گے۔ اگر اس مشکل سے نکلنے کے لیے آپ کوئی نیا عضو بدن تراش لیں یا کسی اور طرح کی توانائی حاصل کر لیں اور پھر اس توانائی کی بدولت آپ...... باہر نکل آئیں، یعنی اس مشکل سے باہر نکل آئیں...... تو گویا آپ نے ارتقاء کر لیا۔ مختصر یہ کہ ارتقاء کرنے کے لیے کسی روکاوٹ، کسی مشکل یا کسی ٹینشن کا ہونا بہت ضروری ہے۔ لیکن وہ رکاوٹ آپ کو روک نہ دے بلکہ آپ اس سے نبردآزما ہونے کے لیے اپنے اندر ایک نئی توانائی پیدا کر لیں۔ لیمارک کے مخالفین نے چوہوں کی دُمیں کاٹ دیں۔ دو ہی دنوں میں چوہوں کے زخم مندمل ہوئے اور چوہوں کی تکلیف جاتی رہی۔ اب بغیر تکلیف کے بھلا وہ اپنی نسل کو کیونکر دُم سے بچنے کی ہدایات منتقل کرتے۔ ہاں اگر ان کی دُمیں تمام عمر...... ان کے لیے ایک مسلسل دردِ سر (دردِ دم) ثابت ہوتیں تو وہ اپنی نسل کو جینز کے ذریعے یہ ہدایت منتقل کرتے کہ دُم اچھی چیز نہیں۔ یہ عمر بھر دُکھتی رہتی

ہے اور اس طرح چند نسلوں میں اس ہدایت کے منتقل ہونے کے بعد آہستہ آہستہ چوہے کی دُم کم ہونا شروع ہو جاتی اور بالآخر ایک دن ختم ہو جاتی۔ بے شک لیمارک نے اس طرح کی وضاحت کے ساتھ اپنا نظریہ پیش نہیں کیا تھا اور یہ بھی سچ ہے کہ لیمارک کی مثالیں درست نہیں تھیں۔ خاص طور پر سانپ اور پرندوں کے پیروں کی مثال۔ لیکن یہ بات درست نہیں کہ لیمارک کا نظریہ غلط تھا۔ مجھے تو نظریہ ارتقاء کے پاکستانی ماہر ڈاکٹر ''عبدالودود'' سے بھی اختلاف ہے۔ جو اپنی کتاب ''مظاہر فطرت اور قرآن'' میں لیمارک کے بارے میں یوں تحریر کرتے ہیں:

> ''شروع شروع میں (لیمارک کا) یہ نظریہ عام رہا لیکن اب باطل تصور کیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہاں تک تو درست ہے کہ ایک عضوء کے مسلسل استعمال سے یہ بڑھ جاتا ہے۔ جس طرح کہ ایک لوہار کا بازو.......... اور عدم استعمال سے سکڑ جاتا ہے۔ لیکن یہ غلط ہے کہ اس قسم کی اکتسابی تبدیلی نسلاً بعد نسلٍ چلتی ہے۔ ایک ورزشی جسم کے عضلات مضبوط اور موٹے ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ خصوصیت اس کی اولاد میں آگے نہیں چلتی۔ ایک کتے کی دُم کاٹ دی جائے تو اگلی نسل میں دُم کٹا کتا پیدا نہیں ہوگا۔ ہر نسل میں مسلسل کاٹتے جاؤ پھر بھی اس کا اثر آنے والی نسلوں میں نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نئی نسل کا جسم ماں باپ کے صنفی (جنسی) خلیوں سے بنتا ہے نہ کہ غیر صنفی خلیوں سے۔ اس کا تجربہ کاسل اور فلپ نے یوں کیا کہ ایک سفید رنگ کے مادہ گنی پگ (امریکی چوہا جو تجربات میں عام استعمال ہوتا ہے) کی

Marfat.com

اووریز یعنی تولیدی غدود نکال کر اس کی جگہ ایک سیاہ رنگ کی گنی پگ کے غدود چسپاں کر دیے۔ اس کے بعد اس سفید رنگ کی مادہ گنی پگ کو سیاہ رنگ کے نرگنی پگ سے دو مرتبہ ملایا گیا۔ چھ بچے پیدا ہوئے جو سب کے سب سیاہ تھے۔''

ڈاکٹر عبدالودود کے دُم کٹے کتوں والی بات کا معقول جواب پیچھے آچکا ہے۔ ڈاکٹر عبدالودود پاکستان کے بہت بڑے ماہر علم ''الابدان ہیں۔ انہوں نے اردو اور انگریزی میں کئی کتابیں لکھی ہیں۔ مظاہر فطرت اور قرآن اصل میں........ (Phenomenon of Nature and Quran) کے نام سے پہلے انگریزی میں شائع ہوئی۔ یہ اقتباس اسی کتاب سے لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالودود نے کسی فرد کی اکتسابی تبدیلی کو اگلی نسل میں منتقل ہونے کی بات سے انکار کیا ہے اور لیمارک کو اسی ایک نقطے کی وجہ سے غلط قرار دیا ہے۔ حالانکہ ڈاکٹر عبدالودود جیسے قرآن کے طالب علم کی نظر سے یہ آیت ضرور گزری ہوگی۔

''فَمَنْ یعمل مثقال ذرۃٍ خیرًا یرہ ○ و من یَعْمَلْ مثقال ذرۃٍ شرًا یرہ

ترجمہ: جس نے خیر کا ایک ذرہ کیا وہ اس کا نتیجہ دیکھے گا اور جس نے شر کا ایک ذرہ کیا وہ اس کا نتیجہ دیکھے گا۔ (۱۰۰: ۷، ۸)

اس کے علاوہ قرآن کی ایک اور آیت میں تو یہاں تک ہے کہ........ اس روز انسانوں کے ہاتھ اور پیر اور دیگر اعضائے بدنی سب کو زبان مل جائے گی اور سب بولیں گے........ ورزشی بدن یا فردِ واحد کی عضوی تبدیلی اگلی نسل میں ضرور منتقل ہوتی ہے۔ دراصل لیمارک کے مخالفین کو وہ تبدیلی اس لیے دکھائی نہیں دیتی کیونکہ وہ اتنی کم

Marfat.com

ہوتی ہے گویا نہ ہونے کے برابر۔ اس مقام پر عربی میں کہتے ہیں......... القلیل کا المعدوم.......... اتنی کم کہ نہ ہونے کے برابر۔

فزکس کے قاعدے کی رو سے ہر جسم دوسرے جسم کے لیے کشش رکھتا ہے۔ زمین، اسی قانون کی رو سے ہر چیز کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اسی کی بناء پر تمام قوانین ثقل اور قوانین کشش بنائے گئے ہیں لیکن ایک دوسرے کے نزدیک رکھے ہوئے دو پتھر یا دو اینٹیں ایک دوسرے کو کیوں نہیں کھینچ لیتیں؟ اس لئے کہ ان کے مابین پائی جانے والی کشش بہت کم ہے۔ بعینہ اسی طرح فردِ واحد کی جسمانی تبدیلی جو جینز کے ذریعے اگلی نسل میں منتقل ہوئی اتنی کم ہوتی ہے کہ دکھائی نہیں دیتی۔ اگر وہ تبدیلی مسلسل جاری رہے، کئی سال تک جاری رہے اور کئی نسلوں تک جاری رہے تو آخر ایک دن وہ اولاد میں نموذار ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ ایک ورزشی جسم کے مالک شخص نے اپنے جینز کے ذریعے اپنی اولاد کو مضبوط پٹھوں کی معلومات فراہم کر دیں۔ اب اگر اس کی اولاد بھی یہ کام جاری رکھے اور کئی نسلوں تک جاری رکھے تو اولاد میں مضبوط پٹھے منتقل ہو جائیں گے۔ ہم پہلوانوں کے خاندان کو دیکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح لوہار اور قصاب بھی اسی بات کا ثبوت ہیں۔ دُم کٹے کتوں نے بھی اپنی دُم کے کٹنے کے واقعہ کو ایک انفارمیشن کے طور پر اپنے جینز میں محفوظ کر لیا تھا۔ لیکن بعد ازاں اسے دُم کی تکلیف نہ رہی تو وہ واقعہ جینز کی ایک بھولی بسری یاد بن گیا۔ اسلامی نظریۂ ارتقاء تو یہ ہے کہ افراد کا ایک چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی جینز کے ذخیرۂ معلومات میں جمع ہو جاتا ہے۔ ماہرین نفسیات کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ مرد اور عورت کے عمل جفتی کے دوران پیش آنے والا ایک ایک لمحہ جینز میں منتقل ہو جاتا ہے اور پیدا ہونے والے بچے پر اس کا اثر پڑتا ہے۔ نفسیات کا لاشعور ہو یا حیاتیات کے جینز فرد کی زندگی کا ایک ایک لمحہ ان پر، یوں لکھ دیا

جاتا ہے گویا لوحِ تقدیر پر زندگی کا ایک ایک لمحہ لکھ دیا جائے۔ قرآن کریم میں جگہ جگہ بتائے گئے اعمال نامے کا اشارہ یقیناً لاشعور کے ریکارڈ روم یا جینز کی تختی کی طرف ہے۔

اور پھر ڈاکٹر عبدالودود کا یہ کہنا کہ نئی نسل صرف صنفی یعنی جنسی خلیات سے پیدا ہوتی ہے، غیر جنسی خلیات سے نہیں .... فی زمانہ بڑے زور و شور کے ساتھ مسترد کیا جا چکا ہے۔ علم حیاتیات کی نئی دریافت یعنی کلوننگ کا سارا دارومدار ہی غیر جنسی خلیات پر ہے۔ یہاں تک کہ 1992ء میں ایک بھیڑ جس کا نام ڈولی تھا........ پیدا کی گئی۔ جو ایک غیر جنسی خلیے سے پیدا کی گئی تھی۔ جو سات سال زندہ رہی اور جب مری تو سائنس کی دنیا میں کئی دن تک سوگ منایا گیا۔ کلوننگ یہ ہے کہ آپ کے جسم کا کوئی خلیہ مثلاً جسم کے کسی حصے کا گوشت، ہڈی یا خون کا خلیہ، لے کر اسے ''می اوسس اور مائی ٹوسس'' کے عمل سے گزار کے ایک سے دو اور دو سے چار بناتے ہوئے بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن وہ خلیہ ایک خاص ماحول میں گویا کسی رحم کے اندر پرورش پاتا ہے اور جب وہ ایک خلیے سے ہزاروں لاکھوں خلیوں میں نشو ونما پا جاتا ہے تو وہ پورے کا پورا وہی جاندار ہوتا ہے جس کے جسم سے خلیہ لیا گیا تھا۔ کتنی عجیب بات ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کسی سائنس فکشن فلم کا منظر بیان کیا جا رہا ہو۔ لیکن یہ حقیقت ہے اور پودوں پر لاتعداد تجربات کرنے کے بعد جانوروں پر اس کے بہت سے کامیاب تجربات کیے گئے ہیں۔ کلوننگ کا علم انتہائی تیزی سے اپنے پردے کھولتا چلا جا رہا ہے اور اب تو اس فن کے ماہرین یہ کوشش کر رہے ہیں کہ کسی طرح زمانہ قدیم میں ہلاک ہونے والے ڈائنا سارس اور برانٹو سارس کو دوبارہ پیدا کیا جائے۔ کیونکہ زمین پر جگہ جگہ ان دیوہیکل جانوروں کی ہڈیاں اور بعض دیگر اجزاء ملے ہیں۔ کلوننگ کے ماہرین کی یہ کوشش ہے

Marfat.com

کہ کسی طرح مادہ ڈائنوسارس کے رحم کا سا ماحول پیدا کرلیا جائے تو ڈائنا سارس کو دوبارہ پیدا کرنا ممکن ہو جائے گا۔ ذرا سوچیے! سائنس کیا کرنے والی ہے؟

اگر کلوننگ کی رفتار یہی رہی تو شاید زمین پر اب تک پیدا ہونے والے ہر ذی روح کو دوبارہ پیدا کیا جاسکے۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر سائنس کے لیے مُردوں کو ایک نئے پیکر میں سہی لیکن دوبارہ اٹھا دینا ممکن ہے تو پھر خالق عالم کے پاس یہ طاقت کیوں نہ ہوگی؟ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ ''یوم یُبعثون'' کے روز سب دوبارہ اٹھائے جائیں گے، کلوننگ کی تحقیقات کے بعد اب کس قدر بجا طور پر سمجھ میں آتا ہے۔ اب ذرا ایک مرتبہ پھر وہی آیت ملاحظہ کیجیے!

''وقالواء إذا كنا عظاماً و رفاتاء انا لمبعوثون خلقاً جديداo قل كونوا حجارة اوحديد o اوخلقاً مما يكبرفى صدور كم فسيقولون من يُعيدنا ط قل الذى فطر كم اول مرة......(۵۱:۴۹:۱۷)

ترجمہ: ''اور کہتے ہیں کہ جب ہم ہڈیاں اور چورا چورا ہو جائیں گے تو کیا از سر نو پیدا ہو کر اٹھیں گے۔ کہہ دو! کہ پتھر ہو جاؤ یا لوہا یا کوئی اور چیز جو تمہارے نزدیک (پتھر اور لوہے سے بھی سخت) بڑی ہو۔ (جھٹ کہیں گے کہ بھلا) ہمیں دوبارہ کون جلائے گا؟ کہہ دو! کہ وہی جس نے تم کو پہلی بار پیدا کیا۔''

اس آیت میں مرنے کے بعد ہڈیوں کے چورا چورا ہو جانے کا سوال اٹھایا گیا ہے اور پھر اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ چورا چورا تو کیا یہ اگر پتھر اور لوہا ہو جائیں تب بھی میں انہیں دوبارہ پیدا کرلوں گا۔ بالکل ویسے جیسے کہ یہ پہلے تھے۔ کیا یہ چور چور ہڈیاں اور پتھر یا لوہے کی طرح سخت ہو جانے والی ہڈیاں وہی فاسلز

Marfat.com

(Fossils) نہیں جو شب و روز ماہرین معدنیات کے ہاتھ لگ رہے ہیں۔ یقیناً انہی پرانی ہڈیوں کی طرف اشارہ ہے اور سائنس چاہ رہی ہے کہ ان پرانی ہڈیوں کے خلیات کا DNA لے کر ان جانداروں کو دوبارہ اٹھانے کی کوشش کی جائے۔ سائنس کا یہ دعویٰ ہے کہ اس طرح یہ بالکل ویسے کے ویسے اٹھیں گے جیسے کہ پہلے تھے۔ انہوں نے یہ دعویٰ پوری دنیا کے سامنے ثابت کیا ہے۔ ڈولی کی پیدائش میں کسی ایک سائنسدان کا ہاتھ نہیں تھا بلکہ ہر ملک کے نہ جانے کتنے سائنسدان اور نہ جانے کتنا پیسہ ہمہ وقت کلوننگ کے تجربات پر صرف ہو رہا ہے۔ ڈولی ایک بھیڑ تھی۔ اس کی ماں کے جسم کا ایک خلیہ لے کر اس کی کلوننگ کی گئی تھی۔ یعنی اسے کچھ خاص مراحل سے گزار کر رحم مادر میں رکھ دیا گیا تو وہ ایک جنسی خلیہ بن گیا۔ وہ خود بخود جنسی خلیے میں تبدیل ہو گیا اور وہ بھی ایسا جنسی خلیہ جو سپرم یا ایگ (Egg) نہیں بلکہ زائیگوٹ تھا۔ وہ ایک سے دو ہوا، دو سے چار اور یوں رحم مادر میں وہ پرورش پا کر ایک دن ڈولی بن گیا۔ ڈولی پیدا ہوئی تو پوری دنیا میں خوشیاں منائی گئیں۔ اسے سات سال تک کسی لاڈلے بچے کی طرح پالا گیا۔ اس کی خوراک، اس کے اُٹھنے بیٹھنے اور سونے جاگنے تک کا خیال رکھا جاتا تھا۔ سائنسدان یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ وہ کتنا جیتی ہے اور پھر ڈولی سات سال زندہ رہنے کے بعد مر گئی اور اب تو دھڑا دھڑ کلوننگ کے تجربات کیے جا رہے ہیں۔ جو مسلسل کامیابیوں اور ناکامیوں سے برابر ہمکنار ہوتے ہوئے آگے سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر عبدالودود کی یہ بات درست نہیں کہ نسل صرف جنسی خلیے سے چلتی ہے اب تو یہ ثابت ہے کہ نسل کسی بھی خلیے سے چل سکتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ افزائش نسل کے لیے جنسی خلیہ ضروری نہیں۔ ظاہر ہے جب جنسی خلیہ ضروری نہیں تو جنسی عمل بھی ضروری نہیں۔ خدا نے تو اس لیے یہ عمل بنایا تھا کہ اس کی

لذت بچے پیدا کرنے کے لیے مخلوقات کو مائل کرے۔ ایک پھل میں مٹھاس محض اس لیے ہوتی ہے تاکہ اسے شوق سے کھایا جائے اور اس کے بیج زمین پر گر کر نسل بڑھائیں۔ لیکن اب تو انسان نے ثابت کر دیا ہے کہ جنسی عمل کے بغیر بھی بچہ پیدا کیا جاسکتا ہے۔ یہ کتنی عجیب بات ہے۔ بظاہر اس میں یہ خامی دکھائی دیتی ہے کہ کلوننگ کے ذریعے پیدا کیا جانے والا بچہ تو اپنے ماں یا باپ کی ہو بہو نقل ہوگا۔ دونوں کے ملاپ سے پیدا ہونے والا ایک نیا انسان نہیں ہوگا۔ لیکن یہ خامی اتنی بڑی نہیں۔ کیونکہ جب وہ پیدا ہوگا تو اس کے سامنے ایک طویل زندگی بھی تو ہوگی۔ اس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس کے جینز پر اثرات مرتب کرے گا اور اس کے ایک ایک لمحے کا ہر ہر اثر اس کے جسم کے ہر ایک خلیے پر یکساں پڑے گا حتیٰ کہ اس کے دل میں گزرنے والے خیالات کی لہریا اس کی نیند میں آنے والا خواب، الغرض اس کا ہر داخلی یا خارجی لمحہ کسی اٹل تقدیر کی طرح لکھا جائے گا اور اس کے بدن کے ایک ایک خلیے میں جذب ہو جائے گا۔ بدن مادی ہے۔ لیکن پھر بھی ایک گواہ کے طور پر اللہ تعالیٰ نے بدن کا ہر ہر خلیہ اعمال کا ریکارڈ روم بنا دیا ہے اور کلوننگ کے ذریعے ہو بہو وہی جاندار دوبارہ پیدا کیا جاسکتا ہے۔ بدن مادی چیز ہے، چنانچہ اللہ نے ایک اور انتظام بھی کیا ہے۔ جہاں زندگی کے ہر لمحے کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے اور وہ ہے لاشعور۔ جدید سائنس کی تحقیقات کے مطابق لاشعور وہ مقام ہے جہاں زندگی کے ہر لمحے کی معلومات رکھی ہیں۔ ہم اگر لاشعور میں جھانک سکیں تو ہم یہاں تک جان سکتے ہیں کہ ہم نے سات جنوری 1988ء کے دوپہر لنچ (Lunch) میں کون کون سی چیز کھائی تھی، جدید نفسیات نے نہ صرف لاشعور کو دریافت کرلیا ہے بلکہ فرائڈ کے زمانے سے لے کر اب تک ہزاروں بار عمل تنویم (Hepnotism) کے ذریعے لاشعور کی کھوج لگائی گئی ہے اور اب تو یہ امریکی

Marfat.com

ماہرین نفسیات کا ایک عام استعمال ہونے والا طریقۂ علاج بن چکا ہے۔

بدن کے پاس بھی سب معلومات ہیں یہاں تک کہ بدن مٹی میں مل کر چورا چورا ہو جائے تو بھی ڈی این اے (DNA) سلامت رہتا ہے اور اس میں جاندار کی زندگی کے ایک ایک لمحے کی رپورٹ ہوتی ہے صرف اپنی زندگی کے لمحات ہی کی نہیں بلکہ ازل سے لے کر اپنی پیدائش تک اپنے تمام آباؤ واجداد کے ہر لمحے کی معلومات ایک چورا چورا ہڈی جو پتھر یا لوہا ہی کیوں نہ بن چکی ہو' میں پائے جانے والے مردہ خلیات کے ڈی این اے (DNA) میں محفوظ ہوتی ہے۔ سائنسدان جینز (Jenes) کو کمپیوٹر چپؒ (Chip) کے مترادف سمجھتے ہیں۔ؒسیل (خلیہ) مردہ ہوتے ہیں لیکن ڈی این اے (DNA) کی ریل پر تمام معلومات کسی جہاز کے بلیک باکس کی طرح محفوظ ہوتی ہیں۔ آپ نے دیکھا؟ بدن کے ایک ایک خلیے کے پاس چاہے وہ مٹی میں مل کر کروڑوں سال پرانا ہو چکا ہو، بھی یہ معلومات ہوتی ہیں اور روح کے مرکز باطن جسے جدید نفسیات نے لاشعور کہہ رکھا ہے......... میں بھی زندگی کے ایک ایک لمحے کی رپورٹ ہوتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے فرد، خود لوح تقدیر ہے۔ سراپا تقدیر۔ لیکن ایک ایسی تقدیر جو دوبارہ پیدا ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے اور خود اپنی کہانی رقم کرتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ہم سر سے پاؤں تک اپنے اعمال کے خود گواہ ہیں۔ ہمارے ہاتھ. ہمارے پاؤں' ہمارے اعضائے بدن اور ہمارا ضمیر' سب کچھ ہمہ وقت......... ہمارے گواہ ہیں۔ ہماری تنہائیوں میں ہم پر نظر رکھنے والے، ہمارے اعمال کے ایک ایک لمحے کا ریکارڈ محفوظ کرنے والے......... ہاں یہ سب ہمارے گواہ ہیں۔ ہمارے ہاتھ، ہمارے پیر، اعضائے بدن' ہمارا ضمیر۔ یوں لگتا ہے جیسے ہم اپنے سامنے--- آنے والے کروڑوں سال تک ننگے رہیں گے۔ ہم نے جو کچھ کیا کروڑوں سال بعد

بھی اسے دیکھا جا سکے گا۔ ذرا غور تو کیجیے! آپ کے ذہن میں کون کون سی کڑیاں مل رہی ہیں؟ کیا یہ بات کہ ہم اپنے گواہ خود ہیں کچھ ویسی ہی نہیں جیسی یہ کہ ہمارے اندر خدا ہے اور وہ ہمیں ہمہ وقت دیکھ رہا ہے۔ ہاں ایسا ہی ہے۔ یہ خدا ہی کا تو انتظام ہے جس نے ہمارے اعمال پر نظر رکھنے کے لیے خود ہم ہی کو مقرر کر دیا۔

يُنَبَّؤُ الْإِنسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَأَخَّرَ ٥ بَلِ الْإِنسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ٥ (۷۵:۱۳،۱۴)

ترجمہ: اُس دن آدمی کو اُس کا سب اگلا پچھلا جتا دیا جائے گا۔ بلکہ آدمی خود ہی اپنے حال پر پوری نگاہ رکھتا ہے۔ (ترجمہ: مولانا احمد رضا خان بریلویؒ)

الغرض لیمارک کا خیال زیادہ قرین قیاس تھا کہ فرد واحد کی عضوی تبدیلی نسل میں منتقل ہوتی ہے۔ جسے بعد والے ماہرین حیاتیات نے مسترد کر دیا اور ان کے مسترد کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ انہیں اگلی نسل میں فوری طور پر کوئی تبدیلی نظر نہ آتی تھی۔ انہوں نے چوہوں کی دُمیں کاٹ کر دیکھا اور جب کٹی ہوئی دُمیں اگلی نسل میں منتقل نہ ہوئیں تو لیمارک کے نظریے کو مسترد کر دیا۔ یہ ایک احمقانہ حرکت تھی۔ حالانکہ چارلس ڈارون نے خود لیمارک کو اپنی کتاب میں بہت اہم جگہ دی ہے اور لیمارک کے عضوی تبدیلی کے نظریے کو تسلیم کیا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ نظریۂ ارتقاء ڈارون یا لیمارک کے نظریہ ارتقاء سے بہت مختلف ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے نظریات مسترد کر دیے گئے ہیں۔ بلکہ جدید نظریہ تو ان تمام نظریات کی ترقی یافتہ شکل ہے اور اگر دیکھنے والی آنکھ کسی مسلمان کی ہو تو جدید نظریہ ارتقاء کے بعد ایک اور نظریہ ارتقاء سامنے آتا ہے جسے ہم اسلامی نظریۂ ارتقاء یا جدید

Marfat.com

ترین نظریۂ ارتقاء کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ اس نظریہ کی رو سے ''آخرت'' عملِ ارتقاء کی ایک لازمی کڑی کے طور پر پیش آنے والی ہے اور اس طرح یہ نظریہ مرنے کے بعد کی زندگی کو بھی ثابت کر کے دکھاتا ہے۔ جو ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی ہے۔

لیمارک کے بعد ڈارون نے نظریۂ ارتقاء پیش کیا اور کبھی نہ ختم ہونے والی شہرت پائی۔ لیکن ڈارون نظریاتی طور پر ''نیچری'' تھا۔ وہ خدا کو نہیں مانتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی آنکھیں مادے کی دیوار سے پار نہ دیکھ سکیں اور نظریۂ ارتقاء کا سب سے بڑا علمبردار ہونے کے باوجود وہ آخرتِ کا ادراک حاصل نہ کر سکا۔ کچھ کم علم لوگوں نے ....اور کچھ سنسنی خیز باتیں پھیلا کر پیسہ بٹورنے والے اخبار نویسوں نے ڈارون کے متعلق ایسی چیزیں منسوب کر رکھی ہیں .... جو غلط ہیں۔ نظریۂ ارتقاء کسی ایک شخص کے دماغ کی پیداوار نہیں۔ یہ نظریہ خود ارتقائی مراحل سے گزرا ہے۔ ڈارون نے جو کچھ نظریۂ ارتقاء کے متعلق کہا تھا اسے اب پوری طرح تسلیم نہیں کیا جاتا لیکن اس کے باوجود ارتقاء کے نظریے میں اس کا حصہ اہم ہے۔ موجودہ زمانے میں ارتقاء کا نظریہ پوری طرح سمجھ میں آ چکا ہے۔

چارلس ڈارون جو 1809ء میں پیدا ہوا۔ اور 1882ء میں مرا، ایک محنتی اور وسیع النظر نیچری تھا۔ جوانی کی عمر میں 1831ء سے 1836ء تک پانچ سال کا عرصہ اس نے ''بیگل'' جہاز میں جنوبی امریکہ، گالا پاگوس (Galapagoes) جزیرے اور دوسری جگہوں سے مختلف قسم کے حیوانات اور پودے جمع کیے اور ان پر تحقیق کے بعد اس نے اپنی مشہور زمانہ کتاب لکھی جس کا نام تھا:

"On the origin of species by means of Natural selection __or__ preservation of favoured race in

the struggel for life"

ترجمہ: انواع کا قدرتی انتخاب کے ذریعے پیدا ہونا...........

یا......... رعایت یافتہ انواع کا زندگی کی تگ و دو میں باقی رہنا۔"

اس کتاب میں اس نے اپنا نظریہ پیش کیا۔ اسی زمانے میں ایک دوسرے سائنسدان ''الفریڈ رسل ویلس'' نے یہی نظریہ پیش کیا۔ مختصر الفاظ میں نظریہ حسب ذیل ہے:

۱۔ کارخانہ قدرت میں افراد اور انواع کے اندر ہر درجہ کا تبدل پایا جاتا ہے۔

۲۔ ہر نوع کا تعداد میں بڑھنے کی طرف رجوع بڑی حد تک موجود ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ انواع کی آبادی قریباً ایک جیسی رہتی ہے۔ کیونکہ دشمن کے حملے، بیماری، مقابلہ اور موسم کی وجہ سے افراد ختم ہو جاتے ہیں۔

۳۔ زندگی کو بچانے کے لیے کشمکش جاری ہے۔ جن افراد کی امتیازی خصوصیات حالات کا مقابلہ نہیں کر سکتیں وہ مٹ جاتے ہیں اور جن کی امتیازی خصوصیات موافق ہوں وہ زندہ رہتے ہیں اور تولیدی عمل سے آگے بڑھتے ہیں۔

۴۔ اس لیے قدرتی انتخاب کا عمل جاری ہے۔ جس سے رعایت یافتہ انواع باقی رہتی ہیں۔ چنانچہ ڈارون اور ویلس دونوں نے ماحول کو قدرتی انتخاب کا ذریعہ قرار دیا۔

ڈارون کے زمانے میں ابھی وراثت کے قوانین معلوم نہین تھے۔ اسلیے ڈارون ان نتائج تک نہ پہنچ سکا جن پر ماہرین ارتقاء اس وقت پہنچے ہوئے ہیں۔ دراصل ''جان گریگر مینڈل'' کے تجربات سے حیاتیات، خاص طور پر وراثت کے علم میں بے پناہ

Marfat.com

اضافے ہوئے ہیں۔ اس نے وراثت کے قوانین پیش کیے اور ڈارون کے قدرتی انتخاب کو بڑے ریاضیاتی طریقے کے ساتھ سچ ثابت کر دکھایا ہے۔ لیکن اس کے تجربات سے ڈارون کی بعض باتوں کو رد بھی کرنا پڑا۔ جن کا ذکر تھوڑا سا آگے چل کر آپ دیکھیں گے۔ ڈارونؒ نے یہ درست کہا تھا کہ عام حالات میں حیوانات کی تعداد میں بے حد اضافہ نہیں ہوتا۔ مختلف انواع کی آبادی بعض رکاوٹوں کی وجہ سے قریباً ایک ہی سطح پر رہتی ہے۔ خوراک کی کمی، پناہ گاہ یا انڈے، بچے دینے کی جگہ کا میسر نہ ہونا وغیرہ۔ ڈاکٹر عبدالودود نے ڈارون کی تھیوری پر مندرجہ ذیل تبصرہ کیا ہے:

"ضروریات کے حصول کے لیے افراد میں مقابلہ ہوتا ہے اور اُن انواع میں بھی جن کی ضروریات اسی قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک بڑھتی ہوئی آبادی پیراسائیٹس [1] (Parasites) اور بیماریوں کے لیے زرخیز بن جاتی ہے۔ زندہ رہنے کے لیے کشمکش ضرور موجود ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جانوروں کے درمیان ہر وقت ایک جنگ جاری ہے۔ یہ درست ہے کہ ایک شکرا کسی چڑیا کو اٹھا کر لے گیا یا ایک شیر کسی بکری کو اٹھا کر لے گیا۔ لیکن ان سے کتنے فیصد پرندوں اور بکریوں کا نقصان ہوتا ہے؟ جو لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں پیدا ہوتے ہیں۔ دراصل زندہ رہنے کی تگ و دو ایک قدرتی، مسلسل عمل ہے۔ جس کے کئی پہلو ہیں اور ہر پہلو کچھ افراد کے ضائع ہونے کا ذمہ دار ہے۔ یہ ضیاع، انواع کی زندگی کے چکر کے کسی مرحلہ پر واقع ہوسکتا ہے۔ مثلاً جانور، ہزاروں، لاکھوں کی تعداد میں

۱۔ (دگر پرورده۔ ایسے جاندار جو دوسرے جانداروں کے جسم پر زندہ رہتے ہیں

انڈے دیتے ہیں۔ان میں سے اکثر بارآور نہیں ہوتے اور ضائع ہو جاتے ہیں اور جو بارآور ہونے کے بعد جھتے بنتے ہیں ان میں سے جو بچے پیدا ہوتے ہیں وہ اکثر جوان ہونے سے پہلے مر جاتے ہیں اور جو جوان ہو کر اگلی نسل پیدا کرتے ہیں، اس نسل میں سے اکثر ماحول کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

لیکن اس طرح جانوروں کی تعداد میں چھانٹی قدرتی انتخاب کی وجہ نہیں بنتی۔اس سلسلے میں دو اعتراضات نمایاں ہیں۔

۱۔ پہلا یہ ہے کہ جاندار افراد سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ یہ اختلافات کیسے پیدا ہوئے؟ مثلاً کسی انسان کی شکل کسی دوسرے سے نہیں ملتی یہ کیوں ہے؟ ڈارون کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔اس کے لیے وہ لیمارک کا پیش کردہ وراثت کا تخیل پیش کرتا ہے۔جس میں لیمارک نے کہا تھا کہ.........

کمائی ہوئی اکتسابی (Acquired characteristics) خاصتیں نسلاً بعد نسلٍ آگے بڑھتی ہیں۔

۲۔ ڈارون کے نظریے کے خلاف دوسرا اعتراض یہ تھا کہ اگر معاملہ افراد کی تعداد میں چھانٹی کرنے تک محدود ہے تو اس سے نئی نئی صنفیں اور نئی نئی خصوصیات کیسے پیدا ہوئیں؟ ناولٹی (Novelty) کے پہلو کو......حل کرنے کی کیا صورت ہے؟

یہ وہ اعتراضات ہیں جو ڈارون کے نظریہ پر اب تک مجموعی طور پر کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالودود جیسے دانا شخص نے انہی اعتراضات کو اہمیت دی۔ہم ان اعتراضات کو

دو قدم آگے چل کر دیکھتے ہیں۔ سردست یہ عرض ہے کہ مذکورہ بالا اعتراضات کے علاوہ بھی بہت سے اعتراضات ڈارون پر کیے گئے۔ لیکن وہ سائنسدانوں کی طرف سے نہیں تھے۔ یہ اعتراضات غیر سائنسی لوگوں اور مذہبی طبقہ کی طرف سے ڈارون کے نظریے کی غلط تعبیر کرنے پر شروع ہوئے خاص طور پر انگریزوں اور جرمنوں نے تو ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کو بہت ہی غلط معنوں میں سمجھا۔ ان لوگوں نے یہ فرض کر کے کہ قدرتی انتخاب کا مطلب .... (Struggle for Existence)...... زندگی کے لئے تگ و دو ہے اور پھر اس کے بعد ان لوگوں نے خود کئی نعرے گھڑ لیے۔ مثلاً "Survival of the fittest" یعنی جو زیادہ مضبوط ہے وہ زندہ رہے گا اور اس طرح ان لوگوں نے مائیٹ از رائیٹ (Might is right) یعنی جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے قانون کو تمام دنیا کے انسانوں کے لیے آخری قانون قرار دے دیا۔ سب سے پہلے برطانیہ کے انگریزوں نے اس نعرے کو اپنایا اور پوری دنیا پر چڑھ دوڑے.......... یوں پہلی جنگ عظیم ہوئی۔

پھر انگریزوں کے بعد ہٹلر نے نازی قوم کی بالادستی کا نعرہ لگایا اور وہ پوری دنیا پر چڑھ دوڑا........... یوں دوسری جنگ عظیم ہوئی۔

دو عظیم جنگوں سے بھی اہل زمین نے سبق نہ سیکھا اور ہر قوم نے اپنے اپنے لیے اسی نعرے کو راہ نجات سمجھا۔ یوں نیشنلزم کا عفریت پوری دنیا پر چھا گیا۔ جہاں ملتِ آدم بننی چاہیے تھی، وہاں اقوام متحدہ بنائی گئی اور ہر قوم اپنے اپنے حق کے لیے لڑنے لگی۔

ڈارون مسلمان ہوتا تو اس کے نظریے سے یوں شیطانی نتائج مرتب نہ ہوتے۔ وہ مادہ پرست تھا چنانچہ اس کے نظریہ کی غلط تعبیر زیادہ مقبول ہوئی اور انسانیت کے ہاتھ سے روحانیت کا دامن چھوٹ گیا۔ اس طرح ''قدرتی انتخاب'' کو ایک منفی اور تباہ کن نظریہ گردانا

Marfat.com

جانے لگا۔ اس سے بہت ناخوشگوار نتائج پیدا ہوئے پہلا یہ کہ ڈارون نے ارتقاء کے عمل کو واضح کرنے میں جو مثبت کردار ادا کیا تھا...... یعنی قدرتی انتخاب کا تخلیق پہلو، وہ غلط پروپیگنڈا کے نیچے آ کر دب گیا۔ دوسرا ناخوشگوار نتیجہ یہ پیدا ہوا کہ عام لوگوں نے یہ سمجھنا شروع کر دیا کہ ڈارون کے نظریے کا منفی پہلو آخری چیز ہے۔ چنانچہ ارتقاء کے تخیل ہی کو مضحکہ خیز قرار دیا جانے لگا۔ ہمارے مذہبی پیشوا آج بھی نظریۂ ارتقاء کے خلاف ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم کے اندر ارتقاء کا نظریہ جگہ جگہ بکھرا پڑا ہے۔

مینڈل نے اس نظریے کو جسے ڈارون اور ویلس نے شروع کیا تھا، نقطۂ تکمیل تک پہنچایا۔ مینڈل کا نظریۂ نظریہ وراثت کے طور پر مشہور ہے۔ اس نے قوانین وراثت پیش کیے جن کی رو سے ایک نسل کی خصوصیات کا اگلی نسلوں میں منتقل ہونا ایک لگے بندھے اور نپے تلے ریاضیاتی طریقہ کی بدولت ممکن ہوتا ہے۔ مینڈل کا نظریہ 1886ء میں شائع ہوا تھا۔ لیکن 1900ء تک اسے بہت کم لوگ جانتے تھے۔ دراصل ارتقاء کا موجودہ نظریہ کسی ایک ذہن کا کارنامہ نہیں۔ یہ بیسویں صدی کے پہلے نصف حصے میں پایۂ تکمیل کو پہنچا لیکن در حقیقت یہ توریت، قدیم یونانی فلاسفہ اور پھر قرآن حکیم میں واضح طور پر بیان ہونے کے بعد مسلمان مفکرین کے ہاتھوں سے گزرتا ہوا مغربی مفکرین تک پہنچا۔ 1875ء میں سائنسدانوں نے تولیدی خلیوں پر ریسرچ شروع کی اور ان خلیوں کے عملِ تولید کے ساتھ تعلق پر سوچ بچار کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد تجرباتی نسل کشی پر توجہ دی گئی۔ اس سے علم کا ایک بے بہا ذخیرہ ہاتھ آیا اور صاف طور پر واضح ہو گیا کہ حیوانات میں مختلف شکلیں کیسے وجود میں آئیں اور یہ نسلاً بعد نسلٍ کس طریق سے آگے چلتی ہیں۔ جدید ترین ریسرچ، ''تجرباتی بارآوری'' .... (Experimental Fertilization) کے ساتھ ساتھ تخلیقی خلیوں میں تبدیلی پر بھی ہوئی۔ اس کو اصطلاحاً سائیٹو جینٹکس (Cytogenetics) کہتے

Marfat.com

ہیں۔تولید کے عمل میں جینز کی بے پناہ اہمیت ہے۔جینز کیا ہیں؟

ا۔ خلیے کا مرکز نیوکلیئس ہوتا ہے۔ نیوکلیئس میں کروموسومز ہوتے ہیں۔ ہر کروموسوم دو کرومیٹڈ ز سے مل کر بنتا ہے۔ ہر کرومٹیڈ پر جینز ہوتے ہیں اور یہ افراد میں مختلف خاصیتیں پیدا کرنے کے حامل ہوتے ہیں۔

۲۔ایک جیسے کروموسومز کے جوڑوں میں خود بخود علیحدگی کا عمل واقع ہوتا ہے۔ اس طرح ایک خلیہ دو خلیات میں تقسیم ہو جاتا ہے۔جنہیں دختر خلیے (Daughter Cells) کہتے ہیں۔نئے پیدا ہونے والے خلیوں میں اصل کروموسوم کی آدھی تعداد تقسیم ہو جاتی ہے۔

۳۔ نر اور مادہ کے کروموسومز یکجا ہو کر جفتہ بناتے ہیں جس میں نر اور مادہ کے مخلوط کروموسومز ہوتے ہیں۔

۴۔جینز میں اچانک تبدیلی کے عمل کو بیالوجی میں میوٹیشن (Mutation) کہا جاتا ہے۔ چنانچہ جینز کے تبادلے اور میوٹیشن کے ذریعے اگلی نسلوں کی شکلوں اور خاصیتوں میں اختلاف پیدا ہوتا ہے۔جو ہر نسل میں آگے چلتا ہے۔

جنسی عمل کے ذریعے کروموسومز کے نئے قسم کے جوڑوں کا بننا اور میوٹیشن یعنی یک لخت تبدیلی کے ذریعے......... جو نسلیں پیدا ہوتی ہیں ان میں نئی اور پرانی خصوصیات آپس میں مل جل جاتی ہیں اور اس طرح حیوانات کی مختلف قسمیں بڑھتی جاتی ہیں۔لیکن قدرتی انتخاب کا عمل اس کے برعکس ہوتا ہے۔اس سے نئی قسموں کے پیدا ہونے کا امکان کم ہو جاتا ہے۔کیونکہ جو نئی خصوصتیں یا حیوانات کی نئی قسمیں نئے ماحول کے مطابق نہیں ہوتیں.......... فنا ہو جاتی ہیں۔گویا قدرتی انتخاب راستے کی وہ رکاوٹ ہے جو صرف ان افراد کو آگے بڑھنے دیتا ہے جو ماحول کے موافق ہوں اور ان

Marfat.com

کو روک لیتا ہے جو ماحول کے موافق نہ ہوں۔

ارتقاء کے عمل کی بنیاد ہر نسل میں چلنے والی تبدیلی (Variation) ہے۔ جو کسی آبادی کے افراد میں پیدا ہوتی ہے۔ کسی نوع کے افراد کا وہ گروہ جو ایک جغرافیائی حد کے اندر بستا ہے.......... آبادی (Population) کہلاتا ہے۔ اس گروہ کے افراد اپنی آبادی کے اندر باہمی جنسی ملاپ کرتے ہیں۔ جسے اصطلاحاً انٹر بریڈ (Interbreed) کہتے ہیں۔ کبھی کبھی ایک آبادی کے افراد کسی دوسری آبادی سے بھی باہمی جنسی ملاپ کر لیتے ہیں۔ چنانچہ آبادیوں کے اندر باہمی جنسی ملاپ سے جینز کا آزادانہ تبادلہ ہوتا ہے اور وقت گزرنے کے بعد یا نئی نسلیں پیدا ہونے سے جینز مکمل طور پر آپس میں مل جل جاتے ہیں۔ ہر نسل میں جنسی ملاپ اور میوٹیشن کے ذریعے بعض افراد میں نئی نئی خصوصیات پیدا ہوتی جاتی ہیں اور اگر یہ افراد زندہ رہیں اور اولاد پیدا کریں تو یہ نئی خصوصیات قدرتی انتخاب کی چھلنی سے گزر کر اس آبادی میں پھیلتی جاتی ہیں۔

صاف ظاہر ہے کہ جو افراد زیادہ اولاد پیدا کریں گے ان کے جینز آبادی کے جین پول (Gene pole) یعنی جینز کے کنڈ میں زیادہ جمع ہو جائیں گے۔ بہ نسبت ان لوگوں کے جن کی اولاد کم ہو۔ جب بعض افراد میں نئی خصوصیات پیدا ہوتی ہیں اور ان کی اولاد زیادہ بڑھتی جاتی ہے تو آبادی میں نئی خصوصیات عام ہوتی جاتی ہیں حتی کہ اس کا مستقل حصہ بن جاتی ہیں۔

مذکورہ بالا تشریحات کو سمجھنے کے لیے ہم ''کارل ساگان'' کی پیش کردہ ایک شہادت کا سہارا لیتے ہیں جسے ہم گزشتہ صفحات میں بھی بیان کر چکے ہیں۔ کارل ساگان نے ایک عجیب شہادت پیش کی۔ اگر چہ اپنی اس مثال کو کارل ساگان نے قدرتی کے

Marfat.com

مقابلے پر مصنوعی انتخاب کا نام دیا لیکن اس سے ہمیں قدرتی انتخاب کے عمل کی بہت آسانی کے ساتھ سمجھ آسکتی ہے۔ جاپان کے ایک جزیرے پر یہ خیال عام ہے کہ وہاں سمندر کے پانی میں سموِرائی سپاہیوں کی بے چین روحیں کیکڑوں کی شکل میں آوارہ پھرتی رہتی ہیں۔ کارل ساگان کے الفاظ یہ ہیں:

''یہاں ایسے کیکڑے پائے جاتے ہیں جن کی کمر پر عجیب نشانات اور پیٹرن ہیں۔ جو حیرت انگیز طور پر سمورائی لڑاکوں کی شکل سے ملتے ہیں۔ پکڑے جانے پر یہ کیکڑے کھائے نہیں جاتے بلکہ Danno---ura کی دردناک جنگ کے احترام میں واپس سمندر میں چھوڑ دیے جاتے ہیں۔

یہ داستان ایک خوبصورت مسئلہ کھڑا کر دیتی ہے۔ یہ کیسے ہوتا ہے کہ ایک کیکڑے کی کمر پر سمورائی لڑاکے کی تصویر بنی ہو۔ جواب یہی ہوسکتا ہے کہ انسانوں نے وہ تصویر بنائی ہوگی۔ کیکڑے کی کمر پر بنی ہوئی سمورائی کی تصویر نسل در نسل چلی آرہی ہے۔ کیونکہ انسانوں کی طرح کیکڑوں کی نسل کے مختلف سلسلے ہیں۔ فرض کریں اتفاق سے کسی کیکڑے کے آباؤ اجداد میں کسی ایک کی کمر پر ایسے نشانات تھے جو کسی حد تک انسانی چہرے سے ملتے تھے۔ Danno---ura کی جنگ سے بھی پہلے مچھیرے، ایسے نشانات والے کیکڑے کھانے سے پرہیز کرتے ہوں گے۔ انہیں واپس سمندر میں پھینکنے سے ارتقاء کا عمل شروع ہوا۔ اگر آپ کیکڑے ہیں اور آپ کی کمر تمام کیکڑوں جیسی ہے۔ تو لوگ آپ

کو کھالیں گے۔ آپ کی نسل بہت کم بچے گی۔ لیکن اگر آپ کی کمر پر کوئی شکل بنی ہے تو آپ کو سمندر میں واپس پھینک دیا جائے گا اور آپ کی نسل پھلتی پھولتی رہے گی۔ جیسے جیسے کیکڑوں اور مچھیروں کی نسلیں گزرتی رہیں۔ وہ کیکڑے جن کی کمر پر سمورائی کے چہرے جیسے نشانات تھے، ترجیحی طور پر زندہ رہے، یہاں تک کہ ان کی کمر پر نہ صرف جاپانی چہرہ بلکہ غصے سے پھنکارتے ہوئے سمورائی کا چہرہ نمودار ہوگیا۔ اس سب کا تعلق کیکڑے کی خواہش سے نہیں۔ یہ انتخاب اس پر اوپر سے لادا گیا ہے۔ کیکڑا جتنا سمورائی چہرے سے مشابہ ہوگا اس کے زندہ رہنے کے اتنے ہی زیادہ مواقع ہوں گے۔ آہستہ آہستہ بے شمار سمورائی کیکڑے پیدا ہوگئے''۔[1]

لیکن کارل ساگان کی یہ بات غلط ہے کہ یہ انتخاب کیکڑوں کی ذاتی خواہش نہیں تھا بلکہ اوپر سے لادا گیا تھا۔ اس وقت تک ارتقاء کا عمل ممکن ہی نہیں ہوسکتا جب تک کسی نوع کا کوئی فرد کسی مشکل سے نمٹنے کے لیے اپنے اندر ایک نئی توانائی پیدا نہ کرلے۔ کیکڑے شعور تو رکھتے نہ تھے کہ کوئی خواہش کرتے۔ ان کی خواہش تو ان کی جستجو تھی۔ وہ پکڑے جاتے تو مشکل میں آجاتے۔ ان کی پیٹھ پر نشان نہ ہوتا تو مارے جاتے۔ نشان ہوتا تو کچھ وقت، تکلیف میں رہنے کے بعد چھوڑ دیے جاتے۔ انہوں نے اپنی جینز میں یہ معلومات بٹھالیں۔ لیکن اتنی کمزور کہ ایک دو نسلوں میں تو دکھائی دینا ممکن ہی نہ تھیں۔ ہر نسل اپنی اس مختصر تکلیف کا ذکر اپنی اولاد تک پہنچاتی رہی۔ صدیوں تک تو انہیں یہ پتا

۱۔ کائنات، ترجمہ منصور سعید۔ صفحہ نمبر 32

ہی نہ چل سکا کہ انہیں چھوڑ کیوں دیا جاتا ہے۔ لیکن جب وہ سمندر کے نیچے ایک مستقل آبادی بن گئے تو گویا ان کا جین پول الگ ہو گیا۔ اب وہ ہمہ وقت ایک دوسرے کے پاس تھے۔ ان میں کوئی ایسا کیکڑا گھس آتا جس کی پیٹھ پر نشان نہ ہوتا تو وہ اسے اپنی آبادی کے لیے ضرر رساں سمجھتے اور کسی منحوس کی طرح دھتکار دیتے۔ اب وہ وجدانی طور پر پہچاننے لگے تھے کہ ان کو نشانوں کی وجہ سے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ تب انہوں نے اپنی تصویر کو مزید بہتر کیا اور جیسی تصویر ساحل پر موجود انسان چاہتے تھے، ویسی تصویر اپنی پیٹھ پر پیدا کر لی۔

کسی ہستی کا ارتقاء نہیں ہو سکتا۔ جب تک وہ کسی مشکل کا شکار نہ ہو جائے۔ لیکن اس حقیقت سے مغربی مفکرین ناواقف ہیں۔ یہ علامہ اقبالؒ کا کارنامہ ہے کہ انہوں نے ارتقاء کے نظریہ میں .... مشکل سے نکلنے کا تصور دے کر انسان کے فلسفۂ غم اور جدید دنیا کے فلسفۂ ارتقاء کی یوں آپس میں کڑیاں ملائیں کہ سارا مسئلہ ہی حل ہو گیا۔

علامہ اقبالؒ کی تمام شاعری اس فلسفہ کی ترجمان ہے۔ آپ کا کہنا ہے: ع

متاعِ بے بہا ہے سوز و سازِ آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

کبھی کبھی تو آپ اپنے نظریے کے حق میں اسقدر جذباتی ہو جاتے ہیں کہ یوں فرماتے ہیں: ع

مجھے سزا کے لیے بھی نہیں قبول وہ آگ
کہ جس کا شعلہ نہیں تند و سرکش و بیباک

چنانچہ کارل ساگان کا کہنا درست نہیں کہ کیکڑوں مین خود کو بدلنے کی جستجو نہیں تھی۔ یہ جستجو ہی ہے جو ارتقاء کا سبب بنتی ہے۔ ہر وہ نوع مٹا دی گئی جس میں زندہ رہنے

کی جستجو نہ تھی۔ زندگی ایک ہے اور پروٹوزوا خلیے سے لے کر انسان تک فقط ایک۔ جو آگے بڑھنا چاہتی ہے اور آگے بڑھتے ہوئے وہ ہر اس رسی کو کاٹ دیتی ہے جس نے اسے زمین سے باندھ رکھا ہو۔ وہ ہر مشکل سے نمٹ لیتی ہے۔ زندگی نے جب دیکھا کہ ڈائینوسارس اب ایک بھاری سامان کے طور پر اس کے ساتھ اٹک گئے ہیں تو اس نے اس بھاری سامان کو خود پر سے اتار پھینکا۔ وہ دوڑتے ہوئے آگے جانا چاہتی ہے۔ برق رفتاری کے ساتھ۔

اس مقام پر اگر آپ ''عورت، ابلیس اور خدا'' کا پہلا مضمون ''عشق کا ادھورا افسانہ'' پڑھ لیں تو بہت مفید ہوگا۔

تصریحات بالا سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نظریہ ارتقاء کسی ایک فرد کے نظریے کا نام نہیں بلکہ یہ ایک مسلسل عمل کا نام ہے۔ جو وقت کے ساتھ ساتھ رو پذیر ہوتا رہا اور اسی طرح وقت کے ساتھ ساتھ انسانی ذہن پر کھلتا رہا۔ اس میں آسمانی صحائف کا بھی حصہ ہے، یونان کے فلسفیوں کا بھی، ہندوستان کی ویدوں کا بھی حصہ ہے اور قدیم کھنڈرات سے ملنے والے آثار قدیمہ کا بھی۔ اور تو اور، ماہرین زبان دانی یعنی ماہرین لسانیات، جن کا تعلق سراسر الفاظ و معانی کے ساتھ ہوتا ہے نظریہ ارتقاء میں برابر کے حصہ دار ہیں۔ انہوں نے زبانوں کی ساخت الفاظ کی ماہیت سے اندازہ لگایا ہے کہ انسان نے زبان بتدریج سیکھی۔ انسان نے چیزوں کے نام رکھے تو یوں نہ کیا...... کہ ایک ہی دن میں سب چیزوں کے نام رکھ دیے۔ بلکہ یہ ایک مسلسل عمل تھا جو ہزاروں سال میں وقوع پذیر ہوا۔ ماہرین لسانیات بھی سائنسدانوں کی طرح ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ انسان چیزوں کے نام ان کی ہیئت یا صوت کی مناسبت سے رکھتا ہے۔ مثلاً کوے کی کائیں کائیں سن کر کسی نے اسے کوا کہا، کسی نے ''کاگ'' کسی نے ''کاں'' اور کسی نے

''گرو'' (Grow)

مجھے حیرت ہوتی ہے جب میں شعبہ ہائے علم کے روزِ اوّل کے بارے میں سوچتا ہوں۔ ہم علم کے کسی بھی شعبہ میں پیچھے کی طرف چلے جائیں تو سب علوم کی آپس میں کڑیاں ملنے لگتی ہیں اور سب کی کڑیاں ان غاروں میں جا کر ملتی ہیں جن میں ایک مضبوط جسم والا ننگا انسان آباد تھا۔ اگر ہم مصور ہیں تو ہمیں معلوم ہے کہ مصوری کا آغاز انسان نے غاروں میں کیا۔ جب وہ کسی نوکدار پتھر کو اٹھا کر اپنے فارغ وقت میں اپنی غار کی دیوار پر بے تکی شبیہیں کھینچنے لگتا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان میں بہتری آتی گئی جو آج جدید مصوری بن چکی ہے۔ ہم جغرافیہ دیکھتے ہیں تو ہمیں افریقہ کے لوگ کالے دکھائی دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ گرم صحراؤں میں آباد ہیں اور ان کی جلد میں روشنی کی شعاعوں کو جذب کرنے کی صلاحیت ہے۔ اگر کچھ لوگ خط استواء سے دور آباد ہیں تو ان کی چمڑی سفید ہے، جو پہاڑوں میں آباد ہیں وہ پتلے اور دراز قد، کیونکہ وہاں کشش ثقل کم ہے اور جہاں کشش ثقل زیادہ ہے وہاں کے باشندے پست اور موٹے ہوتے ہیں۔

ہم کیمسٹری کو دیکھیں تو ہمیں پانی میں پائے جانے والے یک خلوی، (اولین دور کے) جانداروں میں بھی امائنو ایسڈز، کاربو ہائڈریٹس اور پروٹینز دکھائی دیتے ہیں اور ہمیں خود اپنا وجود بھی انہی مرکبات کا مجموعہ نظر آتا ہے۔ الغرض علم کی ہر قسم ایک ہی نقطے کی طرف اشارہ کرتی ہے اور وہ یہ کہ انسان ایک ارتقائی عمل کے نتیجے میں پیدا ہوا نہ کہ اچانک۔ یہی جدید ترین نظریہ ہے اور یہی درحقیقت ''اسلامی نظریۂ ارتقاء'' ہے۔

گذشتہ صفحات میں ہم نے نظریہ ارتقاء پر سیر حاصل گفتگو کی ہے، لیکن اگر آپ پہلے سے نظریۂ ارتقاء کے بارے میں خاطر خواہ معلومات رکھتے ہیں تو یقیناً آپ کو محسوس

ہو گا کہ یہ گفتگو ابھی تک تشنہ ہے، کیونکہ میوٹیشن (Mutation) کا بیان جسے ہم نے ''جدید نظریۂ ارتقاء'' والے مضمون میں شروع کیا تھا، ڈارون یا لیمارک کے نظریات کے بعد ہی مکمل ہو سکتا تھا، چنانچہ اب ہمیں ایک بار میوٹیشن پر گہری نظر ڈالنا ہوگی۔ لیکن اس سے پہلے چند معروضات ضروری ہیں۔ آپ نے دیکھا! کہ ہم نے لیمارک اور ڈارون کے عضوی تبدیلی کے نظریہ کا مسترد کیا جانا دل سے قبول نہیں کیا۔ بے شک میوٹیشن جدید ترین دریافت ہے اور اب انسان کی پیدائش کا راز، راز نہیں رہا۔ لیکن ڈارون کے عضوی تبدیلی کے نظریہ کو پھر بھی اس سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ بہرحال ہمیں اگر میوٹیشن کے عمل کو اچھی طرح سے سمجھنا ہے تو پہلے ہمارے ذہن میں ڈارون کا نظریہ ہونا چاہیے۔ میوٹیشن اچانک تبدیلی کو کہتے ہیں اور جدید سائنس کا یہ خیال ہے کہ میوٹیشن کے دریافت ہونے کے بعد تبدیلی انواع کا مسئلہ حل ہو چکا ہے۔ وہ میوٹیشن کو...... ایک حادثہ قرار دیتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ خدا کے وجود سے انکار کر چکے ہیں، کیونکہ جب انواع میں تبدیلی واقع ہی...... کسی اتفاقی حادثہ کی وجہ سے ہوئی تو خالق کے تصور کا کیا معنیٰ؟

الغرض میوٹیشن کی دریافت کے بعد دہریت کو بے پناہ فروغ ملا لیکن حقیقت یہ ہے کہ میوٹیشن کوئی اتفاق یا حادثہ نہیں...... یہ ایک منصوبہ بند عمل ہے، جس کی تفصیل ہم ڈارون کے عضوی تبدیلی کے خیال کو پڑھنے کے بعد دیکھ سکتے ہیں۔ میں آپ کی خدمت میں ڈارون کے کام کا اصلی نمونہ پیش کرتا ہوں۔ اس سے آپ بہت اچھی طرح اس بے لوث انسان کی محنت اور طرزِ تحقیق کا اندازہ کرتے ہوئے حقیقی نظریہ تک پہنچیں گے۔ دراصل جان گریگر مینڈل کے قوانین وراثت کے بعد ''عضوی تبدیلی'' کا خیال متروک ہوا اور میوٹیشن کا آغاز' لیکن بہت سے ماہرین اب بھی عضوی تبدیلی کا نظریہ

تسلیم کرتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ میوٹیشن بھی تو بالآخر، ماحول کے اثرات سے محفوظ نہیں یہاں میں ڈارون کی اصل کتاب..........

"The origin of speices"

''انواع کی بنیاد'' کے آغاز میں سے چند پیرے آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ انہیں میں نے آپ کے لیے خود ترجمہ کیا۔ تاکہ ارتقاء پر ہمارا مضمون ہر طرح سے مکمل ہو اور اگلے مضمون میں ''اسلامی نظریۂ ارتقاء'' پر غور کرتے ہوئے آپ کے ذہن میں اب تک کے تمام نظریات ہوں۔ کیونکہ اسلامی نظریۂ ارتقاء ہمارے خیال سے ایک حتمی نظریہ ہے۔ اہم بات جو صرف اسلامی نظریۂ ارتقاء کا خاصہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ اسلامی نظریۂ ارتقاء میں ارتقاء کا سفر بلندی کی جانب ہے۔اور روز اول سے ایسا ہی ہے۔مخلوقات آسمانوں کی طرف اڑ جانا چاہتی ہیں۔ ہر چیز زمین سے دور ہٹنے کی آرزو مند ہے۔لیکن سائنسی نظریۂ ارتقاء میں ہر چیز زمین کے ساتھ پیوستہ ہے اور تو اور انسان جیسا بلند ہمت جاندار بھی ڈارون کا نظریہ سننے کے بعد ''زمینی پیوستگی'' (earth rootedness) کی راہ پر چل پڑا اور بیسویں صدی میں اسی نظریہ کے ثمرات کے طور پر ہمیں دو عظیم جنگیں لڑنا پڑیں۔ جنگ عظیم اول اور جنگ عظیم دوم۔ جبکہ اسلامی نظریۂ ارتقاء ہمیں زمینی جھگڑوں سے بالاتر کر دیتا ہے یہ ہمیں بلندیون کی طرف پرواز کا درس دیتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کا شاہین اس کی خاص علامت ہے۔لیکن یہ اس سے بھی اوپر کی طرف اٹھنے کی تلقین کرتا ہے، حتیٰ کہ خلا کو عبور کرتے ہو سمٰوٰت کو چھونے کا آرزومند ہے.......... ''خودی کو کر بلند اتنا'' .... جیسے اشعار اسی نظریہ کے غماز ہیں۔اب ملاحظہ کیجئے ڈارون کی کتاب کے اولین الفاظ:

''جب ہم انفرادی سطح پر پالتو جانداروں کی کسی ایک قسم یا اس کی

Marfat.com

ذیلی قسم پر غور کرتے ہیں، اسی طرح جب ہم اپنے قدیمی .... پالتو پودوں اور جانوروں کو دیکھتے ہیں تو پہلی بات جو ہمیں متوجہ کرتی ہے یہ ہے کہ وہ عام طور پر ایک دوسرے سے بہت زیادہ مختلف ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس جنگلی جانداروں کو انفرادی سطح پر دیکھا جائے تو ان کی کسی ایک نوع یا قسم میں اس قدر فرق نہیں پائے جاتے۔ جب ہم اپنے ان پالتوں پودوں اور جانوروں میں پائے جانے والے وسیع اختلاف پر نظر کرتے ہیں، جو مختلف ادوار میں بے حد مختلف ماحول اور برتاؤ کے تحت تبدیل ہوتے رہے، تو میرے خیال میں ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ یہ بڑی تبدیلی ہماری گھریلو ضروریات کی وجہ سے وجود میں آئی ہے........ یا یوں کہیے کہ زندگی کے ان حالات کی وجہ سے، جو ہر جگہ ایک جیسے نہیں اور وہ کسی حد تک مختلف ہیں ان حالات سے جو پالتو جانداروں کی آباؤ اجداد انواع کو جنگلی زندگی میں پیش آئے۔ میرا یہ بھی خیال ہے اور یہی خیال غالباً اینڈر یونائیٹ (Andrew Knight) نے بھی پیش کیا ہے کہ .... یہ تبدیلی جزوی طور پر خوراک کی زیادتی کے ساتھ بھی منسلک ہوسکتی ہے یہ صاف دکھائی دیتا ہے کہ اعضاء رکھنے والی مخلوقات یعنی متحرک جاندار اشیاء کو زندگی کے نئے حالات کے لیے کئی نسلوں کے دوران کسی قابل ذکر تبدیلی کا باعث بننا چاہیے اور یہ بھی صاف دکھائی دیتا ہے کہ جب جانداروں کی ساخت ایک بار بدلنا

Marfat.com

شروع ہو جائے تو تبدیلی کا یہ عمل عموماً بہت سی نسلوں تک جاری رہتا ہے۔ ایسی کوئی مثال موجود نہیں کہ کسی تغیر پذیر ذی حیات نے اپنے تبدیل ہونے کا عمل دوران کاشت روک دیا ہو۔ ہمارے قدیم ترین کاشتہ پودے مثلاً گندم وغیرہ، ابھی تک اکثر نئی نئی اقسام کی پیداوار کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ ابھی تک ہمارے قدیم ترین پالتو جانور تیز رفتاری کے ساتھ ترقی پانے یا عضوی طور پر تبدیل ہونے کے قابل ہیں۔

یہ ابھی تک طے نہیں ہو سکا کہ وقت کے کون سے لمحے میں تغیر کا یہ عمل جو...... اِن میں دکھائی دیتا ہے، عملی طور پر وقوع پذیر ہوتا ہے آیا ایمبریو کی نشو ونما کے آغاز میں؟ یا اس کے بعد؟......... یا پھر اس خاص لمحے میں جب حمل شروع ہوتا ہے؟ ''جیفرے سینٹ ہیلیئر'' کے تجربات سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ ایمبریو کا غیر فطری برتاؤ عجیب الخلقت بچوں کو جنم دینے کا باعث بنتا ہے۔ اور ہم اس عجیب الخلقت تغیر کو کسی واضح خط کے ذریعے ان خالص تبدیلیوں سے الگ نہیں دیکھ سکتے جو جانداروں میں واقع ہوتی ہیں۔ لیکن میرا خیال شدت کے ساتھ اس طرف مائل ہے کہ بہت زیادہ وقوع پذیر ہونے والی تبدیلی کی وجہ شاید مذکر و مونث کے وہ تولیدی عناصر ہیں جو عملِ آغاز حمل (جفتی) پر پہلا اثر ڈالنے کا باعث بنتے ہیں۔ بہت سی باتیں ہیں جن کی وجہ سے میرا یہ خیال ہے۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ اہم یہ ہے کہ......... زچگی یا

Marfat.com

کاشت کا عمل پیداوارنی نظام پر بہت گہرا اثر رکھتا ہے۔ قدرت کی نظم کاری کے کسی بھی دوسرے حصے کی نسبت۔ یہ نظام (تولید) اپنی حساسیت کا سب سے زیادہ اظہار کرتا ہے۔ یہ اظہار کس چیز میں ہے؟............ یہ اظہار تبدیلی کے اس عمل میں دکھائی دیتا ہے جو زندگی کے مختلف حالات میں وقوع پذیر ہوتی ہے۔ کسی جانور کو پالنے سے زیادہ آسان کام کوئی نہیں۔ اس کے برعکس بذریعہ عمل زچگی ان کی نسل کشی کر کے انہیں حاصل کرنے کی نسبت چند چیزیں زیادہ مشکل ہیں۔ بعض اوقات اس وقت جب نر اور مادہ ملاپ کرتے ہیں۔ کتنے ہی جانور ہیں جنکی نسل کشی نہیں کی جا سکتی۔ عمل نسل کشی کو ہر جانور پر لاگو نہیں کیا جا سکتا۔ بہت سے (جانور) ایسے ہیں جو عرصہ دراز سے اپنے آبائی وطن میں رہ رہے ہیں ہم ان کی نسل کشی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ان کا ملاپ بہت زیادہ قریبی نہیں۔ عمل نسل کشی عموماً جبلت کے اثر کو ختم کرنے کا وصف رکھتا ہے۔ لیکن کتنے ہی ایسے کاشتہ پودے ہیں جو بے پناہ طاقت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ بعض پودوں کا بیج سرے سے بویا ہی نہیں جاتا اور بعض کا کبھی کبھی بویا جاتا ہے۔ بعض پودوں کا یہ طرز عمل بھی سامنے آیا ہے کہ ان میں بہت ہی معمولی سی تبدیلیاں ان کے بیج پیدا کرنے کی صلاحیتوں پر گہرے اثرات ڈالتی ہیں۔ ان تبدیلیوں کو معمولی اس لیے کہا گیا ہے کیونکہ یہ کسی بہت ہی معمولی سے عمل کا نتیجہ ہوتی ہیں مثلاً پودے کی نشوونما کے دوران

Marfat.com

کسی خاص وقت میں محض پانی دینے کی کمی بیشی بھی ایسی تبدیلیوں کا سبب ہو سکتی ہے۔ میں یہاں ان بے پناہ تفصیلات کو پیش نہیں کر سکتا جو میں نے اس انوکھے موضوع پر اکٹھی کیں۔ لیکن یہ بتانے کے لیے کہ کتنے انوکھے ہیں وہ قوانین جو جانوروں کے عملِ تولید کو بذریعہ حمل متعین کرتے ہیں، میں یہاں صرف ان گوشت خور جانوروں کا ذکر کروں گا جو خط سرطان اور خط جدی کے درمیانی علاقے سے لائے گئے اور یہاں ہمارے ملک میں ان کی نسل کشی بذریعہ حمل بڑی بہترین اور آزادانہ ہوئی۔ ماسوائے چند جانوروں کے، جو تلووں کے بل چلتے ہیں یا ریچھ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی طرح گوشت خور پرندے خال خال استثناء کے ساتھ، مشکل سے ہی کبھی ذرخیز انڈے دیتے ہیں۔ بہت سے اجنبی پودے مکمل طور پر بیکار زردانے (Grains) رکھتے ہیں۔ تقریباً، بالکل اسی طرح جیسا اکثر...... دو نسلے، بانجھ جانداروں میں ہوتا ہے۔ ایک طرف جب ہم اپنے ان گھریلو پودوں اور جانوروں کو دیکھتے ہیں جن کی نسل کشی بڑے آزادانہ طریقے سے عمل زچگی کے ذریعے کی گئی............ تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ اکثر کمزور اور بیمار ہیں۔ خاص طور پر اسی نسل کے ان پودوں اور جانوروں کی نسبت جنہیں بچپن ہی سے جنگل سے لایا گیا اور ان کی پرورش کی گئی۔ وہ مکمل طور پر پالتو بن جاتے ہیں، لمبی زندگی جیتے اور صحت کے ساتھ رہتے ہیں۔ میں اس کی

Marfat.com

بے شمار مثالیں دے سکتا ہوں۔ لیکن ان کا تولیدی نظام بعض نظر نہ آنے والی وجوہات سے اس بری طرح سے متاثر ہو جاتا ہے کہ وہ عمل کے قابل ہی نہیں رہتا۔ ہمیں اس نظام (تولید) پر حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ دراصل جب وہ عمل جفتی کرتے ہیں تو اس میں باقاعدگی نہیں رہتی اور وہ اپنے جنگلی ماں باپ یا دوسرے جنگلی جانوروں کی طرح اچھے بچے پیدا نہیں کر سکتے۔

باغبانی کا بڑا نقصان یہ ہے کہ بانجھ پن پیدا ہوتا ہے۔ لیکن ایک اور وجہ سے یہی باغبانی ہی ہے جس کی بدولت ہمیں تغیر حاصل ہوتا ہے اور باغ سے اپنی پسندیدہ پیداوار حاصل کرنے کا واحد ذریعہ یہی تغیر ہی تو ہے۔ مجھے کہنے دیجیے کہ بعض جاندار تو ایسے ہیں کہ جن کی نسل کشی، جتنے زیادہ غیر فطری حالات ہوں............ اتنی زیادہ بہتر طریقے سے ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر خرگوش، انسانی ہاتھوں سے بنائے گئے ڈربوں یا بلوں میں جنگل کی نسبت زیادہ بچے دیتے ہیں اور ایسے جاندار تو ظاہر کرتے ہیں کہ ان کا تولیدی نظام عمل نسل کشی کے دوران اس طرح متاثر نہیں ہوتا جس طرح بعض کا ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ طے ہوا کہ کچھ جانور اور پودے عمل سدھار یا عمل کاشت کا ڈٹ کر سامنا کرتے ہیں اور بہت حد تک تبدیل ہو جاتے ہیں۔ شاید وہ جنگل میں اس قدر تبدیل مشکل سے ہی ہوتے۔ ''سپورٹنگ پلانٹس (Sporting plants)''

Marfat.com

ایک اصطلاح ہے جو باغبان استعمال کرتے ہیں۔ یہ ان پودوں کے لیے استعمال ہوتی ہے جن کی کونپل یا شگوفہ اپنے سابقہ کردار کی نسبت ایک بالکل نیا، یا کبھی کبھی بہت مختلف کردار کا مظاہرہ کرتا ہے۔ ایسے پودوں کی لمبی فہرست پیش کی جاسکتی ہے۔ ایسی کونپلیں قلم کاشی (قلمیں لگانے کا عمل) کے ذریعے بڑھائی جاسکتی ہیں اور کبھی کبھی بجائی کے ذریعے بھی۔ یہ ''کھیل تماشے'' جنگل میں نہ ہونے کے برابر دستیاب ہوں گے۔ لیکن کاشتکاری کے دوران یہ کہیں زیادہ سامنے آتے ہیں۔

بہت سے ماہرین عضویات کا یہ خیال ہے کہ کونپل (Bud) اور غیر ذرخیز بیج (اویول) اپنی ابتدائی شکل میں آپس میں کوئی فرق نہیں رکھتے۔ اس لیے، درحقیقت یہ کھیل تماشے، میرے نقطہ نظر کو تقویت دیتے ہیں کہ تبدیلی...... غیر ذرخیز بیج یا زردانے یا دونوں میں بہت زیادہ دکھائی دیتی ہے۔ جن پر والدین کے ابتدائی عملِ تولید کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ تاہم یہ وجوہات، جیسا کہ مجھ جیسے لکھاریوں کا خیال ہے.......... ظاہر کرتی ہیں کہ یہ تبدیلی...... ضروری نہیں کہ نسل کے عمل (تولید) کے ساتھ لازمی طور پر واقع ہو اور اس طرح کی صورتحال میں ہم دیکھتے ہیں کہ کونپل یا شگوفہ اپنے والدین کے برتاؤ سے متاثر ہوتا ہے۔ جبکہ اویول یا پولن اپنے والدین کے اثرات کا اظہار نہیں کرتے۔ لیکن بہت سے ماہرین عضویات یہ کہتے ہیں کہ ننھی کونپل اور اویول میں لازمی

Marfat.com

طور پر فرق ہوتا ہے، ٹھیک اس وقت جب وہ اپنی تشکیل کے ابتدائی مراحل میں ہوتے ہیں۔ پس درحقیقت پودوں کے یہ ''کھیل تماشے'' میری رائے کو تقویت دیتے ہیں کہ وقوع پذیر ہونے والی تبدیلی اصل میں اویول یا پولن یا دونوں پر بڑے پیمانے کے اثرات ڈالنے کا باعث بنتی ہے۔ یہ اپنے والدین کے اُس برتاؤ کا اثر قبول کرتے ہیں جس کا انہوں نے عمل ملاپ سے پہلے اظہار کیا۔ تاہم اس طرح کے تجربات سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تنوع کا تعلق نسل کے طرز عمل کے ساتھ ہونا لازمی نہیں ہے۔ جیسا کہ کچھ مصنفوں نے فرض کر لیا تھا۔

ہم کسی ایک ہی پھل کے بیجوں سے تیار کی گئی پنیریاں (ننھے پودے) دیکھیں یا کسی ایک وقت میں جنم لینے والے کسی جانور کے ان نومولودوں پر نظر کریں جو ایک ساتھ پیدا ہوتے ہیں تو ہمیں ان پنیریوں اور نومولودوں کا ایک دوسرے کے ساتھ واضح فرق دکھائی دے گا۔ ملر (Muller) نے اس بات کی نشاندہی کی تھی، قابل غور بات یہ ہے کہ مشاہدہ' حالات کے اثر کو قوانین تولید کے مقابلے میں کتنا غیر اہم بنا دیتا ہے۔ جانداروں پر زندگی کے براہ راست اثر کو اب تک بہت اہم سمجھا جاتا رہا تھا۔''

آپ نے دیکھا؟............ ڈارون نے جانوروں میں تبدیلی کے عمل کو کتنی باریکی سے ملاحظہ کرنے کی کوشش کی۔ یہ چند پیرے تو اس کی کتاب کا بالکل آغاز تھے۔ آپ اگر ڈارون کی کتاب غور سے مطالعہ فرمائیں تو اس کی دقت نظری کو داد دیے بغیر نہ رہ

Marfat.com

سکیں گے۔ مذکورہ بالا سطر میں آپ نے یہ الفاظ ملاحظہ کیجئے:

''لیکن یہ ابھی تک طے نہیں ہو سکا کہ تغیر کا یہ عمل جانوروں کی حیات کے کون سے مرحلے میں وقوع پذیر ہوتا ہے!''

اس کے بعد ڈارون نے پے در پے تغیر کے اس عمل کا سراغ لگانے کے لئے بے شمار مثالیں دیں ڈارون کا طرز استدلال استقرائی ہے۔ وہ زندگی کے ایک ایک جزو کو انتہائی گہری نظر سے دیکھتا ہے اور اسی طرح جزواً جزواً............کل کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔ بے شک استقرائی طرز استدلال میں ''نئے استنتاج'' کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے اور کوئی بھی شخص کسی بھی وقت سابقہ نظریات کے خلاف کوئی نیا نظریہ پیش کر سکتا ہے۔ جیسا کہ ''میوٹیشن'' کا نظریہ متعارف ہوا اور جدید سائنس نے اسے پورے تیقن کے ساتھ قبول کر لیا۔ لیکن یہ کہنا کہ ڈارون، میوٹیشن سے یکسر، ناواقف تھا، جیسا کہ ڈاکٹر عبدالودود نے ''مظاہر فطرت اور قرآن'' میں لکھا............درست نہیں۔ ڈارون میوٹیشن کو پہچان چکا تھا، البتہ وہ DNA کی عمیق تھیوری سے بے شک واقف نہیں تھا۔ ڈارون کے ان الفاظ کو دیکھیے!

''یہ عمل جوان میں دکھائی دیتا ہے۔ عملی طور پر (کب) وقوع پذیر ہوتا ہے؟............آیا ایمبریو کی نشوونما کے آغاز میں؟...... یا اس کے بعد؟............یا پھر اس خاص لمحے میں جب حمل شروع ہوتا ہے؟

جیفرے سینٹ ہیلیر کے تجربات سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ایمبریو کا غیر فطری برتاؤ عجیب الخلقت بچوں کو جنم دینے کا باعث بنتا ہے اور ہم اس عجیب الخلقت تغیر کو کسی واضح خط کے ذریعے ان

Marfat.com

تبدیلیوں سے علیحدہ نہیں کرسکتے جو جانوروں میں واقع ہوتی ہیں۔''

دیکھا آپ نے ڈارون میوٹیشن (Mutation) سے واقف تھا۔ عجیب الخلقت بچے ہمیشہ میوٹیشن یعنی اچانک تبدیلی کے نتیجہ میں ہی پیدا ہوتے ہیں۔ یہ اچانک تبدیلی جنسی خلیے (Cell) کی تقسیم کے دوران واقع ہوتی ہے۔ ڈارون کو عمر بھر اسی سوال کے جواب کی تلاش رہی؟......... اور جب اسے تبدیلی کے اس سوال کا کوئی اچھا جواب نہ مل سکا تو اس نے کسی حد لیمارک کے نظریہ کی تائید کردی......... اور کسی حد تک لیمارک سے اختلاف بھی کیا۔ بہرحال اب ہم میوٹیشن کے ذریعے عضوی تبدیلی کے عمل پر تھوڑا سا غور کرنے کے بعد......... یہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ آیا میوٹیشن پر بھی اسلامی نظریۂ ارتقاء کی تعریف صادق آتی ہے، جو ہمارے خیال میں یہ ہے:

''کوئی جاندار اپنے داخلی یا خارجی ماحول میں موجود (مضمر) خدشات و خطرات اور مشکلات سے نمٹنے کیلئے اپنے اندرون ذات سے ایک نئی توانائی حاصل کرلیتا ہے، جو ارتقاء کہلاتی ہے''۔

مغربی ماہرین ارتقاء کا خیال ہے کہ بعض اوقات تو جانداروں کے راستے میں کوئی مشکل نہیں ہوتی۔ لیکن پھر بھی وہ عضوی تبدیلی اختیار کرلیتے ہیں، جیسا کہ میوٹیشن کا عمل۔ لیکن ہمیں اس سے شدید اختلاف ہے۔

میوٹیشن کا عمل یہ ہے کہ خلیاتی تقسیم کے دوران غلطی سے غلط مقام پر متعین (Adjust) ہوجانے والے جیز، اولاد میں عجیب الخلقت تبدیلیوں کا باعث بنتے ہیں اور اگر عجیب الخلقت تبدیلیوں والے بچے زندہ رہیں اور اپنی نسل بڑھائیں تو کوئی نئی

انواع پیدا ہوتی ہیں۔ دراصل مادہ پرست مغربی مفکرین جس چیز کو قدرت کی غلطی کہہ کر میوٹیشن کا باعث سمجھتے ہیں۔ وہ قدرت کی غلطی یا خطاء یا سہو نہیں۔ قدرت غلطیاں نہیں کرتی۔ وہ سب کچھ کر سکنے پر قادر ہے۔

ان اللہ علی کل شیٔ قدیرٌ

ترجمہ: بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

سمورائی کیکڑوں کی مثال دیتے ہوئے، کارل ساگان نے کہا تھا کہ کیکڑوں کی پشت پر سمورائی لڑاکا کا نشان، انسانی ہاتھوں نے بنایا اور کیکڑے اس سلسلہ میں کسی مشکل کا شکار نہ تھے۔ سوال یہ ہے کہ اگر وہ کسی مشکل کا شکار نہ تھے تو ان میں عضوی تبدیلی کیونکر واقع ہوئی؟ ظاہر ہے وہ میوٹیشن کے عمل سے تو نہ گزرے تھے۔ یا اگر وہ پہلا کیکڑا جس کی پیٹھ پر سب سے پہلے نشان دیکھا گیا ہوگا۔ میوٹیشن کا نتیجہ تھا تو پھر باقی کیکڑوں کی پیٹھ پر........ وہ نشانات کیسے پڑ گئے؟ جواب یہ ہے کہ قدرتی انتخاب کے عمل سے۔

یہ قدرتی انتخاب کا عمل کیا ہے؟ کیا یہ وہی بات نہیں کہ اپنے مشکل ماحول سے نبرد آزما ہو سکنے والے جاندار قدرتی انتخاب کی چھلنی سے ہو کر گزرتے ہیں۔ چھ انگلیوں والے انسانی بچوں کی نسل آگے کیوں نہیں چلتی؟........... دو سروں اور عجیب و غریب شکلوں والے جانوروں کی نسل آگے کیوں نہیں چلتی؟........... آخر سائنس کے بقول یہ بھی تو قدرت کی غلطیاں ہیں؟........... جواب یہ ہے کہ وہ قدرتی انتخاب کی چھلنی سے کامیابی کے ساتھ گزر نہیں پاتے۔ اس کا مطلب ہے کہ بات گھوم پھر کر وہیں آ جاتی ہے۔ یعنی جو حالات کا مقابلہ کر سکے گا وہ زندہ رہے گا۔

حالات کا مقابلہ کرنے کے کئی طریقے ہو سکتے ہیں۔ ہم اس حقیقت کو سمجھنے کیلئے

Marfat.com

ایک مثال کا سہارا لیتے ہیں:

''فرض کریں......... پانی کا ایک ریلہ کسی راستے پر بہتا ہوا آرہا ہے۔ کچھ فاصلہ طے کرکے اس ریلے کے سامنے، ایک چٹان آجاتی ہے اور وہ رک جاتا ہے۔ پانی کا ریلہ ''صاحب شعور'' ہستی نہیں ہے۔ وہ اپنے راستے میں آنے والی مشکل سے نمٹنے کیلئے کسی صاحب شعور ہستی جیسا برتاؤ نہیں کرسکتا۔ لیکن پھر بھی اس کے اندر توانائی ہے۔ وہ چٹان کے ساتھ سر ٹکرانا شروع کردیتا ہے۔ وہ چٹان کو راستے سے ہٹانے کی خاطر اسے مسلسل دھکے اور ٹکریں مارتا رہتا ہے اور جب تک چٹان اس کے راستے سے ہٹ نہیں جاتی یا گھس نہیں جاتی وہ ایسا ہی کرتا رہتا ہے۔ پانی کا ریلہ جاندار نہیں تھا۔ اس لئے اس کی اندرونی توانائی نے ایک کم ماہرانہ طرز عمل کا مظاہرہ کیا۔

اب ہم اس مثال کو ایک اور طرح سے دیکھتے ہیں۔ کیڑے، مکوڑوں کی ایک فوج کسی راستے پر چل رہی ہے۔ ان کے راستے میں چٹان آجاتی ہے۔ تو ان کا طرز عمل پانی سے مختلف ہوگا، کیونکہ وہ حیات کے حوالے سے یک جہتی (One dimentional) جاندار ہیں۔ یہ ساری زمین ان کے لئے ایک سیدھی لکیر کی مانند ہے۔ لیکن وہ پانی کی نسبت کچھ زیادہ کرسکنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ چٹان پر چڑھ جائیں گے اور دوسری طرف اتر جائیں گے، تاکہ اپنا سفر جاری رکھ سکیں۔

اسی مثال کو ہم دو جہتی (Tow dimentional) جانداروں پر منطبق کرتے ہیں۔ بھیڑوں یا بکریوں کا ریوڑ، چٹان کے اطراف کی جانب مڑ جائے گا۔ وہ چٹان کو نظرانداز کردیں گے اور ایک پہلو سے نکلنے کی کوشش کریں گے۔ ہوسکتا ہے وہ بھی چٹان پر چڑھ جائیں بشرطیکہ وہ ان کے چڑھنے کیلئے مناسب ہو۔ لیکن انسان کا رویہ سب سے نرالا ہوگا، وہ چٹان کو راستے سے ہٹانا مناسب سمجھے گا تو اسے ہٹا دے گا۔

Marfat.com

اگر اس میں سرنگ کھودنا بہتر جانے گا تو سرنگ کھود کر پار نکل جائے گا۔ وہ تیسری جہت یعنی زیڈ محور (Z-axis) سے واقف ہے۔ چنانچہ وہ مادے کے ساتھ کچھ بھی کر سکنے کا اہل ہے''

زندگی اپنا راستہ خود ہموار کرتی ہے''السابقون السابقون'' بننے کی آرزوں مند رہتی ہے۔ وہ آگے سے آگے بڑھنا چاہتی ہے اور یہ اسی صورت ممکن ہے جب اس کے راستے میں رکاوٹیں ہوں۔ اگر روکاوٹ نہ ہو تو وہ فنا ہو جاتی ہے۔ اندلس اور دہلی کے مسلمان ہوں یا بغداد کے عیاش باشندے، جب کسی قوم کے اعضاء شل ہو جائیں اور وہ بدلتے ہوئے حالات کو نظر انداز کرنے لگے تو وہ تباہ ہو جاتی ہے۔

قرآن حکیم میں کیا خوب ارشاد ہے:

ان اللہ لایغیّرُ مابقومٍ حتیٰ یغیر ما بانفسھم ؕ o

ترجمہ: اللہ اس وقت تک کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا، جب تک وہ اپنی حالت کو خود نہ بدلے۔

علامہ اقبالؒ نے اس آیۂ جلیلہ کا ترجمہ ایک خوبصورت شعر میں کیا ہے:

؎ خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

زندگی کے راستے میں آنے والی مشکلات کو ماہرین ارتقاء ''قدرتی انتخاب'' کا نام دیتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہم نے کہا .... ان مشکلات سے نمٹنے کے مختلف طریقے ہو سکتے ہیں۔ ہم نے جنگلی گائے کو پالتو بنایا تو بقول ڈارون اس کے نہ صرف ''تھن'' لمبے ہو گئے، بلکہ اس کا رنگ بھی بدل گیا۔ جنگلی کبوتر سارے ایک رنگ کے ہوتے ہیں۔ لیکن شہری کبوتر رنگ برنگے ہوتے ہیں۔ شہری کتا بھی جنگلی کتوں کی نسبت

Marfat.com

ہزار شکلوں اور ہزار رنگوں کا حامل ہوتا ہے۔ ماہرین ارتقاء کہتے ہیں .... ان پالتو جانوروں کے راستے میں کون سی مشکل حائل تھی، جس کی بدولت انہوں نے اپنے رنگ بدلے اور اپنے اعضاء میں تبدیلی کو قبول کیا۔ وہ کہتے ہیں۔ جنگلی جانور جب پالتو بنائے جانے لگے تو ان کے راستے میں مشکلات کی بجائے آسانیاں آ گئی تھیں۔ جنگل میں وہ غیر محفوظ تھے۔ لیکن انسانی معاشرے میں آ کر نہ صرف محفوظ ہو گئے بلکہ ان کا مسئلۂ غذا بھی ہمیشہ ہمیشہ کیلئے حل ہو گیا۔ لیکن پھر بھی انہوں نے ارتقاء کیا، پالتو بننے کے بعد ان میں عضوی تبدیلیاں اور رنگوں کے اختلاف واقع ہوئے .... ایسا کیوں ہے؟ ایسا اس لئے ہے کہ شہروں میں آ کر ان کی مشکلات کی نوعیت بدل گئی تھی۔ اب بے شک وہ شیر اور چیتے کے حملے سے تو محفوظ تھے، لیکن ان کی آزادی سلب ہو چکی تھی۔ وہ فطری آزادی، جس کے ماتحت وہ آزادانہ طور پر اپنی افزائش کا سامان کرتے اور ایک طاقتور بچہ جنم دیتے، جو جنگل کے سنگین حالات کا قدم قدم پر مقابلہ کرنے کا اہل ہوتا۔ لیکن شہر میں آ کر ان کی نسل کشی کی جانے لگی۔ ان کے لئے سب سے بڑی مشکل کھڑی کر دی گئی۔ یعنی ایک غلامانہ ماحول میں نسل کشی۔

میوٹیشن، جس کا ذکر ہم گزشتہ صفحات میں قدرے تفصیل سے کر چکے ہیں، سائنس کے نزدیک ایک حادثہ ہے لیکن درحقیقت یہ حادثہ نہیں۔ حیرت ہے کہ کروڑوں برس کے دوران جس عمل نے لاکھوں مخلوقات کو جنم دیا..... اور بتدریج انسان تک یہ عمل، تاحال متواتر جاری ہے اُسے محض حادثہ کہہ دیا گیا۔ یہ کیسا حادثہ ہے جو بڑے نظم وضبط کے ساتھ گزشتہ کروڑوں سال سے جاری ہے۔

میوٹیشن حادثہ نہیں بلکہ قدرتِ الٰہیہ کا کرشمہ ہے اور یہ صرف اُسی وقت رونما ہوتی ہے، جب بیرونی ماحول میں موجود مشکلات کسی جاندار کے لیے سوہانِ روح بن

Marfat.com

جائیں۔ گھروں میں غلامانہ ماحول کے اندر پرورش پانے والے چوپائے اور بلیاں، کتے اس لیے مختلف رنگ اور جسامتیں اختیار کر گئے کہ نئے، غلامانہ ماحول کی مشکلات نے اُن کے جنسی عمل کے دوران میوٹیشن کو فعال کر دیا۔

قدرت کی ایک ایک چیز اپنی اپنی جگہ پر صحیح صحیح رکھی ہے اور جب وہ اپنی جگہ سے جدا ہوتی ہے تو صحیح وقت اور صحیح انداز میں جدا ہوتی ہے۔ اسی طرح جب وہ کسی اور مقام پر کسی اور شے کے ساتھ جڑتی ہے تو صحیح مقام اور صحیح تناسب سے جڑتی ہے لیکن بعض عجیب الخلقت اشیاء کو دیکھ کر ہم سمجھتے ہیں کہ...... یہ ایک حادثہ تھا۔

اس کے علاوہ، بقول ڈارون، ان کی غذا بدل گئی۔ پہلے وہ اپنے بازوؤں اور رانوں کے مضبوط پٹھے پیدا کرنے کیلئے جو جنگلی غذاء استعمال کرتے تھے اب وہ دستیاب نہ تھی چنانچہ اب ان کے پٹھے پہلے جیسے نہ رہے۔ بھینس، اتنی ست ہوگئی کہ اب اس سے اُٹھا بھی نہیں جاتا۔ لیکن اس نے اپنا دودھ سیروں، بڑھا لیا۔ ایک جنگلی گائے یا بھینس صرف اتنا ہی دودھ پیدا کرتی ہے جتنا اس کا بچہ پی جاتا ہے۔ لیکن ایک پالتو بھینس اپنے بچے کے دودھ کے علاوہ ہمارے بچوں کے لیے بھی دودھ پیدا کرتی ہے۔ ہم نے انہیں ایسا کرنے پر مجبور کیا ہے۔ اول اول جب گائے پالتو بنائی گئی ہوگی تو وہ آرام سے کھڑے ہو کر کسی بھی دوہنے والے کو اپنے تھن پکڑنے کی قطعاً اجازت نہ دیتی ہوگی۔ اس کی ٹانگوں کو باندھا گیا ہوگا۔ اسے چھڑیوں سے پیٹا گیا ہوگا اور اسے اس بات کے لیے مجبور کیا گیا ہوگا کہ وہ اپنے تھن انسانی ہاتھوں میں تھما دے۔ تو پھر..... کیا یہ رکاوٹ نہ تھی؟ پالتو جانور بے شک جنگل سے زیادہ گھروں میں محفوظ ہیں لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کسی مشکل میں نہیں ہیں۔ ''سمورائی کیکڑے'' ہوں یا پالتو جانور اور پودے، مشکلات تو بہرحال ان کے راستے میں آتی ہیں اور ان میں سے جو مشکلات

Marfat.com

سے نمٹنے کے لیے اپنے اندر ایک نئی توانائی پیدا کر لیتے ہیں یعنی اپنا کوئی عضو بدن بڑھا لیتے ہیں یا اپنے طرزِ عمل میں کوئی مستقل تبدیلی پیدا کر لیتے ہیں تو گویا ان کا ارتقاء ہو جاتا ہے۔ جدید نظریۂ ارتقاء کے ماہرین اگر صرف اپنے نظریہ کی تعریف ہی بدل لیں تو یقیناً انہیں آخرت کو ماننا پڑے گا۔

چنانچہ ثابت ہوا کہ اِس کائنات میں کچھ بھی محض حادثاتی طور پر پیدا نہیں ہوا بلکہ یہ سب کچھ جو زمین و آسمان کے درمیان ہے...... اللہ تعالیٰ کی زبردست حکمت اور دانائی کا ثبوت ہے۔ اسی بات کو سمجھنے کے لیے نومسلم محقق...... موریس بوکائے کی تحریر ملاحظہ فرمایئے:

> ''جب جانداروں کی ساخت کی نشوونما اس قدر مربوط انداز میں ہوئی ہے تو لوگ اتفاقات کا ذکر کیوں کرتے ہیں؟ کیا واقعی اتفاقات کو اہمیت دی جانی چاہیے؟ اگر ارتقاء سے متعلق حقائق کو ذہن میں رکھا جائے تو ہرگز نہیں۔ البتہ اس حوالے سے ''اتفاقات کے نظریے'' کا جائزہ ضروری ہو جاتا ہے۔ کیونکہ بہت سے لوگ اس کا پوری کوشش سے دفاع کر رہے ہیں۔ ......اُن لوگوں کے بارے میں کیا کہا جائے جو اپنی ہی تحقیقات کے نتائج کی روشنی میں خوب جانتے ہیں کہ حیاتیاتی مادے کی ساخت کتنی پیچیدہ ہے۔ یہ کہنے کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں کہ اتفاق (Chance) سب سے آخری شے ہوگی جسے اس پیچیدگی کا ذمہ دار قرار دیا جائے گا۔ اگر خلیے کی بجائے اس کے کسی چھوٹے سے جزو پر ہی غور کریں تو بھی ہم دیکھیں گے کہ

Marfat.com

کیمیا دان اور طبیعات دان حضرات اس نظریے سے کیوں رجوع کر چکے ہیں کہ وجود کسی اتفاق کا رہین منت ہے''۔

موریس بوکائے، فی الحقیقت ایک سائنس دان ہیں۔ وہ پہلے ''دہریہ'' (خدا کے وجود کے منکر) تھے لیکن قران کا مطالعہ کرنے کے بعد وہ مسلمان ہو گئے۔ انہوں نے پہلے...... ''قران، بائبل اور سائنس'' لکھی اور پھر قران، بائبل اور انسان لکھ کر عالمگیر شہرت حاصل کی۔ اِسی کتاب میں موریس بوکائے نے ایک روسی ماہر حیاتیات ''اوپیرین (Oparine)'' کے الفاظ نقل کیے، جو نظریہ اتفاق کی شدت کے ساتھ تردید کرتا ہے، حالانکہ روسی مفکر خود منکر خدا ہے، لیکن نظریہ اتفاق کے رد میں کہتا ہے:

''یہ تو کچھ ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی انگریزی کے اٹھائیس حروف تہجی کے بلاک بے ترتیبی سے گرائے اور توقع رکھے کہ اس سے کوئی مشہور نظم بن جائے گی۔ حالانکہ یہ نظم چھاپنے کے لیے ہمیں پوری آگاہی اور احتیاط کے ساتھ ان بلاکوں کو ترتیب دینا پڑے گا''۔

اس کے بعد موریس بوکائے نے ''جے مونوڈ (J.monod) جیسے مشہور سائنسدان کا تصور پیش کیا۔ جے مونوڈ انواع کی تخلیق کو محض اتفاقات کا نتیجہ مانتا ہے۔ موریس بوکائے نے جے مونوڈ کے بیان پر جو تبصرہ کیا وہ بھی پیش خدمت ہے لیکن پہلے جے مونوڈ (J.monod) کا تصور دیکھیے:

''لہٰذا ارتقاء...... یعنی سادہ انواع سے پیچیدہ انواع کی تشکیل، دراصل اُن خامیوں کا ہی نتیجہ ہے جو خلوی نظام میں موجود ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اتفاقی حادثات جو بے جان اشیاء کے

Marfat.com

معاملے میں تمام تر ساختوں کو ختم کر دینے کا باعث ہیں، وہی حادثات جانداروں کے معاملے میں نئی اور پیچیدہ ساختوں کی تشکیل کا باعث ہو سکتے ہیں......

ارتقاء کا واحد ممکن سبب وہ اتفاقی حادثات ہیں جو ''ڈی این اے'' کی ساخت میں رونما ہوئے اور جنہیں میوٹیشن (Mutation) کہتے ہیں''۔

اس بیان پر مورلیس بوکائے نے خود بہت ہی کامل تبصرہ کیا...... انہوں نے کہا:

''سمجھ میں نہیں آتا کہ J.monod محض اتفاقات ہی کو اس معاملے میں واحد سبب قرار دینے پر کیوں تلے ہوئے ہیں۔ آخر انہیں اپنی لاعلمی کا خود بھی اعتراف ہے اور جہاں تک جینیات کی ابتداء کا تعلق ہے یہ لاعلمی ہم سب میں مشترک ہے۔ خود J.monod آگے چل کر کہتے ہیں کہ...... اسے مسئلے کی بجائے معمہ کہنا زیادہ بہتر ہے......

اتفاقات کو انتہائی منظم ترتیب سے سامنے آنے والی ساختوں کی تخلیق کا سبب قرار دینا حقائق کے منافی ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ارتقاء اپنی تمام صورتوں میں ایک مرتب عمل ہے۔ جس میں ایک مکمل سلسلہ نسب واضح طور پر موجود ہوتا ہے۔ لہٰذا منطقی طور پر یہ کہنا ممکن نہیں رہتا کہ جے مونوڈ کے اتفاقی حادثات، سوائے بے ترتیبی کے کسی شے کی تشکیل کا سبب بن سکتے ہیں''۔

اتفاقات کا نظریہ باطل ہے...... اسے صرف مذہبی علماء نے ہی رد نہیں کیا بلکہ جدید دنیا کے بڑے بڑے سائنسدانوں نے بھی اتفاقات کے ذریعے پیدا ہونے والی

Marfat.com

مخلوقات کے نظریہ کو مسترد کر دیا ہے۔ جدید دور کے ایک بہت بڑے ماہر ارتقاء...... ''پی پی گراس (PP.grasse)'' کے الفاظ دیکھیے:

''ممالیا کے تمام جنسی اعضاء تقریباً بیک وقت ہی نمودار ہوئے تھے، اگر ہم تصور کریں کہ ان اعضاء کے صحیح وقت پر اور صحیح صورت میں، اچانک وجود میں آ جانے کے لیے، کیا کچھ درکار ہے تو ہم حیران رہ جاتے ہیں۔ اس قدر حسن ترتیب، اس قدر نظم وضبط کا سبب کیا محض اتفاق ہے؟'' (بحوالہ قران، بائبل اور انسان)

اب اس مضمون کے آخر میں میں یکے بعد دیگرے دونوں تعریفیں پیش کرتا ہوں۔ ایک جدید نظریہ ارتقاء کی اور دوسری اسلامی نظریہ ارتقاء کی۔ پہلی تعریف کی رو سے خدا اور آخرت کا انکار ثابت ہوتا ہے، جس کی وجہ سے مغرب نے مادہ پرستی کا راستہ اپنایا۔ جبکہ دوسری تعریف کی رو سے خدا اور آخرت کا یقین حاصل ہو گا جس سے عالمی امن اور محبت کی راہ ہموار ہو گی۔ جدید نظریہ ارتقاء کی رو سے ارتقاء یہ ہے:

''میوٹیشن (Mutation) اور قدرتی انتخاب (Natural selection) کے نتیجے میں جانداروں میں عضوی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ اسے ارتقاء کہتے ہیں۔''

دیکھا آپ نے نظریہ ارتقاء کی یہ تعریف سراسر خدا کے وجود سے انکار کرتی ہے۔ میوٹیشن کا عمل جو کروموسومز میں حادثاتی طور پر تبدیلیاں کرتا رہتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کروموسومز میں غلطیاں رونما ہوتی رہتی ہیں جس کی وجہ سے یہ دنیا مختلف النوع جانداروں سے بھر گئی ہے۔ نظریہ ارتقاء کے اس خیال سے خدا اور آخرت دونوں کا انکار لازم آتا ہے۔ کیونکہ اس نظریہ کی رو سے جو کچھ بنا............ خود بخود بن گیا۔ اب اس کے مقابل اسلامی نظریہ ارتقاء کی تعریف دیکھیے!

Marfat.com

''کسی جاندار کے داخلی یا خارجی ماحول میں موجود (مضمر) خدشات وخطرات اور مشکلات ہوتی ہیں۔ جن سے نمٹنے کیلئے وہ جاندار اپنے اندرون ذات سے ایک نئی قسم کی توانائی حاصل کرلیتا ہے اور اس توانائی کے ذریعے وہ ان مشکلات سے نکل آتا ہے.......... یہ ارتقاء ہے۔''

اس نظریہ کی رو سے ''ہمیں'' منزلیں طے کرنا ہوتی ہیں۔ لَتَرۡ کَبُنَّ طبقاً عن طبق .... آج ہمارے لئے جسمانی مشکلات تو رہی نہیں۔ گرمی سے بچنے کے لئے انسان نے ایئر کنڈیشنر اور پنکھے بنا لئے ہیں اور سردی سے بچنے کیلئے ہیٹر اور رضائیاں..........لیکن آج کا انسان ذہنی دباؤ (Tension) اور ذہنی مشکلات سے دو چار ہے.......... چنانچہ قانون کی رو سے اب وہ ان ذہنی مشکلات سے نمٹنے کیلئے اپنے اندرون ذات (قلب) سے ایک نئی قسم کی توانائی حاصل کرے گا اور اس طرح وہ ایک اور منزل طے کر جائے گا۔ بعض متشدد مذہبی پیشواؤں نے یہی اعتراض کیا ہے کہ انسان، جسمانی طور پر اب کیوں ارتقاء نہیں کر رہا ہے؟ لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ارتقاء صرف مشکلات سے نکلنے کیلئے ہوتا ہے۔ آج انسان، ذہنی مشکلات کا شکار ہے۔ چنانچہ وہ ارتقاء بھی ذہنی ہی کرے گا۔ وہ اپنے قلب سے ایک نئی توانائی حاصل کرے گا۔ جو اسے امر بنا دے گی اور ایک وقت وہ آئے گا، جب زمین پر بسنے والے تمام انسان اپنے ذہنی مسائل سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے باہر نکل آئیں گے، زمین پر نہ کوئی تھانہ رہے گا اور نہ کوئی عدالت، نہ کوئی جرم اور نہ کوئی سزا، نہ کوئی ہسپتال اور نہ کوئی کاروبار یا بازار.......... زمین پر ذاتی ملکیت کا مسئلہ ہی نہیں رہے گا بالفاظ دیگر زمین پر جنت قائم ہو جائے گی.......... جسے ہم جنت ارضی یا قرآن کی زبان میں ''جَنّٰتِ نعیم'' کہہ سکتے ہیں۔ بہر حال ارتقاء انسانیت کیلئے ناگزیر ہے۔

Marfat.com

اسلامی نظریۂ ارتقاء

سب سے پہلے یہ آیۂ جلیلہ دیکھیے:

"خلقکم من نفس واحدة." ○

ترجمہ: تم سب کو واحد نفس سے پیدا کیا گیا۔

اس کے بعد علی الترتیب مندرجہ ذیل آیات قرآنی کو ملاحظہ فرمایئے:

"هو الذی خلقکم من تراب.......... (۶۷:۴۰)

ترجمہ: اس نے تمہیں مٹی سے تخلیق کیا۔

وهو الذی خلق من الماء بشراً.......... (۵۴:۲۵)

ترجمہ: اور وہی تو ہے جس نے بشر کو پانی سے تخلیق کیا۔

هو الذی خلقکم من طین.......... (۲:۶)

ترجمہ: وہی تو ہے جس نے تمہیں گارے سے تخلیق کیا ہے۔

انا خلقنهم من طین لازب○ (۱۱:۳۷)

ترجمہ: انہیں ہم نے چپ چپ کرتے گارے سے تخلیق کیا۔

ولقد خلقنا الانسان من سُلٰلَةٍ من طین○ (۱۲:۲۳)

ترجمہ: اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصے سے تخلیق کیا۔

"خلق الانسان من صلصال کالفخّار○" (۱۴:۵۵)

ترجمہ: اس نے انسان کو ٹھیکرے کی طرح کھنکھاتی مٹی سے تخلیق کیا۔

ولقد خلقنا الانسان من صلصال من حما مسنون○ (۲۶:۱۵)

Marfat.com

ترجمہ: اور ہم نے انسان کو کھنکھناتے، سڑے ہوئے گارے سے تخلیق کیا۔"

اور اب ان سب کے بعد اس آیۂ جلیلہ پر نظر ڈالیے جسے علامہ اقبالؒ نے ارتقاء کا ایک قطعی اور واضح ثبوت قرار دیا:

"ولقد خلقنکم ثم صورنکم ثم قلنا للملائکة اسجدوا لادم ق فسجدوا الا ابلیس o (۷:۱۱)

ترجمہ: اور تحقیق ہم نے تخلیق کیا تم سب کو، پھر صورت دی تم سب کو، پھر ہم نے کہا ملائکہ سے کہا کہ سجدہ کرو آدمؑ کے لیے۔ پس انہوں نے سجدہ کیا ماسوائے ابلیس کے۔"

اس آیت میں آپ نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے ہم سب کو تخلیق کرنے کے بعد اور پھر ہم سب کو صورت عطا کرنے کے بعد ملائکہ سے کہا کہ وہ آدم (جمع آدمی) کے سامنے سجدہ کرے۔

عجیب بات ہے اتنی واضح اور قطعی آیت کے باوجود ہم سمجھتے ہیں کہ وہ صرف ایک فرد تھا جسے ملائکہ نے سجدہ کیا۔ حتیٰ کہ سجدے کے وقت تو اس کے ساتھ اس کی بیوی بھی نہ تھی۔ گویا ملائکہ نے عورت کے حضور سجدہ نہ کیا، صرف مرد کے سامنے کیا۔ حالانکہ سجدہ سے مراد ہے اطاعت کا اظہار۔ دراصل اللہ نے ہمیں پیدا کیا اور پھر ہمارے سامنے یہ ساری کائنات یوں مسخر کر دی گویا اس کائنات کی ہر چھوٹی بڑی اور چھپی ہوئی یا ظاہر قوت نے ہمارے سامنے سجدہ کر دیا۔ آج ہم دریاؤں کا رخ موڑ دیتے ہیں تو یہ اسی سجدے کا اثر ہے جو میکائیلؑ کی فوج ظفر موج نے ہمارے سامنے کیا تھا۔ کیونکہ میکائیل ہی بارشوں، ذرخیزیوں اور دریاؤں وغیرہ کا فرشتہ ہے۔ بت پرست قوموں کے نزدیک بارشوں اور ذرخیزیوں کا فرشتہ نہیں ہوتا بلکہ دیوتا ہوتا ہے۔ قرآن نے اس

خیال کو مسترد کر دیا۔

اس سے پہلے کہ ہم مضمون کے شروع میں دی گئی آیات پر تفصیل سے روشنی ڈالیں ہمیں قرآن کریم کے دو اہم لیکن عام استعمال ہونے والے الفاظ پر ایک دانشمندانہ نظر ڈالنی ہوگی۔ قرآن کریم میں ''خلق'' .... اور ''جعل'' .... کے دو الفاظ بار بار استعمال ہوئے۔ انہی کے مادے سے سینکڑوں دیگر الفاظ بھی استعمال ہوئے۔ لگتا ہے آج تک کسی نے غور نہیں کیا کہ ان دو الفاظ میں فرق کیا ہے۔ حالانکہ یہ فرق اتنا واضح ہے کہ ایک چھوٹے سے بچے کی سمجھ میں بھی آ سکتا ہے۔ لیکن حیرت ہے کہ مفسرین نے انہیں زیادہ تر ہم معنی ہی شمار کیا ہے۔ مثلاً ایک لمحے کے لیے مندرجہ ذیل آیت دیکھیے:

''انی جاعلٌ فی الارض خلیفة''۔

ترجمہ: ''میں بنانے لگا ہوں زمین میں خلیفہ۔''

''انی خالق بشرا من صلصال من حمامسنون''O

ترجمہ: میں تخلیق کرنے لگا ہوں کھنکھناتے سڑے ہوئے گارے سے، بشر۔''

اب ہم ان دونوں آیات کا روایتی ترجمہ ملاحظہ کرتے ہیں۔ آیت نمبر ۱ کا روایتی ترجمہ:

''میں زمین میں (اپنا) نائب بنانے والا ہوں۔'' (ترجمہ مولانا فتح محمد جالندھری) ....

آیت نمبر ۲ کا روایتی ترجمہ:

''میں کھنکھناتے، سڑے ہوئے گارے سے ایک بشر بنانے والا ہوں۔

Marfat.com

(ترجمہ: مولانا فتح محمد جالندھری)

آپ نے دیکھا کہ مولانا فتح محمد جالندھری نے ''جاعل'' اور ''خالق'' کو ہم معنی شمار کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ سب نے یہی کیا ہے اور سب نے .... ''بنانے والا ہوں'' .... کو اس طرح کی آیات میں مشترک لیا ہے۔ حالانکہ خلق اور جعل کے معانی میں ڈکشنری، زمین اور آسمان کا فرق بتاتی ہے۔ صرف ڈکشنری ہی نہیں قرآنی آیات بھی ان کے الگ الگ معانی پر پورا زور دیتی ہیں۔ مثلاً ''جعل'' کا معنی سمجھنے کے لیے ہم مندرجہ ذیل آیات دیکھتے ہیں۔

(۱) وجعلنکم شعوباً وقبائل لتعارفو. (۱۳:۴۹)

ترجمہ: اور ہم نے تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ ایک دوسرے سے تعارف حاصل کرو۔

(۲) واللہ خلقکم من تراب ثم من نطفة ثم جعلکم ازواجا. (۱۱:۳۵)

ترجمہ: اور اللہ نے تم کہ تخلیق کیا مٹی سے، پھر نطفے سے اور پھر تم کو جوڑا جوڑا بنایا۔

(۳) هو الذی جعلکم خلائف فی الارض (۳۹:۳۵)

ترجمہ: وہی تو ہے جس نے تم سب کو زمین کے خلیفے بنایا۔''

اسی طرح ہم نماز میں دعا مانگتے ہوئے یہ آیت پڑھتے ہیں۔

"رب جعلنی مقیم الصلوة"۔

ترجمہ: اے اللہ! مجھے بنادے صلوۃ کا قائم کرنے والا۔''

مذکورہ بالا آیات دیکھیے! اور بتایئے کہ ان میں سے کسی بھی آیت میں جعل سے

Marfat.com

مراد از سرِنو تخلیق کرنا ہے؟ یہاں تو جعل سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ پہلے سے تخلیق شدہ کسی چیز کو ایک نیا روپ (ارتقاء) دینے کے لیے اللہ تعالیٰ ''جعل'' یا جعل کے مادے سے بنا کوئی لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اس بات کی مزید وضاحت یوں ہو سکتی ہے کہ جعل کسی چیز کو نئے سرے سے تخلیق کرنا نہیں بلکہ بنی بنائی چیز میں کسی نئی فطرت کا اضافہ کرنا ہے۔ میں نے ''فواد عبدالباقی'' کی ''معجم'' میں چار سو سے زیادہ آیات شمار کی ہیں جو جعل یا جعل کے مادے سے بنے کسی لفظ کو استعمال کرتی ہیں۔ ان تمام آیات میں جعل سے مراد ایک اگلا قدم، ایک نئی توانائی، ایک نیا روپ، ایک نئی فطرت یا ایک نئی عادت ہے۔ بعض لوگ کہہ سکتے ہیں کہ نور یا آسمان و زمین کے لیے بھی جعل کا لفظ استعمال ہوا ہے تو انہیں یہ دیکھنا چاہیے کہ ان آیات میں بھی نور یا آسمان و زمین کے از سرِنو بنانے کی بات نہیں۔ ہو سکتا ہے از سرِنو کا لفظ درست نہ ہو لیکن میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کسی چیز کو شروع سے بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ جعل کا لفظ استعمال نہیں کرتے۔ بلکہ کسی بنی بنائی چیز کی ایک نئی فطرت بنانے کے لیے جعل کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ قرآن کریم کی چار سو سے زیادہ آیات میں بلکہ ایسی تمام آیات میں، جن میں جعل یا جعل کا مادہ ہے اللہ تعالیٰ کی یہی مراد ہے۔ مثلاً یہ آیت دیکھیے:

''الذی احسن کل شئی خلقه وبدا خلق الانسان من طین ○ ثم جعل نسله من سلة من مآء مهین ○ ثم سوّله و نفخ فیه من روحه و جعل لکم السمع و الابصار و الافدة؛ قلیلاً ما تشکرون○
(۳۲: ۷تا۹)

ترجمہ: جس نے ہر چیز کو بہت اچھی طرح بنایا (یعنی) اس کو پیدا کیا اور انسان کی پیدائش کو مٹی سے شروع کیا۔ پھر اس کی نسل خلاصے سے (یعنی) حقیر پانی سے پیدا کی۔ پھر اس کو درست کیا۔

پھر اس میں اپنی روح پھونکی اور تمہارے کان اور آنکھیں اور دل بنائے (مگر) بہت کم شکر کرتے ہیں۔''

(ترجمہ: فتح محمد جالندھری)

دیکھا آپ نے؟ خلق پہلا مرحلہ ہے اور جعل اگلا قدم۔ جعل میں کسی چیز کو شروع سے نہیں بنایا جاتا خلق میں شروع سے بنایا جاتا ہے۔ مثلاً

(۱) ھو الذی خلق لکم مافی الارض جمیعا۔ (۲۹:۲)

ترجمہ: وہی تو ہے جس نے سب چیزیں جو زمین میں ہیں تمہارے لیے پیدا کیں۔

(۲) اقراء باسم ربک الذی خلق o خلق الانسان من علق o

(۹۶ تا ۲۹)

ترجمہ: اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھو جس نے پیدا کیا۔ جس نے انسان کو خون کی پھٹکی سے بنایا۔

(۳) ھو الذی خلقکم من نفس واحدۃ وجعل منھا زوجھا............ (۱۸۹:۷)

ترجمہ: وہ خدا ہی تو ہے جس نے تم کو ایک نفس سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا بنایا۔

(۴) اللہ الذی خلقکم من ضعف ثم جعل من بعد ضعف قوۃ............ (۵۴:۳۰)

ترجمہ: اللہ ہی تو ہے جس نے تم کو ضعف میں پیدا کیا پھر بنائی ضعف کے بعد قوت''

خلق اور اس کے مادے والی آیات میں صاف ظاہر ہے کہ کسی چیز کو شروع سے

Marfat.com

بنانے کی بات کی جا رہی ہے اور جعل کا لفظ پکار پکار کر کہتا ہے کہ --- میں بعد میں پیدا ہونے والی فطرت کے لیے استعمال ہوا ہوں .... جعل من بعد .... یہ خود قرآن کریم کے الفاظ ہیں۔ تو پھر ہم .... انی جاعل فی الارض خلیفہ .... والی آیت میں یہ مراد کیوں لیتے ہیں کہ یہ آیت اللہ تعالیٰ نے انسان کو شروع سے پیدا کرنے کے بارے میں اتاری ہے حالانکہ قرآن کی سینکڑوں آیات اس بات پر شاھد ہیں کہ جعل سے مراد شروع سے بنانا نہیں ہے۔

انسان تو زمین پر تھے، تعداد میں کثیر تھے کیونکہ اس وقت تک وہ تخلیق کیے جا چکے تھے۔ ہزاروں لاکھوں سال گزرتے چلے گئے اور سرسبز و شاداب وادیوں میں تیزی کے ساتھ نسل بڑھاتے ہوئے وہ دو پائے، فطری مہارتوں میں باقی جانداروں سے ترقی کر گئے۔ تب اللہ نے ان کے اندر کائنات کا بوجھ اٹھا لینے کی قابلیت دیکھی تو یہ فیصلہ کیا کہ میں انہیں اپنا نائب بناتا ہوں۔ تاکہ یہ وہ کام سرانجام دیں جو میں دیتا ہوں۔

فطرت نہیں اگرچہ بے ذوق
جو اس سے نہ ہو سکا وہ تو کر

(اقبالؒ)

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی روح اور ارادے کو بذریعہ جبرئیلؑ انسانوں میں داخل کر دیا وہ جو پہلے پہل صرف کسی پیڑ کی شاخیں توڑ کر اپنے لڑنے کے لیے چھڑیاں بنا سکتا تھا اب چیزوں کے نام رکھنے لگا۔ قرآن کے الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے کائنات کو سنبھالنے کی ذمہ داری انسان کو سونپ دی۔ اللہ نے اس ذمہ داری کو امانت کہا۔

"انا عرضنا الامانة علی السموٰت والارض والجبال فابین ان

یحملنها و اشفقن منها و حملها الانسان انه' کان ظلوماً
جهولاo (۳۳:۷۲)

ترجمہ: ہم نے امانت کو آسمانوں اور زمین پر پیش کیا تو انہوں
نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان
نے اس کو اٹھالیا، بے شک وہ ظالم اور جاہل تھا۔''

انسان اس ذمہ داری کا اہل تھا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اسے کائنات میں تصرف کرنے کی ذمہ داری سونپ دی۔

لہٰذا انسان اچانک پیدا نہیں ہوا۔ بالفاظ دیگر یہ کوئی حادثہ یا اتفاق نہیں تھا۔ ہمارے مذہبی پیشوا اب بھی نظریۂ مخصوص تخلیق کو مانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عیسائیوں اور یہودیوں کے عقیدے کے مطابق آدم اور حوا کو اللہ تعالیٰ کا ایک ناکام منصوبہ سمجھتے ہیں جس نے انسان کو تو بنایا لیکن انسان بھٹک گیا۔ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مٹی کا ایک بت بنایا اس میں پھونک ماری تو بابا آدم بن گیا۔ پھر اس کی پسلی چیر کر اللہ نے اماں حوا کو نکالا اور ان دونوں سے نسل انسانی چلی۔

قرآن کریم نظریۂ ارتقاء کی کہانی ساتویں صدی عیسویں میں پیش کر چکا ہے۔ حالانکہ مغربیوں کا نظریۂ ارتقاء انیسویں صدی میں سامنے آیا۔ قرآن حکیم ہر قدم پر ہمیں یہ یاد دلاتا ہے کہ......... یہ کائنات کوئی جامد شے نہیں۔ بلکہ ہمہ وقت پھلتی پھولتی اور دم بدم منزلیں طے کرتی کائنات ہے۔ تخلیق، ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ یہ ارتقاء کا عمل ہمارے حساب سے بہت طویل لیکن اللہ کے حساب سے پلک جھپکنے سے بھی کم وقت میں مکمل ہوتا ہے۔ کیونکہ اللہ کا کوئی وقت نہیں گزرتا۔ ارشاد ہے:

Marfat.com

''یدبر الامر من السمآء الی الارض ثم یعرج الیه فی یوم کان مقداره' الف سنة مما تعدون.......... (۵:۳۲)

ترجمہ: ''وہی آسمان سے زمین تک ہر کام کا تدبیر کرتا ہے پھر وہ ایک روز جس کی مقدار تمہارے شمار کے مطابق ہزار برس ہوتی ہے اس کی طرف بلند کرتا ہے۔''

اب ضروری ہے کہ ہم اسلامی نظریۂ ارتقاء کو ایک خوبصورت ترتیب کے ساتھ دیکھ لیں۔ قرآن کریم سے لیکر علامہ اقبالؒ تک ڈیڑھ ہزار سال کے عرصہ میں بے شمار مسلم مفکرین نے اسلامی نظریۂ ارتقاء کو کسی نہ کسی طرح پیش کیا۔ خصوصاً ''ابن مسکویہ'' کو تو ہم با قاعدہ پہلا ماہر ارتقاء مان سکتے ہیں۔ ابن مسکویہ نے سب سے پہلے پودوں پر غور وفکر کیا اور یہ بتایا کہ کھجور کا درخت واحداً ایسا پودا ہے جس میں جانوروں کی طرح دماغ ہوتا ہے۔ کھجور نے اپنے آپ کو دشمن سے محفوظ کرنے کے لیے یوں ارتقاء کیا کہ خود کو زمین سے بہت بلند کر لیا اور اپنے تنے کو اتنا بیکار کر دیا کہ اب وہ کسی دشمن کے کام نہیں آ سکتا۔ مسلمان مفکرین نے مغربی مفکرین سے پہلے کام کیا اور نظریۂ ارتقاء پیش کرتے ہوئے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ لیکن مغربی مفکرین نے مسلمانوں کے تمام تر کام کا سہرا اپنے سر باندھ لیا۔ حالانکہ سب مغربی مفکرین یہ جانتے تھے کہ نظریۂ ارتقاء مسلمانوں کا پیش کردہ ہے۔ ''امام ابن خلدون'' نے اپنی مشہور کتاب ''مقدمہ'' میں کئی مقامات پر بہت ہی واضح انداز میں نظریہ ارتقاء کی تائید کی ہے۔ چنانچہ یہ کہنا درست نہیں کہ نظریۂ ارتقاء مغرب کے مادہ پرست مفکرین کا پیش کردہ ہے۔ اب ہم مختصر الفاظ میں ارتقاء کی اس کہانی کا جائزہ لیتے ہیں۔ جو سائنس، بائبل، مشرق و مغرب کے مفکرین اور قرآن کریم سے بجا طور پر اخذ ہوتی ہے۔

Marfat.com

''یہ کائنات ہائیڈروجن کے ایک ایٹم سے پیدا ہوئی ہے۔ ایک ایسا ایٹم جس کا ایک الیکٹران، ایک پروٹان اور نیوٹران بھی ایک تھا۔ ہائیڈروجن کا وہ ایک ایٹم اللہ کی الوہیاتی توانائی کے حکم سے ایک سے دو، دو سے چار اور یہاں تک کہ اربوں کھربوں کی تعداد میں تبدیل ہوا۔ یہ کائنات ایک دھواں تھی.......... وھی دخان .... وہ دھواں گردش کرتے کرتے ایک بگولہ بن گیا۔ بگولہ ایک دھماکے سے پھٹا جسے سائنس ''بگ بینگ'' کہتی ہے اور ٹکڑے ہر طرف بکھر گئے جو ستارے ہوئے۔ سورج ایک ستارا تھا جو ہماری کہکشاں کے ایک دور دراز کونے میں پڑا ہے۔ اس ستارے کی گردش بہت تیز تھی۔ چنانچہ اس سے کئی سیارے پیدا ہوئے۔ جو اس گھومتے ہوئے گولے سے نکل کر الگ جا گرے اور پھر اس گولے کے گرد گردش کرنے لگے۔ زمین ان میں سے ایک تھی.......... والارض بعد ذلک دحھا .... لیکن زمین سورج کی گرمی سے مناسب فاصلے پر پہنچی اور سورج کے گرد گردش کرنے لگی۔ یہ درجہ حرارت زندگی کے لیے سازگار ہو سکتا تھا، چنانچہ سیارۂ زمین قدم بقدم زندگی کی طرف بڑھنے لگا۔ زمین کے چہار اطراف بادل ہی بادل تھے (وھی دخان) جو لاکھوں سال برستے رہے اور زمین کی گہری کھائیاں پانی سے بھر گئیں۔ لیکن ابھی کرۂ زمین پر آکسیجن نہیں تھی۔ زمین کے گرداگرد موجود بادلوں میں زندگی کے نامیاتی مادے تھے جو سلالۃ من

Marfat.com

طین.........کا باعث بنے۔ سلالة من طین......... کے اہم ترین اجزاء.........شوگرز، گلیسریز، کاربوہائیڈریٹس اور امائینو ایسڈ کے علاوہ نائٹروجنی مرکبات تھے۔ ان حیات سے لبریز مادوں کو پروردگار نے بادلوں میں ہی کہیں پیدا کر دیا تھا۔ جہاں زندگی کا پہلا جرثومہ ''پرٹوزوا'' پیدا ہوا۔ یا پھر آسمانوں سے ایک مکمل تیار شدہ زندہ جرثومہ زمین کے بادلوں میں آن اٹکا ....خلقکم من نفس واحدہ.........یہ جرثومہ خود کو تقسیم کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس کی تعداد بڑھنے لگی اور اتنی بڑھی کہ تمام ماحول پروٹوزوا سے بھر گیا۔ لاکھوں سال بارش ہوئی تو زندگی کے جرثومے سمندر میں چلے آئے یا یہ نظریہ بھی ہے کہ یہ سارا عمل سمندروں میں مکمل ہوا.....یعنی پروٹوزوا کی پیدائش کا عمل۔ یہاں لاکھوں کروڑوں سال نہ صرف ان کی تعداد بدلتی رہی بلکہ ان میں اچانک تبدیلی کا عمل بھی واقع ہوتا رہا۔ کروڑوں سال بعد وہ صرف پرٹوزوا ہی نہ رہے بلکہ لاکھوں قسم کے جرثوموں میں بدل گئے۔ سمندر میں بعض جگہوں پر کئی جرثومے جھنڈ کے جھنڈ.........یکجا ہو کر رہنے لگے۔ ان کے اس اتصال سے بغیر ہڈی کے جونک نما مچھلی پیدا ہوئی اور ایسے جرثومے جو ساحلوں سے ٹکرانے والی موجوں کے ذریعے ساحلوں پر چپکے رہ گئے انہوں نے بھی پھلنا پھولنا شروع کر دیا۔ ساحلوں پر جھنڈ کے جھنڈ یعنی یکجا ہو کر رہنے والے بہت سے جرثومے کالی کالی

Marfat.com

شاخوں کی صورت زمین سے بالشت دو بالشت اوپر کو اٹھ کر ابتدائی پودے بن گئے۔ زندگی اپنی مخصوص رفتار کے ساتھ آگے بڑھتی گئی.......... و خلق کل دابة من ماء..........سمندر میں مچھلیاں پیدا ہونے لگیں اور زمین پر پودے، سمندری مچھلیوں کے ساتھ ساحلوں پر کیڑے مکوڑوں مثلاً بچھو وغیرہ کی پیدائش ہوتے ہوتے مزید کروڑوں سال بیت گئے۔ کروڑوں سال زمین پر انڈے دینے والے کیڑے مکوڑے لاتعداد مقدار میں موجود رہے۔ پروں والے کیڑے، اڑنے لگے اور اپنی پرواز کو بہتر سے بہتر بنانے لگے۔ پھر وہ پیدا ہوئے جو پیٹ کے بل زمین پر رینگتے تھے.......... من یمشی علی بطنہ (قرآن) ....اچانک تبدیلی یعنی میوٹیشن کا عمل جاری تھا اور یہ کام سر انجام دینے کے لیے عمل ارتقاء کے پاس لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں سال کا وقت تھا۔ پرندے فضاؤں میں پرواز کرنے لگے.......... طائر یطیر بجناحیہ..........اور پھر میملز کا دور شروع ہوا۔ لیکن یہ خزندوں جیسے میمل تھے۔ انہی سے انڈے دینے والے الگ ہو گئے اور ابتدائی کرم خور حیوانات مثلاً ''شجری شریو'' وغیرہ الگ ہوئے۔ علی الترتیب تھیلی دار جانور کینگرو، اڑنے والے میملز، چمگادڑ، دانتوں سے کاٹنے والے جانور خرگوش، چوہا اور گلہری اور کھروں والے جانور پیدا ہونا شروع ہوئے.......... من یمشی علی اربع.......... گویا زندگی چار

Marfat.com

پاؤں پر چلنے لگی۔ جن سے جگالی کرنے والے جانور الگ ہوئے اور ''بھیمة الانعام'' کہلائے۔ جن میں اونٹ گائے بھینس وغیرہ پیدا ہوئے........ اللہ نے مخلوقات کو کسی درخت کی طرح شاخ در شاخ پھیلاتے ہوئے پیدا کیا.......... واللہ انبتکم من الارض نباتا .... شجری شریو سے حیوانات رئیسہ کا آغاز ہوا۔ آئی آئی، لیمر، ٹارسیر، پرانی دنیا کے بندر، نئی دنیا کے بندر، ہومینائیڈس وغیرہ کروڑوں سال میں پیدا ہوئے۔ حیوانات رئیسہ سے بندروں کی نسلیں الگ ہوئیں جن میں گبن، چنپانزی، گوریلا اور .... اورنگوٹان شامل تھے........ لیکن حیوانات رئیسہ میں بندروں سے بہت پہلے، کروڑوں سال پہلے، ایک خوبصورت نسل جسے سائنس ہومینائیڈس کہتی ہے، الگ ہوئی۔ اس کی ایک خاصیت زمین کی ساری مخلوقات سے مختلف تھی۔ یہ خاصیت اس میں آج سے کروڑوں سال پہلے پیدا ہو چکی تھی اور یہ خاصیت تھی اِس کا دو پاؤں پر چلنا.......... من یمشی علی رجلین .... ہومینائیڈس نے اپنی اندرونی توانائی بڑھانے کی کوشش جاری رکھی۔ چنانچہ اول اول وہ ہومی نڈس بنے اور بعد ازاں ''بشر''۔ یہ عمل لاکھوں کروڑوں سال پر محیط تھا۔ میوٹیشن کے ذریعے پیدا ہونے والی کوئی ایک تبدیلی لاکھوں سال میں کسی ایک عضو کو بدلنے کا باعث بنتی۔ آج سے پچیس ہزار سال پہلے ایسے دوپائے زمین کے ہر براعظم پر

Marfat.com

ہزاروں کی تعداد میں تھے جن کی جلد سے بال جھڑ چکے تھے۔ یہ دو پائے غاروں میں رہتے اور فقط درختوں کے پھلوں پر گزارا کرتے۔ اول اول ان کی کوئی نسل بھی گوشت خور نہ تھی۔ لاکھوں سال زمین کی بہاروں، پھلوں، چشموں، شیشے کی طرح چمکتی جھیلوں، دودھ کی طرح بہتے پہاڑی جھرنوں اور ندیوں اور رنگا رنگ کی مخلوقات میں گھومتے پھرتے رہے۔ وہ بے فکرے تھے اور بے ضرر بھی۔ پھر ایک وقت آیا کہ انہوں نے کہیں دھوپ میں پکا خوشبودار گوشت کھالیا۔ وہ گوشت خور نہ تھے چنانچہ کچا گوشت کھانے کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ کسی درخت کی شاخ پر لٹکی ہوئی کوئی لاش جب دھوپ میں پک کر لذیذ ہو جاتی تو درختوں سے پھل اتارنے والے ہومی نڈس اسے بھی کھا جاتے۔ لاکھوں سال میں گوشت خوری کا عمل مستقل نوعیت اختیار کر گیا اور ان کے بدن یکسر مختلف طرز عمل کا مظاہرہ کرنے لگے۔ کیونکہ اب ان میں حرارت غریزی کی مقدار بہت بڑھ گئی تھی۔ اس حرارت نے ان کے جنسی اشتعال کو بڑھایا اور وہ دھیرے دھیرے افزائش نسل کی طلب کے بغیر ہی ایک دوسرے سے جنسی ملاپ کرنے لگے۔ یہ عمل بھی ہزاروں سال جاری رہا۔ ساتھ کے ساتھ ان کی دماغی صلاحیتیں بھی تیزی سے بڑھ رہی تھیں۔ وہ اب کوے کی کائیں کائیں سن کر اسی جیسی آواز نکالنے کے قابل ہو گئے تھے۔ وہ اپنے حلق سے پرندے اور جانوروں کی آوازوں

Marfat.com

جیسی آوازیں نکالنے لگے۔ وہ بہت اچھے نقال تھے۔ چنانچہ دھیرے دھیرے ان کے حلق سے نکلتی ہوئی آوازیں مناسب ترتیب پانے لگیں۔

اور پھر آج سے دس ہزار سال پہلے شاید ایک انوکھا واقعہ پیش آیا۔ ایک ایسا واقعہ جسے زمین کے کروڑوں سال پر محیط ارتقاء میں پہلے جزوی واقع کے طور پر یاد رکھا جا سکتا ہے۔

وہ دونوں میاں بیوی تھے......... ہاں وہ دونوں میاں بیوی تھے۔ کیونکہ اپنی پہاڑی غار میں وہ ایک جوڑا بن کر رہتے تھے۔ واقعہ یہ پیش آیا کہ ان کے دل میں اللہ تعالیٰ نے اپنی سب سے مکرم توانائی یعنی وحی......... ڈال دی۔ مرد کو اچانک ایک دن احساس ہوا کہ وہ اپنی ذات سے بیگانہ نہیں۔ گویا اربوں سال کے بعد زندگی کی اچانک آنکھ کھل گئی۔ وہ ایک لمبے خواب سے بیدار ہو گئی۔ اس پہلے انسان کو یہ خیال آیا کہ وہ سب سے مختلف ہے۔ ہاں وہ پہلا انسان تھا۔ اسے اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے بے فکری کے باغات سے نکل جانے کا حکم دیا۔ کیونکہ اب اس کی آنکھ کھل گئی تھی اور وہ بیگانے، دو پایوں کے ہمراہ مزید نہ رہ سکتا تھا۔ چنانچہ وہ اپنی بیوی کو لے کر وہاں سے نکل آیا اور ایک مختلف زندگی گزارنے لگا۔

اس جوڑے کی نسل بڑھی تو ماں باپ نے انہیں بھی شعوری باتیں سکھائیں۔ یہ لوگ باقی دو پایوں سے مختلف تھے۔ باقی دو پائے

Marfat.com

ابھی تک ان کے گرد اگرد پہاڑیوں اور جنگلات میں موجود تھے۔ لیکن ان جوڑے کی اولاد نے اپنے لیے گھر بنائے، اور مویشی پالنا شروع کر دیے۔ اب ان کی نسل بڑھنے لگی تھی۔ یہاں تک کہ وہ تعداد میں اچھے خاصے ہو گئے۔ یہ اولین متمدن انسان تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی باقی دو پائے بھی ان کے نزدیک آ کر رہنے لگے اور ان کی نقالی کرنے لگے۔

لاکھوں سال پہلے جب ہومی نائیڈس نے گوشت کھانا شروع کیا تھا تو ان میں گوشت خور، درندوں کی طرح لڑائی بھڑائی کی صفات پیدا ہو گئی تھیں وہ جب ایک دوسرے کو مارتے تو ایک دوسرے کو بھی کھا جاتے۔ کیونکہ ان میں ابھی شعور نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے جب پہلا انسان بنانا چاہا تو ارض و سموات کی تمام پوشیدہ اور ظاہر قوتیں بزبان حال پکار اٹھیں کہ اے پروردگار! تو انسان کو اتنی بڑی ذمہ داری کیوں سونپنا چاہتا ہے۔ یہ تو زمین میں دنگا فساد کرتا ہے اور خون بہاتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ سچائی جانتا تھا۔ چنانچہ انسان کو وحی کی ذمہ داری سونپ دی گئی.......... لو انزلنا ھذا القرآن علی جبل لرایتہ' خاشعاً متصدعاً من خشیة اللّٰہ ....''اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ کے ڈر سے ریزہ ریزہ ہو جاتا'' ....اور یہ پہاڑ جیسی امانت انسان نے اٹھالی۔ کیونکہ اسے اٹھانے کی ہمت صرف اُسی میں تھی۔

Marfat.com

پہلے جوڑے کی اولاد میں انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلے جوڑے کو آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام کہا جاتا ہے۔ یہ جنت سے آتے ہوئے ایک پتھر بھی اٹھا لائے تھے، شاید اپنے آبائی وطن کی یادگار کے طور پر۔ ان کی اولاد نے اپنی، اسی آبائی یادگار کو محفوظ رکھا۔ یہاں تک فردوس بریں کا وہ پتھر بالآخر حجر اسود کی صورت خانہ کعبہ میں نصب ہوا۔ ان کی زیادہ تر اولاد بنی اسرائیل کہلائی۔ لیکن ان کے آس پاس بسنے والے دو پائے .... یمشی علی رجلین .... بدستور موجود رہے۔ نوح علیہ السلام کے بیڑے میں گندگی پھینکنے والے اور نوحؑ کا مذاق اڑانے والے وہی لوگ تھے۔ زندگی کی گاڑی چلتی رہی اور حیات کا قافلہ طبق پر طبق مارتا ہوا مادی سے روحانی زندگی کی طرف سفر کرنے لگا۔ انسان نے حیوانی خصلتیں ترک کرنا شروع کر دیں اور ایک کے بعد ایک خصلت کو ترک کرتے ہوئے بتدریج مقام محمود کی طرف بڑھنے لگا۔''

یہاں تک تو سائنس ہمارے ساتھ چلتی ہے لیکن یہاں سے آگے جہاں ایک ماوراء الحواس دنیا کو تصور میں لانا پڑتا ہے، سائنس ہمارا ساتھ نہیں دیتی۔ کیونکہ سائنس مجبور ہے، وہ صرف مادے کی تحقیقات تک محدود ہے۔ البتہ نفسیات یا جدید نظریۂ اضافیت..... مادی ماحول سے ماوراء اشیاء کے تصور کو گرفت میں لینے کی کوشش کر رہا ہے اور یقیناً وہ ایک دن اس روحانی مقام کو بھی پہچان لے گا جو ہمارے ارتقاء کا اگلا درجہ ہے۔

Marfat.com

انسان کامل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس پر انسان کا ذہنی اور جسمانی ارتقاء ممکنہ عروج تک پہنچ گیا۔ اس سے زیادہ عروج ایک مادی پیکر کے لیے ممکن نہ تھا۔ چنانچہ انسان کے جسمانی ارتقاء کا کوئی نظارہ ہم اپنے عہد میں نہ دیکھ سکیں گے۔ کیونکہ کسی ایک عضو بدن کے ارتقاء کے لیے لاکھوں سال درکار ہیں اور حالات سے ایسا نہیں لگتا کہ انسان لاکھوں سال تک زمین پر رہ پائے گا۔ البتہ ارتقاء کا عمل نہیں رک سکتا۔ وہ جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا اور اب انسان احساس کی دنیا میں ارتقاء کرے گا۔ ابھی یہ درد کے احساس میں مبتلا ہے، غم واندوہ، آلام، مصائب، نفسیاتی الجھنیں، دکھ درد اور جدائی کا احساس۔ جب تکلیف ہی احساس میں ہے تو قانون کی رو سے ارتقاء بھی احساس کا ہی ہونا چاہیے۔ احساس قلب میں پیدا ہوتا ہے اور قلب کا نظریہ صرف اسلام نے پیش کیا ہے۔ انسان کا قلب اب ارتقاء کر جائے گا۔ نسلیں آتی رہیں گی، نسلیں جاتی رہیں گی۔ لوگ بیگانگیِ ذات سے نکلتے رہیں گے اور منزل شعور میں داخل ہوتے رہیں گے۔ یہاں تک ایک دن اجتماعی خودی بیدار ہوگی اور یہ زمین جنت بن جائے گی۔ یہ تو ہوا...... زمین کا انجام۔ لیکن آگہی کی دولت ملنے کے بعد اب ہمارا کیا انجام ہوگا؟ کیونکہ اب تو ہمارے پاس اللہ کی آخری وحی بھی آ پہنچی ہے۔ جو قرآن کریم اور سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے گی۔

ہمارا انجام کیا ہوگا؟

یہ بات سمجھنے کے لیے ہم ارتقاء کی تناسبی حرکت پر غور کرتے ہیں۔ جوں جوں ہم ارتقاء کے سفر کو پیچھے کی طرف ناپتے چلے جاتے ہیں، ہر پرانا عہد نئے عہد سے زیادہ طویل ہے۔ جمادات یعنی پہاڑوں اور دریاؤں نے اربوں سال میں ارتقاء کیا۔ جرثوموں نے کروڑوں سال، اسی طرح ہومی نائیڈس نے لاکھوں سال میں ارتقاء کیا

Marfat.com

لیکن باشعور انسانوں نے محض چند ہزار سال میں- بعینہٖ اسی طرح ہمارا انفرادی ارتقاء ہماری طبعی عمر کے سالوں میں ہی ممکن ہے۔ اگر ہم اپنی ٹینشنز (Tensions) اور ذہنی مشکلات پر قابو پانے کے اہل ہوسکیں تو ہم اس مختصر زندگی میں انفرادی طور پر بھی ارتقاء کرسکتے ہیں۔ اس کے لیے ہمیں دنیا کی تمام آلائشوں سے ذہنی طور پر الگ ہونا ہوگا نہ کہ جسمانی طور پر۔ اگر ہم دنیاوی آلائشوں سے جسمانی طور پر الگ ہونے کی کوشش کریں گے تو بھی ارتقاء نہیں کر پائیں گے اور اگر ہم ان آلائشوں سے ذہنی طور پر دور نہ ہٹیں گے تو بھی ارتقاء نہ کر پائیں گے۔ جس طرح ماضی میں ہم دیکھتے ہیں کہ زندگی نے ارتقاء کے سفر میں لاکھوں منزلوں پر پڑاؤ اختیار کیا۔ اسی طرح ہمارے مستقبل میں بھی ہمارے لیے لاکھوں منزلیں منتظر ہیں۔ لیکن ماضی میں ہم بہت زیادہ کثیف تھے۔ زمین کی اتھاہ گہرائیوں میں کثیف مادوں کی صورت پڑے تھے۔ لیکن پھر بتدریج ہم نے کثافت سے لطافت کی طرف سفر شروع کیا۔ یا دوسرے الفاظ میں مادے سے روح کی طرف۔ یہی سفر آگے بھی جاری رہے گا۔ ہم اپنے قلب میں روح مطلق کو دیکھ سکتے ہیں۔ ہم اپنے احساس میں حقیقت سرمدیہ کو چھو سکتے ہیں۔ جوں جوں ہم کثافتیں ترک کرتے جائیں گے قرآن کی زبان میں متقی، لیکن سائنس کی زبان میں ارتقاء........ کرتے چلے جائیں گے۔ سائنس کو چاہیے کہ وہ اپنے ہی قوانین کی روشنی میں اب انسانی ارتقاء پر غور کرے جو کہ بالآخر آخرت کے تصور پر ہی جا کر ختم ہوگا۔

اب ہم مندرجہ ذیل آیات کی روشنی میں قرآن کریم کا موقف دیکھتے ہیں، ارشاد ہے:۔

"ذلک علم الغیب و الشھادۃ العزیز الرحیم o الذی احسن کل شیئ خلقہ' و بدا خلق الانسان من طین o ثم جعل نسلہ' من

Marfat.com

سُلٰلَةٍ من مآء مهين ٥ ثم سوّٰهُ و نفخ فيه من روحه وجعل لكم السَّمْعَ و الابصار والافئدة قليلاً ما تشكرون٥ (۳۲:۶ تا۹)

ترجمہ: وہی تو پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا ہے غالب رحم والا ہے۔ جس نے ہر چیز کو بہت اچھی طرح بنایا اس کو پیدا کیا اور انسان کی پیدائش کو مٹی سے شروع کیا۔ پھر اس کی نسل خلاصے سے، حقیر پانی سے پیدا کی۔ پھر اس کو درست کیا۔ پھر اس میں اپنی روح پھونکی اور تمہارے کان، آنکھیں اور دل بنائے۔ تم بہت کم شکر کرتے ہو۔'' (ترجمہ: فتح محمد جالندھری)

''ڈاکٹر عبدالودود'' نے مذکورہ بالا آیت کا بہت خوب مفہوم بیان کیا ہے۔ جسے میں یہاں درج کرتا ہوں:۔

''یہ سلسلۂ تخلیق و ارتقاء اس خدا کی طرف سے کارفرما ہے جو ہر شخص کی مضمر ممکنات سے واقف ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ ان میں کیا مشہود ہو چکا ہے اور کتنا ابھی باقی ہے (غیب)۔ یہ سب کچھ اس قانون خداوندی کی رو سے ہوتا ہے جو تمام کو مناسب نشو ونما دے کر انہیں تکمیل تک پہنچانے کی قدرت رکھتا ہے۔ اس مقصد کے لیے اس نے ہر شے کی تخلیق میں بہترین حسن و توازن رکھا ہے۔ اس کی انہی سکیموں میں سے ایک سکیم انسان کی تخلیق ہے۔ خدا کے عالم امر میں اس سکیم کے طے پا جانے کے بعد اس کا آغاز بے جان مادے سے ہوا۔ اس کے بعد یہ کاروان حیات مختلف مراحل طے کرتا ہوا اس وادی میں آ پہنچا۔ جہاں افزائش

Marfat.com

نسل، نر و مادہ کے اختلاط سے ہوتی ہے۔ پھر خدا کا قانون اس پیدا ہونے والے بچے میں صحیح توازن وتناسب قائم کرتا ہے۔ اس مرحلہ تک یہ طریق تخلیق حیوانات اور انسانوں میں مشترکہ چلا آتا ہے۔ اس کے بعد انسان کی صورت میں ایک انقلابی تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ جس سے اس کا تخلیقی سلسلہ حیوانات سے یکسر مختلف ہو جاتا ہے۔ یعنی خدا انسان کو اپنی الوہیاتی توانائی کا ایک (نیا) شمہ عطا کر دیتا ہے۔ اسے انسانی ذات کہا جاتا ہے۔ جو صاحب اختیار و ارادہ ہوتی ہے .... اور دیکھو! اس طرح وہ تمہیں بصارت وسماعت یعنی علم بالحواس کے ذرائع عطا کر دیتا ہے اور اس کے ساتھ دل (Mind) بھی۔ لیکن بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو ان قوتوں کا صحیح استعمال کرتے ہیں۔''

اس کے بعد ڈاکٹر عبدالودود تشریح میں مزید لکھتے ہیں:

''ان آیات میں ایک چیز قابل ذکر ہے۔ یہاں انسان کے خلقاً اخر کے درجہ تک پہنچنے سے پیشتر دو مراحل کا ذکر ہے۔ ایک بے جان مادہ میں زندگی کی نمود اور دوسرے صنفی تولید۔ ان مراحل کے لیے جو ضمیر استعمال کی گئی ہے وہ غائب کی ضمیر ہے۔ تھرڈ پرسن (Third Person) نسلہ، سوّٰہُ فیہ .... لیکن جب سماعت، بصارت اور نفس مل گئے تو انسان کو ضمیر حاضر یعنی سیکنڈ پرسن (Second Person) کے طور پر مخاطب کیا جاتا ہے۔ چنانچہ پھر ''لکم'' کہا گیا ہے۔ اس سے پہلے وہ .... ''وہ'' تھا

Marfat.com

اور اب ''تم'' ہوگیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ انسان اپنی موجودہ شکل تک آہستہ آہستہ قدم بقدم پہنچا اور ہر قدم اوپر کی طرف اٹھتا گیا۔''

ڈاکٹر عبدالودود نے تشریح میں ایک بات غلط کہی ہے۔ جب انہوں نے کہا......

''لیکن جب سماعت، بصارت اور نفس مل گئے تو انسان کو ضمیر حاضر یعنی سیکنڈ پرسن کے طور پر مخاطب کیا جاتا ہے۔ چنانچہ پھر ''لکم'' کہا گیا۔''

ڈاکٹر عبدالودود کا رجحان پرویزیت کی طرف ہونے کی وجہ سے انہیں ایسا کرنا پڑا۔ حالانکہ سماعت اور بصارت بعد میں ملی اور لکم کا صیغہ پہلے استعمال کیا گیا۔ آیت کا یہ حصہ دیکھیے!

"ونفخ فيه من روحه و جعل لكم السمع والابصار و الافئدة۔"

دراصل مادہ پرست مفکرین، یہ نہیں پسند کرتے کہ اللہ تعالیٰ روح کو لکم کہہ کر پکارے۔ کیونکہ روح کو حواس خمسہ سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب نے اپنی طرف سے یہ لکھ دیا کہ سماعت اور بصارت کے بعد لکم (تم) کہا گیا۔ بہرحال یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ مجموعی طور پر ڈاکٹر عبدالودود کی تشریح بہت اچھی تھی۔

ان طویل ارتقائی مراحل میں، جن میں کہ پہلے کیمیائی ارتقاء ہوا، پھر بے جان مادہ میں اللہ کی الوہیاتی توانائی داخل ہوئی اور زندگی کی نمود ہوئی پھر عمل تولید شروع ہونے کے بعد کاروان زندگی بتدریج اس مقام پر پہنچا جہاں انسان کی تخلیق شروع ہوئی پھر نوع انسانی کو باقی انواع سے الگ ہونے میں اٹھائیس ملین سال خرچ ہوئے۔ اس طویل عرصہ میں انسان نام کی کوئی قابل ذکر شے موجود نہیں تھی۔ چنانچہ کہا گیا:

Marfat.com

''ھل اتی علی الانسان حین من الدھر لم یکن شیئاً مذکوراً ○
(۱:۷۶)

ترجمہ: بے شک انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی آ چکا ہے کہ وہ کوئی قابل ذکر شے نہ تھا۔''

اب قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیت پر غور فرمایئے:

''انہ' ھو یبدئُ ویعید۔ (۱۲:۸۵)

ترجمہ: ''وہی پہلی دفعہ پیدا کرتا ہے اور وہی دوبارہ کرے گا۔''

گویا وہ ہر شے کو اس کے نقطۂ آغاز سے پیدا کرتا ہے اور اسے گردشیں دیتا ہوا ارتقائی مراحل میں سے گزار کر نقطۂ تکمیل تک پہنچا دیتا ہے۔ ارشاد ہے:

''لترکبن طبقاً عن طبق............''(۱۹:۸۴)

ترجمہ: ''تم درجہ بدرجہ رتبہ اعلیٰ پر چڑھو گے۔''

زندگی کی ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے یوں بلندیوں کی طرف اٹھتے چلے جاؤ گے کہ جب اس کی ایک منزل کے ساتھ مطابقت حاصل کر لو گے تو اس سے اگلی منزل میں پہنچنے کے قابل ہو جاؤ گے۔ یوں تم منزل بمنزل اوپر اٹھتے چلے جاؤ گے اور یہ سلسلہ مرنے کے بعد بھی جاری رہے گا۔

قرآن کریم کا اعجاز دیکھیے! کہ پورے ارتقائی عمل کو ایک لفظ میں بیان کر کے دریا وکوزے میں بند کر دیا جب کہا:

''وقد خلقکم اطوار''(۱۴:۷۱)

ترجمہ: ''حالانکہ اس نے تم کو طرح طرح (کی حالتوں کا) پیدا کیا ہے۔''

خدا نے تمہیں مختلف ارتقائی منازل سے گزار کر انسانی منزل تک پہنچایا۔ لفظ

Marfat.com

''اطوارا'' میں مختلف حدود، مختلف اقسام، مختلف مدارج واحوال اور مختلف ماحول سبھی کچھ آجاتا ہے۔ قرآن کریم مظاہر فطرت پر غور کرنے کے لیے بار بار زور دیتا ہے اور کہتا ہے:

''ان فی السموات والارض لایت للمومنین ○ وفی خلقکم و مایبث من دآبة ایت لقوم یوقنون ○'' (۴۵: ۲ تا ۴)

ترجمہ: ''بے شک آسمانوں اور زمین میں ایمان والوں کے لیے نشانیاں ہیں اور تمہاری پیدائش میں بھی اور جانوروں میں بھی جن کو پھیلاتا ہے۔ یقین کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔''

اس کے غلبہ وحکمت کی نشانیاں صحن کائنات میں بکھری پڑی ہیں۔ لیکن یہ انہیں کو نظر آسکتی ہیں جو اس کے قوانین کی صداقت پر ایمان رکھیں۔ صرف خارجی کائنات میں ہی نہیں خود تمہاری پیدائش میں اور دیگر ذی حیات میں جو چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں اس کی نشانیاں ہیں۔ لیکن صرف ان کے لیے جو اس کے قوانین پر یقین رکھتے ہوں۔ اس کے بعد قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ ارتقاء کا سلسلہ ختم نہیں ہوگیا۔ تم روئے زمین پر چل پھر کر دیکھو! کہ ارتقائی مراحل کس طرح طے ہوتے ہیں۔ اس سے تمہیں سبق ملے گا کہ کس طرح ارتقاء کا سلسلہ آگے چلے گا۔ چنانچہ فرمایا:۔

''اولم یرواکیف یبدی اللہ الخلق ثم یعیدہ' ان ذلک علی اللہ یسیرٌ ○ قل سیروا فی الارض فانظروا کیف بدا الخق ثم اللہ ینشیُ النَّشْاَةَ الاخرة ط ان اللہ علی کل شیئٍ قدیر ○

(۲۹: ۱۹ تا ۲۰)

ترجمہ: کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ خدا کس طرح خلقت کو پہلی بار

پیدا کرتا پھر اس کو بار بار پیدا کرتا رہتا ہے۔ یہ خدا کو آسان ہے۔ کہہ دو کہ زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ اس نے کس طرح خلقت کو پہلی دفعہ پیدا کیا ہے۔ پھر خدا ہی پچھلی پیدائش پیدا کرے گا۔ بے شک خدا ہر چیز پر قادر ہے۔''

ارشاد یوں ہے کہ کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ اللہ کس طرح ایک چیز کی تخلیق کی ابتداء کرتا ہے۔ پھر کس طرح اسے مختلف گردشیں دے کر ارتقائی مراحل طے کراتا اور آگے لے جاتا ہے اور یہ سب کچھ قوانین خداوندی کی رو سے نہایت آسانی سے ہوتا چلا جا رہا ہے۔ کہہ دو کہ ذرا دنیا میں چل پھر کر دیکھو کہ خلق کی ابتداء کیسے ہوئی اور پھر کس طرح نئی نئی زندگیاں ابھرتی چلی گئیں۔ اسی طرح اللہ بار دگر بھی زندگی بخشے گا۔ یہ سب کچھ اللہ کے مقرر کردہ پیمانوں کے مطابق ہوتا ہے۔

تصریحات بالا سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نظریۂ ارتقاء ایک اسلامی نظریہ ہے جو قرآن کریم سے ثابت ہے اور آخرت کا ضامن۔

میں پورے دعوے سے یہ عرض کرتا ہوں کہ ایک سائنسی، نقطہ بین ذہن کو اگر آخرت کی سمجھ آ سکتی ہے تو صرف نظریۂ ارتقاء کے ذریعے۔ کیونکہ نظریۂ ارتقاء میں قانون ہی یہی ہے اور روز ازل سے یہی قانون ثابت ہوتا چلا آ رہا ہے کہ جب تم ایک مشکل میں ہوا اور اس سے نکلنے کی کوشش کرتے ہو تو تم ایک نہ ایک دن ضرور نکل جاؤ گے۔ اس لیے کہ تمہارے اندرون ذات سے ایک نئی توانائی جنم لے گی اور تمہاری نوع ہی بدل کر رہ جائے گی۔ تم پہلے کیا تھے؟......... لیکن اب کیا بنا دیے گئے ہو؟ انہی سوالات پر غور کرو گے تو تمہیں آخرت کا جواب مل جائے گا۔ تم اپنی پریشانیوں سے نکلو۔ ان کو ترک نہ کرو۔ ان کے بیچوں وبیچ رہتے ہوئے ان سے نکلو! گویا انہیں اپنے

Marfat.com

دل میں جگہ نہ دو۔ انہیں اپنے ذہن پر حاوی نہ ہونے دو۔ جب تمہارے دل میں دنیا کی کسی چیز کی پریشانی نہ رہے گی تو گویا تمہارے دل میں خدا ہوگا۔ وہ...... اندرونی اور زوردار توانائی جو تمہاری نوع کو بدل کر اگلی زندگی میں یعنی اگلے جہان میں ایک زیادہ طاقتور زیادہ لطیف اور زیادہ پائیدار نوع بنا دے گی۔ بالکل اسی طرح جس طرح ماضی میں محض ایک عضو بدن بڑھ جانے یا کم ہو جانے سے تمہاری نوع بدل جاتی تھی۔ اللہ نے تمہیں مختلف ارتقائی منازل سے گزار کر انسانی منزل تک پہنچایا.......... وقد خلقکم اطوار ....

اسی طرح آخرت قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے لیکن اس کے لیے شرط یہی ٹھہرے گی کہ:

> ''ہمیں اپنے اندرون ذات (قلب) سے ایک نئی قسم کی توانائی حاصل کرنی ہوگی۔'' اب ذرا اس مشہور حدیث کو دیکھیے جس میں فرمایا.......... من عرف نفسہ' فقد عرف ربہ۔

گزشتہ مضمون میں ہم نے کلوننگ پر بحث کرتے ہوئے کہا تھا کہ یوم یبعثون کو برپا کرنا تو انسان کے بھی بس میں ہے۔ کلوننگ کیا ہے:

> ''کسی جاندار کے زندہ یا مردہ خلیے (Cells) کو مصنوعی طریقے سے ایسا ماحول فراہم کرنا جس میں اس خلیے کے DNA میں موجود معلومات کو کسی طرح متحرک کر دیا جائے۔ ایک بار جب خلیہ جاگ اٹھا تو اس کی تقسیم کا عمل خود بخود شروع ہو جائے گا۔''

دراصل DNA ٹارچ کے اس بیٹری سیل کی طرح ہوتے ہیں جسے ہم چاہیں تو صدیوں تک بیکار اور بے جان مادے کی طرح رکھے رہیں اور چاہیں تو متحرک کر

Marfat.com

دیں۔ مغربی سائنسدان زمانہ قدیم میں ہلاک ہو جانے والی مخلوقات کو دوبارہ اٹھانے کے چکر میں ہیں اور یقیناً وہ کسی روز ایسا کرلیں گے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے قلب میں ہی نہیں ہمارے جسم کے ایک ایک خلیے میں بھی دوبارہ جی اٹھنے کی صلاحیت ہے۔ قلب کے لیے دوبارہ جی اٹھنے کا لفظ بھی غلط ہے۔ ایک ایسے انسان کا قلب جو متقی ہو.......... قلب منور یا دل زندہ ہوتا ہے۔ جسے موت آ ہی نہیں سکتی۔

زندگانی ہے صدف قطرۂ نیساں ہے خودی
وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

اس کتاب کے گزشتہ تمام صفحات پر نظر ڈالی جائے تو کافی ثبوتوں اور شہادتوں کے ذریعے انسان کی کہانی پستیوں سے عروج کی طرف سفر کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ارتقاء یہ کہ انسان ارضی پیوستگی کو چھوڑ کر بلند مقامات کی طرف پرواز کرے۔ جیسا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بلند ترین مقام پر پہنچ کر اس بات کا ثبوت دیا۔ پیر نصیر الدین سیالوی نے خوب کہا ہے:

تیری عظمت کی جھلک دیکھ کے معراج کی رات
ہے یہ جبریل کی خواہش کہ بشر ہو جائے

Marfat.com

منصور حلاج کا آخری بیان

عدم سے میں ہست ہو گیا ہوں
زمین میں پیوست ہو گیا ہوں
مقام تھا میرا لامکاں میں
میں خاک میں پست ہو گیا ہوں
جوان ہونے سے پہلے پہلے
جہاں نے مجھ کو سکھا دیا تھا
وہی طریقہ
جو میری خاکی سرشت میں تھا
میں اس سے پہلے بہشت میں تھا
میں عہد بچپن کی شادماں وادیوں میں اکثر
انہی بہشتوں کو ڈھونڈتا ہوں
جہاں پھلوں سے لدے
حسیں پیڑ تھے
ہوا تھی
جہاں کے شفاف ندی نالوں میں
دودھ کی طرح جھاگ اڑاتے
کہ شہد کی سی مٹھاس لاتے
ہزار آب حیات تیزی سے چل رہے تھے

Marfat.com

وہ ایک پھل
آ گہی کا پھل تھا
جو میں نے کھایا
اور اس کے کھاتے سے
اپنی نظروں میں گر گیا میں
اور ایک ننگا وجود جو میرے سامنے تھا
ہوس پرستانہ خواہشوں کی
غلیظ سولی پہ چڑھ چکا تھا
اسی نے اشرف بنایا مجھ کو
اسی نے ارذل بنا دیا تھا
میں اپنی نظروں میں گر گیا تو
پھر ایک دن میں نے خود کو دیکھا
میں آدمی کے لباس میں ہوں
اور اس زمین پر کھڑا ہوا ہوں
اسی نے مجھ کو زبان بخشی
تو میں نے سارے جہان کو یہ بتا دیا کہ
اے بزم ہستی کے نازنینو!
اے بزم ہستی کے خوشہ چینو!
سنو!
تمہیں مجال مفر نہیں ہے
کہ میری محفل میں سر اٹھاؤ

Marfat.com

ہزار سیلاب
لاکھ طوفان
میرے رستے میں آئے لیکن
مرے سفینے میں زندگی تھی
لگن تھی، جذبہ تھا، جستجو تھی
مری تمنا بلندتر تھی
میں اپنی کشتی بچا کے
''جودی'' پہاڑ کی سرفراز چوٹی پہ آن پہنچا
پھر ایک دن
مجھ کو حسن یوسفؑ عطا ہوا اور
بھاری قیمت سے بک گیا میں
مجھے کلیمی ملی تو میں نے
بہشت کے سارے بند چشمے
عصائے فکر ونظر کی
بس ایک ضرب کاری سے کھول ڈالے
میں ابن مریمؑ ہوا تو میں نے
زمیں پہ انساں کے
سارے دکھ درد کی دوا کی
پھر ایک دن
مجھ کو ایسا رتبہ ملا کہ
ارض وسماء نے

Marfat.com

رستے سجا دیے اور
فلک کے سارے ستارے
جھک جھک کے
میرے قدموں میں گر رہے تھے
بہار پھولوں کے ہار لے کر کے
میری راہوں میں آ کھڑی تھی
مجھے یقیں تھا
کہ میں نے معراج پا لیا ہے
مجھے لگا
جیسے میری تکمیل ہو گئی ہے
میں اپنے پیکر میں آ گیا ہوں
مقام تھا میرا لامکاں میں
میں لامکاں میں سما گیا ہوں
بس اس گھڑی میں نے
خود کو اپنے ہی آئینے میں
قریب سے اک نظر جو دیکھا
تو میں یہ سمجھا
کہ میں ہی مقصودِ زندگی تھا
میں خود خدا تھا

باب

علم الہیت اور خدا

اشیائے مادی کا فہم حقیقی

زندگی نور کے ایک نقطے کی طرح آگے سے آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ غیر مادی ماحول میں نور کے یہ نقطے بصارت کی مدد سے دکھائی نہیں دیتے لیکن مادی ماحول میں یہ اشیاء کو روشن کر دیتا ہے۔ بالفاظ دیگر زندگی اشیاء کو روشن کر دیتی ہے۔ جب تک ہم انسانوں کا شعور روشن نہیں تھا خدا کو کوئی نہ جانتا تھا کہ خدا کون ہے؟ چرند پرند سیارے اور جنگلی حیات سے پر زمین، خدا کا ادراک حاصل کرنے سے قاصر تھی لیکن جنگلی حیات میں نور کا نقطہ موجود تھا جو بتدریج آگے سے آگے بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ اشیاء روشن ہو گئیں۔ اشیاء کو دیکھنے' ان کا ادراک حاصل کرنے اور ان کے نام رکھنے والا پیدا ہوا تو گویا زمین پر پہلی مرتبہ خدا کا نام لیا گیا۔ ورنہ کروڑوں سال سے آباد سیارۂ زمین فضائے بیکراں میں تیرتا ہوا' کہکشاؤں کی دھول کا محض ایک ذرہ تھا۔ بے شک آنکھیں تو جانوروں' پرندوں حتیٰ کہ بعض کیڑے مکوڑوں کی بھی تھیں لیکن وہ اشیاء کے سہ جہتی ادراک سے قاصر تھے۔ سہ جہتی ادراک ہی اشیاء کا بظاہر حقیقی ادراک ہے۔ کسی شے کا یکجہتی (One dimentional) یا دو جہتی (Two Dimentional) ادراک، ادراک حقیقی کہلانے کا مستحق نہیں۔ ٹھیک اسی مقام پر امام غزالی فرماتے ہیں:

مَنْ لَمْ یَعْرِفِ الْهَیة والتّشریح فهو عنین فی معرفت اللّٰه تعالیٰ

''جو علم ہیئت اور تشریح سے واقف نہیں وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت

Marfat.com

میں نامرد ہے۔''

موجودہ سائنس اس بات پر متفق ہے کہ حشرات الارض کیڑے مکوڑے اور مکھیاں اشیاء کا محض یکجہتی (one dimentional) ادراک رکھتی ہیں۔ اُن کے نزدیک ہر چیز ایک سیدھی لکیر ہے۔ سائنس تمام چوپائیوں، جنگلی جانوروں اور پرندوں کو دو جہتی جانور (Two dimentional Animals) تصور کرتی ہے۔ جن کے نزدیک ہر شے کی صرف دو سمتیں ہیں۔ جہتوں کا قضیہ عام قاری کے لیے سمجھنا آسان نہیں۔ چنانچہ اس کی وضاحت کے لیے ہم ایک مثال کی مدد لیتے ہیں۔

''فرض کریں ہم کسی کورے کاغذ پر کسی چیز کی شکل بناتے ہیں۔ مثلاً ہم ایک گلاس ایک دروازہ یا ایک میز کی ڈرائینگ کرتے ہیں۔ یہ تصویر بنانے کے لیے ہمیں کاغذ کی سطح پر صرف دو جہتیں میسر ہیں ایک اُفقی اور دوسری عمودی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کسی چیز کی تصویر کو اصل شے جیسا حقیقی نہیں بنا سکتے۔ کیونکہ ہمارے پاس تیسری جہت کی کمی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہم گلاس میز یا دروازے کو عقبی سمت سے دیکھیں لیکن ہم کاغذ پر ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ کاغذ پر بنائی گئی تصویر میں صرف دو رُخ ہوتے ہیں۔ یہ محاورہ کہ...... ''تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں'' ......بھی اسی وجہ سے مشہور ہے۔ تصویر کے اُفقی رخ کو ''ایکس محور'' (X Axis) اور عمودی رُخ کو ''وائے محور'' (Y Axis) کہتے ہیں۔ ہمارے پاس تصویر کا تیسرا رخ یعنی ''زید محور'' (Z Axis) نہیں ہوتا۔ جبکہ حقیقی اشیاء ''سہ جہتی (Three

(dimentional ہوتی ہیں۔ ڈرائنگ کی زبان میں اسے
''تھری ڈی''3d کہتے ہیں۔''

مادی اشیاء کی حقیقت کا ادراک صرف انسان کے بس کی بات ہے۔ چنانچہ انسان کو تین جہتی جانور (Three dimentional Animal) بھی کہا جا سکتا ہے۔ قرآن حکیم نے اسی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے...... وعلم آدم الاسماء کلھا...... کا اعلان فرمایا۔ یعنی آدم کو تمام اشیاء کے نام بتا دیے گئے۔ تصویر کائنات کو تین رخوں سے دیکھنے کا شرف انسان کے حصے میں آیا۔ تو گویا زندگی بیدار ہو گئی۔ نور کا وہ نقطہ جو غیر مادی ماحول سے آیا تھا پھیل کر کائنات کے ذرے ذرے کو روشن کرنے لگا۔ انسان نے ادراک کا مقام حاصل کر کے خود کو دوسرے حیوانات سے ممتاز کر لیا۔ زندگی درجہ بدرجہ بلند سے بلند مدارج طے کرتی چلی گئی۔ حشرات کے لیے یہ کائنات ایک لکیر تھی۔ جانوروں کو دو لکیریں محسوس ہوئیں لیکن انسان نے اشیاء کو پوری طرح پہچان لیا۔ سامنے سے، پشت سے...... بلندی سے، پستی سے...... دائیں رخ سے اور بائیں رخ سے۔ شمار کرنے میں یہ چھ اطراف تھیں لیکن سیدھے خط کھینچے گئے تو سہ جہات (Three dimentions) بن گئے۔

زندگی خود کو پہچاننے نکلی تھی۔ خلاقِ عالم نے چاہا تھا کہ وہ پہچانا جائے کنت کنزًا مخفیًا...... کی صدائیں گونج رہی تھیں۔ چنانچہ زندگی درجہ بدرجہ یا قرآنِ حکیم کی زبان میں لترکبن طبقا عن طبق...... اوپر چڑھتی چلی آئی۔ یہاں تک کہ مقامِ ادراک آ پہنچا اور زندگی نے خود کو دیکھنا شروع کر دیا لیکن یہ محض آغاز تھا جسے نومولود شعور نے انجام سمجھ لیا۔ زندگی محض ادراک حقیقت پر راضی ہونے والی نہ تھی۔ اس سے اگلا مرحلہ تھا انکشافِ حقیقت۔ لیکن بھولا بھالا معصوم انسان اپنے اردگرد موجود سہ جہتی

Marfat.com

(3 dimentional) اشکال کی حقیت کو کلی حقیقت سمجھ بیٹھا۔

انکشاف، ادراک سے زیادہ بلند درجہ ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر ایک انسان محصورِ کائنات نہیں رہتا۔ گفتگو کا یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر علامہ اقبال خاصے بھاری بھر کم الفاظ استعمال کرنے پر مجبور ہو جایا کرتے تھے۔ آپ کے خطبات میں مندرجہ ذیل عبارت دیکھنے لائق ہے۔

''اندریں صورت میں یہ سمجھتا ہوں کہ زمانے کو بعد رابع (Fourth dimention) ٹھہرانا گویا اس کی نفی کرنا ہے۔ حال ہی میں ایک روسی مصنف ''اوس پنسکی'' (Ous pensky) نے اپنی کتاب ''نظام ثالث'' (Tertium Orgamem) میں ''بعد رابع'' کا تصور اس طرح کیا ہے کہ یہ عبارت ہے سہ بعدی (3 Dimentional) اشکال کی اُس سمت میں حرکت سے جو ان کے اندر موجود نہیں۔ جس طرح نقطوں، خطوں اور سطحوں کی اُس سمت میں حرکت سے جو اُن کے اندر موجود نہیں، مکان کے ابعادِ ثلاثہ پیدا ہو جاتے ہیں بعینہٖ جب کوئی سہ بعدی شکل اُس سمت میں حرکت کرتی ہے جو اُس میں موجود نہیں تو اس سے مکان کے بعد رابع کا ظہور ہوتا ہے۔ اب چونکہ زمانہ ہی وہ فاصلہ ہے جو باعتبارِ تواتر، حوادث کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے اور مختلف نظامات میں ترتیب دیتا ہے۔ لہٰذا یہی وہ فاصلہ ہے اور اُس سمت میں واقع جو سہ بعدی مکان میں موجود نہیں۔ بحیثیت ایک نئے بعد کے ہم اس فاصلے کی پیائش جس کا وظیفہ ہی

یہ ہے کہ باعتبارِ تواتر، حوادث کو ایک دوسرے سے جدا کرے، سہ بعدی مکان کے ابعاد سے نہیں کر سکتے۔ بعینہٖ جیسے یہ ممکن نہیں کہ ہم سال کی پیمائش سینٹ پیٹرز برگ سے کریں۔ وہ ہر سمت کے عمود میں واقع ہے، متوازی کسی سے نہیں لیکن اسی تصنیف میں ایک دوسری جگہ اوس پنسکی نے لکھا ہے کہ ہماری حسِ زمانی دراصل ایک مبہم سی حس مکانی ہے اور پھر ذہن انسانی کی ساخت کو حجت ٹھہراتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ایک یا دو یا سہ جہتی ہستیوں پر اس بعد کا انکشاف زمانی تواتر کی شکل میں ہی ہو گا لیکن اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ ہم سہ بعدی ہستیاں (انسان) جس چیز کو زمانے سے تعبیر کرتی ہیں وہ دراصل مکان ہی کا ایک بعد ہے، جسے ہم کماحقہ محسوس نہیں کر سکتے۔"

اب ذرا ہم ایک نظر زمین کے سہ بعدی ماحول سے نکل کر کھلی خلا میں مکان کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ خلاء میں کسی انسان کے سامنے کوئی سمت نہیں۔ دائیں بائیں، آگے پیچھے اور اوپر نیچے کا کوئی تصور خلاء میں موجود نہیں۔ ہم جب ایک خلائی شٹل میں بیٹھ کر زمین سے اربوں نوری سال دور کسی بیکراں مقام پر موجود ہوں گے تو ہم کسی صورت یہ نہیں بتا سکتے کہ ہمارے اطراف میں کون کون سی سمتیں ہیں۔ ہمارے لیے پیروں کے نیچے یا سر سے اوپر کے الفاظ کوئی معنی نہیں رکھتے۔ کیونکہ خلائے بسیط میں کوئی شمال جنوب یا مشرق مغرب نہیں۔ ہو سکتا ہے ہم ایک لمحے میں بیس مرتبہ قلابازی کھا کر رہ جائیں۔ ہمارے پیروں تلے زمین نہیں اور نہ ہی کشش ثقل ہے۔ پھر یہ ہم کیسے بتا سکتے ہیں کہ ہم کس سمت میں ہیں؟ ہم نہیں بتا سکتے۔ خلاء میں ہمارے پاس مکان کی پیمائش کا

Marfat.com

صرف ایک ہی ذریعہ ہوتا ہے اور وہ ہے وقت۔ ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ ہم زمین سے اتنے ''نوری سال'' (Light year) کے فاصلے پر ہیں۔ جب ہمیں پتا چلتا ہے کہ ہم زمین سے کتنے نوری سال کے فاصلے پر ہیں تو ہمیں یہ بھی پتا چل جاتا ہے کہ ہم کس طرف ہیں۔ مثلاً ہماری کہکشاں کے مرکز تک پچیس ہزار نوری سال کا فاصلہ ہے۔ ہم کہکشاں کے وسطے میں بیٹھ کر یہ بتا سکتے ہیں کہ زمین سے کس رخ پر ہیں لیکن زمین پھر بھی ہمارے لیے ایک علامت رہے گی اور یہی ہماری سب سے بڑی کمزوری ہوگی۔

سینٹ پیٹرز برگ کی مثال میں شاید علامہ صاحب اسی کمزوری کی طرف اشارہ فرماتے ہیں۔

جدید سائنس کی تحقیقات کے مطابق مکان کی چوتھی جہت زمانہ (Time) ہے۔ یہی سہ جہتی (3D) اشکال کی فی الحقیقت وہی حرکت ہے جو اُن میں موجود نہیں۔ موجودہ فلکیات دان اس بات پر متفق ہیں کہ جب ہم خلاء میں سفر کر رہے ہوتے ہیں تو فی الحقیقت ہم وقت میں سفر کر رہے ہوتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر احساس ہوتا ہے کہ تھری ڈائی مینشنل جانور ہونا بھی تو کوئی بڑی بات نہیں۔ اگر ہمیں اشیاء کا حقیقی ادراک ہوتا تو ہمیں سہ بعدی اشیاء کے چوتھے بعد کا بھی ادراک ہوتا اور ہم زمانے کے بارے میں بھی ویسا ہی تصور قائم کر لیتے جیسا اشیاء کے بارے میں کر سکتے ہیں۔ یوں لگتا ہے ابھی ہمارا شعور اشیاء کے سہ جہتی ادراک سے بڑھ کر کچھ نہیں سوچ سکتا...... بالکل ویسے جیسے ایک چوپایہ سہ جہتی شے کا تصور قائم نہیں کر سکتا لیکن کیا ہمارے لیے خود کو ترقی دینا ممکن نہیں؟ ہم کیوں نہ ایسی ہستیاں بن جائیں جو اشیاء کو تین جہات سے بڑھ کر دیکھ سکنے کی اہل ہوں۔ اوس پنسکی یا آئن سٹائن شعوری طور پر بعد رابع کی بات تو کر سکتے ہیں لیکن کیا وہ چوتھے بعد کو اپنے احساس میں اُسی طرح اُتار سکتے ہیں جس طرح تین

Marfat.com

ابعاد اُن کے احساس میں جاگزیں تھے۔

ہم ارتقاء یافتہ ہستیاں بن سکتے ہیں، ہم اشیاء کا ادراک اُن کی اصل حقیقتوں کی حد تک کر سکتے ہیں لیکن اس کے لیے ہمیں عقلی کوششوں کے ساتھ ساتھ...... احساس کی دنیا میں بھی انقلاب کی جستجو کرنا ہوگی۔

کیا ایسا کوئی مقام ہے جہاں شعور کی مدد کے بغیر ہم اشیاء کا ادراک کر سکتے ہوں۔ اُس پرند کی طرح جو بے منتِ عقل اپنی بے نشان راہ دیکھ لیتا ہے۔ شعور کے بعد کسی ایسی توانائی کا حصول یقیناً عجب رنگ دکھائے گا۔ زمانے اور مکان کا صحیح تصور علم الھیت کے راستے سے ہی ممکن ہے۔ علم الھیت کو محض فلکیات تک محدود کر دینا درست نہیں۔ ہمارا شعور ادراک حقیقت سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ چنانچہ ہمیں شعور سے بڑھ کر کسی اور ایسے ذریعے کی ضرورت پڑتی ہے جو ہمیں مقام ادراک سے آگے لے جائے۔ وہاں لے جائے جہاں حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔ یہی زندگی کا سفر ہے۔

خدا ایک زندہ و جاوید ہستی کا نام ہے۔ جو ہر پل نئی سے نئی ہیئت میں اپنے زندہ ہونے کا ثبوت دیتی ہے۔

یہ کائنات چھپاتی نہیں ضمیر اپنا
کہ ذرے ذرے میں ہے ذوقِ آشکارائی

ہم شعور کے ذریعے خدا کا ادراک حاصل کر سکتے ہیں لیکن ادراک کوئی مکمل شے نہیں۔ ادراک ہمارے جسم و جاں پر اثرات نہیں ڈالتا۔ اس مقام پر ہم زیادہ سے زیادہ خدا کے نام کی مالا جپ سکتے ہیں۔ آپ کسی ایک سال کے بچے سے کہیے کہ وہ انگارے کو ہاتھ مت لگائے ورنہ اُس کا ہاتھ جل جائے گا۔ وہ بچہ آپ کی بات سنے گا ہو سکتا ہے آپ کی بات کو دوہرانے بھی لگے لیکن وہ انگارے پر ہاتھ ڈالنے سے باز نہیں

Marfat.com

آئے گا لیکن جونہی اُس کے ہاتھ نے انگارے کو چھوا اُس کے تن بدن میں اس امر کا حق الیقین پیدا ہو جائے گا کہ انگارے کو چھونے سے ہاتھ جلتا ہے۔ یہ ایک احساس ہے جو اس کے شعور میں پیدا نہیں ہوا بلکہ اس کے دل میں پیدا ہوا۔ وہ دل سے خوف کھا گیا کہ اب انگارے کو نہیں چھونا۔ گویا اب اُسے قلبی تیقن حاصل ہو چکا ہے کہ انگارہ جلاتا ہے۔

اسی طرح جب ہم سہ جہتی (3d) مکانی اشکال کا تصور کر لیتے ہیں تو ہم عامۃ الناس کی زبان میں باشعور ہو جاتے ہیں۔ ہمارے گھر' ہمارے کاروبار' ہماری روزمرہ کی زندگی کے لیے اشکال کا، سہ جہتی تصور ہی کافی ہے لیکن ہماری ذات کے لیے یہ تصور ناکافی ہے۔ ہمیں اُس بچے کی طرح اپنے قلب میں یہ احساس پیدا کرنا ہو گا کہ سہ جہتی اشکال کا ادراک صرف ہماری زندگی کے لیے ایک سنگِ میل تھا۔ ہمیں اور سے اور...... جہات کو اپنے تصور میں لانا ہو گا اور پھر اِن کا اُدراک حاصل کرنے کے بعد انہیں اپنے قلب میں ایک احساس کی صورت دیکھنا ہو گا۔ جیسا کہ اس بچے نے دیکھا جس نے انگارے کو چھوا۔ سہ جہتی اشکال سے بڑھ کر بھی کوئی جہات ہیں؟ یہی سوال ہمیں اعلیٰ سے اعلیٰ انسان بننے کی ترغیب دیتا ہے لیکن افسوس کہ ہم مادے کو اپنے سامنے رکھ کر سہ جہتی تصور سے بالاتر ہو کر نہیں سوچتے۔ جب تک مادے کا بت ہمارے سامنے کھڑا رہے گا ہم کسی ایسی چیز کا تصور نہیں کر پائیں گے جو مادے سے بالاتر ہو۔ مادہ (Mater) کیا ہے؟ ایٹموں کا ایک مختصر سا مجموعہ جو خالق عالم کے لیے پیدا کرنا ایک بالکل معمولی سا واقعہ ہے...... مکان کیا ہے؟ جب ہم مادے کو حرکت کرتا ہوا دیکھتے ہیں تو جہاں جہاں تک وہ حرکت کرتا ہے وہاں تک کی جگہ کو ہم مکان کہتے ہیں۔ زمانہ ہو یا مکان...... ان سب کو ہم مادے کی وجہ سے پہچانتے ہیں۔ جبکہ مادہ بذاتِ خود کچھ نہیں۔ محض توانائی کی بدلی ہوئی ایک شکل۔ تو پھر کیا نتیجہ نکلے گا؟ یہی کہ:

Marfat.com

خود ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری
نہ ہے زماں نہ مکاں لا الٰہ الا اللہ

ایک باشعور شخص دوسرے باشعور شخص کو بہت سی باتیں اچھی طرح سمجھا سکتا ہے۔ سمجھانے والا ہر وہی چیز سمجھا سکتا ہے جو اُس کے اپنے فہم میں صاف صاف موجود ہو۔ مختلف مثالوں کی مدد سے وہ اُس شخص کو جو سمجھنا چاہ رہا ہے اپنی پوری بات سمجھا دیتا ہے لیکن وہ احساسات کو منتقل نہیں کر سکتا۔ احساس کو منتقل کرنا ایسا ہے جیسا میں اپنے گھٹنے کا درد آپ کو منتقل کر دوں۔ حقیقت کا احساس حاصل کرنا ذاتی تجربے اور مشاہدے کے بغیر ممکن نہیں۔ آپ سینکڑوں کتابیں پڑھ سکتے ہیں۔ ہزاروں تقریریں سن سکتے ہیں لیکن آپ مقام ادراک سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ بے شک علم تو آپ کے پاس بہت ہوگا لیکن جب تک آپ انگارے کو ہاتھ سے چھو کر نہ دیکھیں، احساس آپ تک نہیں پہنچ سکتا۔

دراصل ہم اشیاء کے بارے میں جان کر خوش ہوتے ہیں لیکن ہم اُس وقت بالکل ناخوش ہوتے ہیں جب ہمیں کسی شے کی حقیقت کا پتا نہ چل رہا ہو۔ ایک بچے کے تجسس کی طرح ہمارا تجسس بھی نہ سمجھ میں آنے والی شے کی طرف لپکتا ہے ہم اُسے سمجھنا چاہتے ہیں۔ جونہی وہ شے ہمارے حیطہء ادراک میں داخل ہوتی ہے ہم خوش ہو جاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے اسے اچھی طرح سمجھنے کے بعد ہی گفتگو کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ متعلقہ شے کا فہم پہلے ہی سے ہمارے اندر موجود ہے۔ مثال کے طور پر ہمیں جب بھی پہلی مرتبہ پتا چلا کہ پانی بھاپ بن کر اُڑ جاتا ہے تو فی الحقیقت ہمارے اپنے اندر موجود چند حقیقتیں تھیں جنہیں ہم بہت پہلے بذریعہ احساس سیکھ چکے تھے۔ ہمیں معلوم تھا کہ آگ حرارت پیدا کرتی ہے، چیزوں کو جلا دیتی ہے۔ خشک چیزیں جل کر

راکھ ہو جاتی ہیں، مائع کھولنے لگتا ہے۔ چنانچہ جونہی ہم نے کھولتے ہوئے پانی کو بھاپ بن کر بلندی کی طرف اٹھتے ہوئے دیکھا اور پھر ہم نے دیکھا کہ برتن میں پانی کم رہ گیا تو ہمیں پتا چل گیا کہ بھاپ بن کر اُٹھنے والا دھواں پانی ہی تھا۔ اس طرح کی مثالیں ہماری زندگی کے ایک ایک پل میں سے دی جا سکتی ہیں۔ ہمارے تجسس کو تسکین اُسی صورت میں مل سکتی ہے جب ہم اپنے اندر موجود حقیقتوں کے ساتھ کسی نو دریافت حقیقت کا موازنہ کریں اور پھر اُسے قبول کریں۔ علم حاصل کرنا گویا تائید کرنا ہے...... اس بات کی تائید کہ ہاں جو علم مجھے حاصل ہوا میرے من میں ایسا ہی موجود تھا۔ ہم جب روزمرہ زندگی میں کوئی نئی بات سن کر چونکتے ہیں۔ خاص طور پر ایسی بات جس کا تعلق علم سے ہو۔ تو یہ ایک طرح سے یوں کہنے کے مترادف ہوتا ہے...... اچھا!...... تو یہ بات ہے۔ اس کا تو مجھے پہلے سے پتا تھا۔ جب ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ ہماری زمین ایک گول کرہ ہے جو ہزاروں لاکھوں سیاروں اور ستاروں کے ساتھ اس کھلی خلاء میں گردش کر رہا ہے۔ تو ہم چونک جاتے ہیں۔ ہم اس لیے چونکتے ہیں کیونکہ یہ بات ہماری سمجھ میں آ گئی۔ ہم نے ستاروں کو دیکھ رکھا تھا۔ کھلے آسمان اور خلائے بسیط سے ہم واقف تھے اور پھر کرۂ زمین کا ماڈل ہمیں بارہا مرتبہ دیکھنے کو ملا تھا۔ چنانچہ ہم کوئی نئی بات نہیں سیکھتے بلکہ اپنے اندر موجود کسی پرانی بات کو اچانک ڈھونڈ لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علمی نقطہ جان کر ہم خوش ہوتے ہیں۔

اس بات کو مزید سمجھنے کے لیے ہمیں ایک سرسری نظر علم اور تعلیم کے فرق پر بھی ڈالنی ہوگی۔ علم (Knowlege) اور تعلیم (Education) دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ ان دونوں کی ظاہری علامات یہ ہیں کہ علم انسان کو خوش کرتا ہے اور تعلیم طبیعت پر گراں گزرتی ہے۔ تعلیم کا مطلب ہے سدھانا۔ مثلاً ہم اپنے بچے کو کھانا کھانے کے

Marfat.com

آداب سکھاتے ہیں تو یہ تعلیم ہے۔ ہم اسے یہ نہیں سمجھاتے کہ کھانا آداب کے ساتھ کیوں کھانا چاہیے۔ اس سے کیا فائدہ ہوتا ہے۔ اگر ہم اُسے یہ بتائیں کہ کھانا آداب کے ساتھ کیوں کھانا چاہیے تو یہ علم ہوگا۔ مثلاً ہم اُسے کہیں گے کہ دیکھو جانور بھی کھاتے ہیں اور ہم بھی کھاتے ہیں لیکن جانور اسی وجہ سے جانور ہیں کہ وہ اچھا کھانا نہیں کھاتے۔ وہ کھانا کھانے کے دوران صفائی کا مطلق خیال نہیں رکھتے۔ مٹی، گندگی اور اس طرح کی بہت سی چیزیں اپنی غذا کے ساتھ ہی کھا جاتے ہیں۔ ہم انسان ہیں ہمیں اس طرح کھانا چاہیے کہ ہم جانوروں سے بالکل ممتاز رہیں۔

ہم جب اس طرح سے اپنے بچے کو سمجھائیں گے تو یہ علم ہوگا لیکن جب تک بچہ سمجھنے کی عمر تک نہیں پہنچے گا ہم اُسے تعلیم ہی دیتے رہیں گے کہ کھانا ہاتھ دھو کر کھانا چاہیے، دائیں ہاتھ سے کھانا چاہیے، منہ سے چپڑ چپڑ کی آواز نہ آئے...... وغیرہ وغیرہ۔ تعلیم کے مقابلے میں علم بہت بڑی چیز ہے۔ علم کو پا کر بچے سے لے کے بوڑھے تک سبھی خوشی اور سرشاری محسوس کرتے ہیں۔ ''علم ہمارے تجسس کی تسکین کا دوسرا نام ہے'' علم کا سفر ہمیشہ ''کیوں'' سے شروع ہوتا ہے۔ بالفاظِ دیگر علم کے پیش نظر ہوتا ہے...... وجہ جاننا۔ میں کھانا آداب کے ساتھ کیوں کھاؤں؟ اس کی وجہ مجھے معلوم ہونی چاہیے۔

اب جب ہم پر یہ واضح ہوگیا ہے کہ علم ہمارے تجسس کی تسکین کا دوسرا نام ہے۔ تو یہ بھی واضح ہوگیا ہے کہ ادراک کی حدود کیا ہیں۔ جب تک علم آپ کو سرشاری نہ دے، نئی بات سن کر آپ کو مزا نہ آئے، بلکہ آپ کی کیفیات اس کے برعکس ہوں۔ جب تک اہل علم کا بیان آپ کی سماعت پر گراں گزرے، آپ کو بور کرے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ مقام ادراک سے بھی پیچھے ہیں اور آپ کا فہم کسی ایک سال کے بچے کے فہم کی

طرح ناپختہ ہے لیکن اگر آپ اہل علم کا بیان سن کر جھوم جھوم جاتے ہیں یعنی آپ کو خوشی حاصل ہوتی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ مقام ادراک پر اچھی طرح سے فائز ہو چکے ہیں لیکن مقام اِدراک کی حدود متعین ہیں۔ بے شک آپ کا فہم اتنا پختہ ہو چکا ہے کہ ایک علمی نقطہ آپ کے تجسس کو تسکین پہنچا سکتا ہے لیکن یہ فہم بھی صرف فہم شعوری ہے۔ آپ نے اپنے فعال، ادراک کی وجہ سے اس بات کا فہم شعوری حاصل کر لیا کہ آگ جلا دیتی ہے، چاقو کی دھار سے ہاتھ کٹ جاتا ہے، کیلے کے چھلکے سے پیر پھسلے تو انسان دھڑام سے جا گرتا ہے لیکن آپ کا ہاتھ کبھی آگ سے جلا نہیں، چاقو سے کٹا نہیں یا آپ کا پیر کبھی کیلے کے چھلکے پر نہیں پھسلا تو آپ فہم شعوری' صرف فہم شعوری ہی رہے گا۔ یہ ترقی پا کر فہم حقیقی صرف اُسی صورت بن سکتا ہے جب آپ قلبی احساس کے مراحل سے گزرے ہوں۔ علم نے آپ کے تجسس کو تسکین تو پہنچا دی لیکن آپ پھر بھی حقیقت کو دل و جان سے قبول نہ کر سکے۔ آپ کسی حقیقت کو دل و جان سے صرف اُسی صورت قبول کریں گے جب آپ پر وہ حقیقت کسی احساس کی طرح سے طاری ہو جائے۔

مقامِ ادراک بے شک بہت بلند ہے لیکن اس سے آگے مقام انکشاف ہے۔ مقامِ ادراک پر...... آپ اوپر سے اوپر جا سکتے ہیں۔ یونان کے ایک سائنسدان کا مشہور قول ہے:

''میں ایران کی بادشاہت کو ایک معمولی سا علمی نقطہ جاننے کے لیے ٹھکرا سکتا ہوں۔''

یہ ادراک کا بلند ترین مقام ہے۔ جب آپ اپنے تجسس کو تسکین پہنچانے کے عادی (Adicted) ہو جائیں جس طرح ایک نشئی اپنے جسم یا دماغ کو تسکین پہنچانے

کے لیے منشیات کا سہارا لیتا ہے اس طرح آپ اپنے ذوق کو تسکین پہنچانے کے لیے نشۂ علم کے عادی ہو جائیں تو سمجھ لیجیے آپ نے اپنے احساس کو زندہ کر لیا۔ علم جستجو کرنے والے کی صدائے ہل من مزید کے جواب میں اُسے وافر مقدار میں غذا مہیا کرتا ہے۔

لا تقنطوا جواب ہے ھل من مزید کا

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بعثت سے پہلے ہمیشہ ایک دعا فرمایا کرتے تھے۔

اَللّٰھُمَّ ارنی حقائق الاشیاء کما ھِیَ

ترجمہ: اے اللہ! مجھے اشیاء کی حقیقت دکھا جیسی وہ ہے''

نبوت ملنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے میرے پیغمبر! تو اس طرح دعا کیا کر:

رب زِدنی علما

''اے پروردگار! میرے علم میں اضافہ فرما۔''

فرق صاف ظاہر ہے۔ اشیاء کی حقیقت جاننے کا تجسس محض فہم شعوری کو پختہ کرتا ہے جونہی تجسس کو تسکین ملتی ہے تو مقام ادراک کا ظہور ہوتا ہے لیکن...... اے اللہ! میرے علم میں اضافہ فرما...... کہنے سے گویا یہ ماننا لازم آتا ہے کہ علم تو میرے پاس موجود ہے۔ اے اللہ تو اس میں اضافہ فرما۔ یہ ایک ناقابل تردید مشاہدہ ہے کہ ہم علم کے طور پر جو کچھ حاصل کرتے ہیں وہ سب کچھ فی الحقیقت ہمارے باطن میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ ہمارے ذہن کا کام صرف تطبیق دینا ہے۔ خارج سے ہمارے فہم تک پہنچنے والا علم ہمارے داخل یعنی باطن میں موجود ذخیرہ (Data) سے مطابقت (Tally) رکھتا ہو تو ہم اُسے قبول کرتے ہیں۔ ورنہ ہمارا فہم اُسے رد کر دیتا ہے جس قدر کسی شخص کا مقامِ ادراک بلند ہوگا، اُسی قدر اُس کے فہم میں تطبیق (ٹیلی کرنے) کا نظام درست اور

صاف ہوگا۔ رسول اکرم کی دوسری دعا کا مفہوم یہ ہے کہ...... اے اللہ! مجھے اپنے علم خارجی اور علم داخلی میں مطابقت دیکھنے کی زیادہ سے زیادہ توفیق عطا فرما۔

فہم شعوری دنیاوی زندگی میں ایک انسان کے لیے درمیانی درجہ ہے۔ اس سے پست درجہ پر بھی بے شمار انسان موجود ہیں۔ اس درجہ کو ''فہم غیر شعوری'' کہنا چاہیے۔ بے شک عام معنوں میں فہم اور شعور ایک جیسی چیزیں ہیں لیکن یہاں میرے پیش نظر فہم اور شعور کا وہ لطیف فرق بھی ہے جو ان الفاظ کے اہل زبان اچھی طرح جانتے ہیں۔ فہم غیر شعوری اس بچے کے پاس ہے جسے آپ نے کہا تھا بیٹا! انگارے کو مت چھونا ورنہ ہاتھ جل جائے گا۔ اُس نے آپ کی بات کو سن کر سر ہلا دیا تھا لیکن وہ کچھ نہ سمجھ پایا تھا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ غیر شعوری فہم تو جانوروں کے پاس بھی ہوتا ہے۔ بلی اپنے بچے کو دشمن کے ڈر سے سات جگہوں پر چھپاتی ہے۔ اسے اس بات کا فہم غیر شعوری حاصل ہے کہ اس طرح کرنے سے اُس کے بچے محفوظ رہیں گے۔ بعض جانور جب کوئی زہریلی چیز کھا لیتے ہیں تو از خود ایسی بوٹیاں اور گھاس تلاش کر کے بطور دوا، استعمال کرتے ہیں جو اس زہر کا اثر ختم کر دے۔ کیا آپ نے کبھی بلی اور کتے کو گھاس کھاتے نہیں دیکھا۔ وہ اپنا خراب ہاضمہ درست کرنے کے لیے دوا کے طور پر گھاس کھاتے ہیں۔ گویا انہیں فہم غیر شعوری حاصل ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ گھاس کھانے سے ان کا ہاضمہ ٹھیک ہو جائے گا لیکن یہ بات انہیں کس نے بتائی؟ نہ ہی انہیں تعلیم دی گئی اور نہ ہی تربیت۔ کتے اور بلی نے اپنے وجدان کے کہنے پر اپنا علاج کیا۔ گویا فہم غیر شعوری دوسرے الفاظ میں وجدان ہی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو فہم غیر شعوری ایک نعمت ہے اور وجدان کا مقام فرد کے لیے ایک اعزاز۔ لیکن اس کے باوجود اس کا رتبہ فہم شعوری سے کم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں جگہ جگہ ارشاد فرمایا ہے کہ اشیائے

Marfat.com

کائنات پر غور کرو اور اپنے فہم شعوری کو زیادہ سے زیادہ پرورش دو۔ قرآنِ حکیم صرف شعور انسانی کو بیدار کرنے کے لیے نازل ہوا یا بالفاظِ دیگر فہم شعوری کو بیدار کرنے کے لیے۔ چنانچہ جب سے قرآنِ حکیم نازل ہوا ہے بڑی تیزی کے ساتھ تمام انسانوں کا فہم شعوری بیدار ہونا شروع ہو گیا۔ یورپ کی موجودہ ترقی محض اسی وجہ سے ممکن ہوئی ہے کہ اہل یورپ نے اشیاء کی حقیقت کو جاننے کے لیے اپنے فہم شعوری کو بیدار کر لیا۔ یہ سب قرآن حکیم کا کرشمہ ہے۔ یورپ کے ایک سرے پر علماءِ اندلس نے تعلیماتِ قرآنی اہل یورپ کو سکھانا شروع کیں تو دوسرے سرے پر علمائے بغداد و قسطنطنیہ اور علمائے ایران نے علوم کے سرچشمے کھول دیے۔ دنیا گزشتہ ڈیڑھ ہزار سال میں بڑی تیزی کے ساتھ بدلی ہے اور یہ سب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا نتیجہ ہے۔ ورنہ اِس سے قبل دنیا پر افلاطونی تصوف کے کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔

قرآنِ حکیم نے فہم شعوری کو بیدار کیا تو انسان کو اپنی قوتِ فکر کام میں لانی پڑی۔ علامہ اقبالؒ کے قول کے مطابق...... ''اسلام کے ساتھ ہی استقرائی عقل کا آغاز ہوا'' قوتِ فکر پر جمود کا جو سلسلہ کئی ہزار سال سے طاری تھا، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں کی آمد کے بعد ٹوٹ گیا اور اب انسان، عمومی طور پر فہم شعوری اور خصوصی طور پر فہم حقیقی کو پہچاننے لگا۔

میرے نزدیک فہم کی تین قسمیں:

۱۔ فہم غیر شعوری ۲۔ فہم شعوری

۳۔ فہم حقیقی

فہم غیر شعوری اور فہم شعوری کا اجمالی تذکرہ گزشتہ سطور میں آ چکا ہے۔ اب ہم فہم حقیقی یا مقام انکشاف پر گفتگو کر سکتے ہیں لیکن ہمیں اپنا اصل مقصد یاد رہنا چاہیے۔ ہمارا

Marfat.com

اصل مقصد ہے زیادہ سے زیادہ جہات (Dimentions) کو اپنے تصور میں لانا۔ یہی ارتقاء میں ہمارا اگلا درجہ ہوگا۔ ہم جانتے ہیں کہ کیڑے مکوڑے کائنات اور اس کی ہر چیز کو ایک سیدھی لکیر سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ یکجہتی ہیں۔ جانور اور پرندے دوجہتی ہیں۔ زندگی انسان تک پہنچی تو کائنات کے تین جہات ظاہر ہوگئے۔ اب ہم مزید آگے بڑھنا چاہیں گے تو اسی تناسب سے ہمارے ادراک میں جہات کی تعداد بڑھتی جائے گی۔ یہاں ایک بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ علامہ اقبالؒ کے خطاب کا ترجمہ کرتے ہوئے ''سید نذیر نیازیؒ'' نے Dimetions کے لیے ''ابعاد'' یا ''بعد'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ انہوں نے ایسا اس لیے کیا کیونکہ مسلمان ماہرین ہیئت نے چھ سمتوں کے لیے ''شش جہات'' کی اصطلاح استعمال کی تھی۔ ان سمتوں کے درمیان خط کھینچنے سے تین ابعاد ظاہر ہوتے ہیں۔ ایک اُفقی' دوسرا عمودی اور تیسرا عبوری (سامنے) لیکن میں نے تھری ڈائی مینشنز کے لیے ''سہ جہات'' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس کے ساتھ ''شش جہات'' کو میں نے چھ سمتیں کہہ کر بات سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

اب ہمیں چوتھی سمت کو اپنے تصور میں لانا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ یہ اپنے قلب میں زمانے کا احساس پیدا کر لینے کے بعد ممکن ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ...... ولا تسبو الدھر ...... زمانے کو گالی مت دو (کیونکہ زمانہ خود خدا ہے) جیسا کہ ہم پیچھے دیکھ چکے ہیں کہ زمانہ بعد رابع ہے اور ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ علامہ اقبالؒ زمانے کو مکان کی بعد رابع تسلیم کرنے پر تیار نہیں۔ ایسی صورت میں ہمیں خود اس بات پر غور کرنا ہوگا کہ زمانہ، مکان سے کیا تعلق رکھتا ہے؟ لیکن کسی بھی طرز کے غور و فکر سے پہلے ہمیں جدید سائنس کے انکشافات کو مدنظر رکھنا ہوگا۔

جدید سائنس زمانے کو..... حوادث کا ایک مربوط نظام قرار دیتی ہے..... اور اسی

Marfat.com

بناء پر اسے مکان کا بعد رابع قرار دیتی ہے۔ ہم بہر حال کسی ایک حادثہ کی انگلی پکڑنے پر مجبور ہیں...... یہ الگ بات ہے کہ کوئی ایک حادثہ خود معیارِ مطلق بننے کا اہل ہی نہیں۔ علامہ اقبالؒ زمانے کو اللہ تعالیٰ کی فعالیت قرار دیتے ہیں۔ فطرت کی وہ فعالیت جس کی بدولت یہ زمانہ اور یہ مکان، نقاط و لمحات کا مجموعہ محسوس ہوتے ہیں اور ہم بعدِ رابع کہنے لگتے ہیں۔

بے شک ہم علامہ صاحب کی تقلید میں زمانے کے لیے بعد رابع کا لفظ استعمال نہیں کرتے، لیکن پھر بھی ہم مجبور ہیں کہ زمانے کو ہی ایک احساس کی طرح اپنے قلبی تصور کا حصہ بنائیں۔ قرآن کریم میں اللہ کی یہ شان بیان ہوئی ہے کہ

کل یوم هو فی شان

ہر دن اُس کی نئی شان ہے

ہمیں بھی ہر دن نئی شان کا احساس لے کر آگے بڑھنا ہوگا، تاکہ کل کائنات ہمارے حضور سجدہ ریز ہو جائے۔

ع ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن، نئی شان

چنانچہ یہ وہ چوتھی جہت (فطرت کی فعالیت) ہے جس کا فہم حاصل کرنا ہمارے ارتقاء کا باعث ہوسکتا ہے۔ زمانے کو تصور میں لانا محض فہم شعوری سے ممکن نہیں کیونکہ جو شعور انسان کو دیا گیا وہ سہ جہتی اشکال سے بڑھ کر کسی چیز کو سمجھنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتا۔ یہاں آ کر فہم شعوری کی حد ختم ہو جاتی ہے۔ اب ہمیں صرف فہم حقیقی سے مدد لینی ہوگی۔ ہم چوتھی جہت کو کیسے تصور میں لائیں۔ شعور کی مدد سے ہم، جمع تفریق کر کے اگر زمانے کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو زیادہ سے زیادہ آئین سٹائین کی طرح ریاضی کے کلیوں کا استنتاج کر لیں گے اور زمانے کو بعد رابع کہہ دیں گے۔ لیکن زمانہ کیا ہے،

Marfat.com

سمجھ نہ پائیں گے۔ کیونکہ فہم حقیقی بے منتِ شعور کام کرتا ہے۔ کسی جذبے کا احساس پیدا کرنے کے لیے علم کی کیا ضرورت ہے؟ مثلاً چوٹ لگنے سے اچانک درد ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ یوں کہنا کہ ہمیں درد کا علم حاصل ہوا غلط ہوگا۔ وجہ یہ تھی کہ درد شعور نے محسوس نہیں کیا۔ یہ تو ایک احساس تھا جو بدن پر طاری ہو گیا لیکن یہاں ایک لطیف نقطہ یاد رہے۔ فہم کے درجات میں فہم غیر شعوری سب سے پہلا درجہ تھا۔ یہ اولین مقام بہشت تھا۔ اس مقام پر بچے اور حیوانات فائز ہیں۔ اس مقام پر اگر درد ہوگا تو ہم واضح طور پر دیکھ سکیں گے کہ درد کا ادراک حاصل کرنے کے لیے علم کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ علم تو جذبہء تجسس کو تسکین دیتا ہے لیکن فہم حقیقی کے مقام پر زمانے کو سمجھنے کی مثال دیتے ہوئے...... ہم درد کے احساس کو پیش نہیں کر سکتے۔ کیونکہ فہم حقیقی تک پہنچنے کے لیے پہلے فہم شعوری کے پل صراط پر سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ فہم کا بلند ترین مقام ہے جس میں شعور اور غیر شعوریت کے عناصر باہم مدغم ہو چکے ہیں۔ جس میں فکر اور وجدان باہم پیوست ہو جاتے ہیں۔

فہم حقیقی حاصل کرنے کا مطلب ہے کسی چیز کا علم حاصل ہو جانے کے بعد اُس پر عمل کی اتنی مشق...... اتنی مشق کہ عمل فطرتِ ثانیہ بن جائے۔ کہتے ہیں ''مغل اعظم'' فلم بناتے ہوئے ''پرتھوی راج کپور'' نے شہنشاہِ عالم جلال الدین اکبر کا کردار صحیح طور پر ادا کرنے کے لیے گردن اکڑانے کی اتنی مشق کی...... اتنی مشق کی کہ باقی تمام عمر اداکار پرتھوی راج کپور کی گردن اکڑی رہی۔ ''مغل اعظم'' آٹھ سال تک بنتی رہی تھی۔ آٹھ سال تک شب و روز گردن اکڑائے رکھنے کے بعد...... گردن اکڑائے رکھنا راج کپور کی فطرتِ ثانیہ بن چکی تھی۔

چنانچہ جب ہم علم حاصل ہو جانے کے بعد...... عمل کی مشق کرتے ہیں تو آہستہ

Marfat.com

آہستہ فہم حقیقی کی طرف ہمارا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ بے شک علم، فہم شعوری کے ذریعے حاصل ہوا تھا لیکن فہم حقیقی کی تعمیر میں یا یوں کہیے کہ ماہیت میں شعور کو مطلق دخل نہیں۔ بالکل ویسے ہی جیسے ایک روتے ہوئے بچے کے درد میں شعور کا کوئی حصہ نہیں۔ فہم حقیقی کا تمام تر تعلق احساس کے ساتھ ہے اور احساس جو فہم غیر شعوری کے مقام پر، درد، خوف، غم اور خوشی کی شکل میں اچانک طاری ہو جاتا تھا۔ اب فہم حقیقی کے مقام پر اچانک طاری نہیں ہوگا۔ اگر کسی شخص کو اچانک تجلی نظر آ جائے، اس کا صاف مطلب ہے کہ اُس نے فہم غیر شعوری کی مدد سے اللہ کو دیکھ لیا۔ ایسے تمام صوفیاء اور اولیاء جو جزواً جزواً فہم شعوری کے مراحل سے نہیں گزرے اور انہوں نے اپنے قلب میں اللہ کا احساس دیکھ لیا ہے، بے شک بہت زیادہ مقربین الٰہی ہیں لیکن رتبہ ولایت میں کم۔ ان کے برعکس وہ اولیاء جو فہم شعوری کے پل صراط سے گزر کر فہم حقیقی کے مقام تک پہنچے ہیں۔ درجات میں اتنے بلند ہیں کہ عقل ان کا تصور نہیں کر سکتی۔ فکر کو استعمال میں لائے بغیر محض ذکر بالِلسان یا تصورِ بند چشمی کے ذریعے خدا کو دیکھنے والے اولیاء کو پیدائشی وجدان نے یہ مقام عطا کیا۔ وہ کسی معصوم بچے کی طرح فرشتے تھے اور مشاہدہ کے بعد فرشتے ہو گئے لیکن وہ لوگ جنہیں گومگو کے انتہائی کڑے مراحل پر سے گزرنا پڑا۔ وہ ہے اور وہ نہیں ہے کی کشمکش نے انہیں اک عمر متذبذب رکھا، جو سوچتے تھے فکر کرتے تھے، غور کرتے تھے، تدبر کرتے تھے اور پھر اُن کے تجسس کی تسکین علم کے ذریعے کر دی جاتی تھی لیکن ان کا تجسس پھر بھی کم نہ ہوتا تھا۔ ان کی بھوک بڑھتی ہی چلی جاتی تھی لیکن وہ علم کی وافر غذا پر صبر و قناعت نہ کرتے تھے۔ ھل من مزید ...... ھل من مزید ...... پکارتے رہتے تھے، علم کے پیاسے تھے، علم میں اضافہ کے طلبگار رہتے ...... وہ تجسس کے عادی ہو گئے۔ ان کی قوتِ متخیلہ قوتِ حافظہ اور قوتِ فکر ایک ہی قسم کے کام کو بار بار کرنے لگی۔

Marfat.com

اُن کے پاس وقت کم ہونے لگا۔ وہ اپنے گھر، بیوی بچوں اور کاروبار سے ذہنی طور پر دور ہوتے چلے گئے یا زیادہ اچھے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ دنیاوی مسائل نے انہیں پریشان کرنا چھوڑ دیا۔ کیونکہ اب وہ کاروبار کی کمی یا زیادتی سے پریشان ہونے والے نہ تھے۔ ان کی پریشانی تو ان کی جستجو تھی۔ چنانچہ وہ عادی ہو گئے۔ انہیں نشہ ہو گیا اور ان کی قوتِ متخیلہ خودکار طریقے سے اپنے فرائض سرانجام دینے لگی۔

اس بار بار کی مشق اور بار بار کے تجربے نے ان کی قوتِ فکر کو ایسا خودکار کر دیا کہ اب وہ اپنی مرضی سے یا اپنے دھیان سے کسی شے کی حقیقت کو نہیں سوچتے۔ بلکہ ان کی قوتِ متخیلہ ازخود کسی شے کے تمام پہلوؤں کو یا زیادہ سے زیادہ پہلوؤں کو دیکھ لیتی ہے۔ عمل کا اس قدر زیادہ تسلسل اور تواتر اُن کے قلب میں احساس پیدا کر دیتا ہے۔ اُن کی زندگی دھیرے دھیرے غیر محسوس طریقے سے بدلتی ہوئی خودبخود ایک ایسے قالب میں ڈھل جاتی ہے کہ اب وہ ایک مرتبہ پھر وجدان کے مقام پر پہنچ جاتے ہیں لیکن اب ہم اس مقام کو وجدان کہیں گے تو اس کا رتبہ کم ہو جائے گا۔ اب ہمیں اس مقام کو ''عرفان'' کہنا ہو گا یا پھر ہندی میں ''نروان''۔ لیکن اس مقام پر وجدان میں تعقل کا عنصر شامل ہو چکا ہے۔ شاہد، اپنے احساس کی نگاہ سے جو کچھ دیکھے گا اس کی تمام تر منطق بھی اس پر واضح ہو گی لیکن اُسے یوں لگے گا جیسے کچھ بھی شعوری طور پر وقوع پذیر نہیں ہوا جو کچھ ہوا غیر شعوری اور وجدانی طور پر ہی ہوا۔ یہ ہے عرفان، فہم حقیقی یا مقامِ انکشاف۔

مشاہدہ ہے کس حساب میں

دنیائے اُردو کے سب سے بڑے شاعر ''مرزا اسد اللہ خان غالبؔ'' کا یہ شعر بہت مشہور ہے۔

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

اس شعر میں غالب نے پوری طرح سے وحدت الوجود کا پرچار کیا ہے اور اپنی طرف سے تمام علمائے سائنس کو ہی نہیں بلکہ ہر عقلیت پسند کو یہ سوال کر کے الجھانے کی کوشش کی ہے...... کہ جب شاہد (دیکھنے والا)...... مشہود (جسے دیکھا جائے) اور شہود (اظہار)...... ایک ہی چیز ہیں، تو پھر مشاہدہ کیا چیز ہے؟ بے شک غالبؔ بہت بلند پایہ شاعر ہیں اور اس شعر پر بھی انہیں داد ملنی چاہیے کہ انہوں نے اس قدر مشکل اور وسیع موضوع کو بڑے ''بے پناہ انداز'' میں محض ایک شعر کے اندر سمو دیا ہے۔ وہ بات جسے لکھنے کے لیے ایک لکھاری کو صفحات کے صفحات تحریر کرنے پڑتے ہیں، غالب نے یوں چٹکی بجاتے ہوئے کہہ دی کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ موجودہ زمانے تک وحدت الوجود کا نظریہ اپنی اُسی شکل و صورت میں قائم ہے جو تین ہزار سال پہلے ''پارسا گرد'' میں تھی یا ''ایتھنز'' میں۔ عجیب بات ہے کہ وہ نظریہ جس کا نام وحدت الوجود ہے جب نتائج مرتب کرتا ہے تو ہمیشہ ثنویت پر منتج ہوتے ہیں۔ قدیم ہندی مذاہب انسان کی روح کو ''آتما'' اور خدا کو ''پرماتما'' کہتے تھے۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ آتما، مکت ہونے کے بعد پرماتما سے جا ملتی ہے۔ آج بھی ہندوؤں کا یہی عقیدہ ہے۔

Marfat.com

یہ پرانے زمانے کا وحدت الوجود ہے جسے عام زبان میں ویدانت کہتے ہیں لیکن جب یہ عقیدہ نتائج مرتب کرتا ہے تو خدا کو ثنویت کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔ آتما مکت ہونے سے پہلے انسانی بدن میں قید ہوتی ہے اور بدن شریر ہے۔ جو روح کے متخالف اور متضاد ہے۔ یہاں سے وحدت الوجود کا عنصر یک لخت ثنویت میں بدل جاتا ہے۔

یونان کے افلاطونی نظریات میں بھی یہی خامی ہے۔ کائنات اور مظاہر فطرت کو عالم غیر حقیقی قرار دینا اور عالم امثال کو حقیقی قرار دینا، افلاطونیت کا مرکزی نقطہ ہے۔ یہاں بھی ثنویت یعنی دوئی کا نظریہ چیخ چیخ کر اپنے ہونے کا یقین دلا رہا ہے۔ دراصل نظریۂ وحدت الوجود کا یہ خاصا ہے کہ وہ خدا کے وجود سے الگ کسی چیز کو دیکھ ہی نہیں سکتا۔ اُس کے لیے کائنات کا ذرہ ذرہ خدا ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مظاہر فطرت اور مادی دنیا انہیں محض ایک واہمہ اور فریب دکھائی دیتی ہے۔ چنانچہ وحدت الوجود کے ماننے والے بڑی شدت کے ساتھ عالم مادی کے ''ہونے'' کو مسترد کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک کائنات میں جو کچھ ہے وہ سب خدا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل وحدت الوجود ''ہمہ اوست'' کا نعرہ بلند کرتے ہیں لیکن ایسا ممکن ہی نہیں کہ اس نظریہ کو اپنایا جائے اور ثنویت یا دوئی سے بچا جا سکے۔ آنکھوں کے سامنے موجود کائنات کا یکسر انکار دراصل ثنویت کا اقرار ہے۔ البتہ دلچسپ بات یہ ہے کہ فلسفہ ہو یا تصوف ہر مسافر کو زندگی میں ایک مرتبہ وحدت الوجود کی منزل سے گزرنا پڑتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں فرمایا:

''پھر جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ فلسفۂ یونان کی حیثیت تاریخ اسلام میں ایک زبردست ثقافتی قوت کی رہی ہے لیکن جب ہم علم کلام کے ان مختلف مذاہب پر نظر ڈالتے ہیں جن کا ظہور فلسفۂ

یونان کے زیر اثر ہوا اور اُن کا مقابلہ قرآن پاک سے کرتے ہیں تو یہ اہم حقیقت ہمارے سامنے آ جاتی ہے کہ یونانی فلسفہ نے منکرین اسلام کے مطمح نظر میں اگرچہ بہت زیادہ وسعت پیدا کر دی تھی مگر بحیثیتِ مجموعی قرآنِ مجید میں اُن کی بصیرت محدود ہو کر رہ گئی۔ سقراط کی توجہ صرف عالم انسانی پر تھی۔ اس کے نزدیک مطالعے کا بہترین موضوع انسان ہی ہو سکتا ہے نہ کہ نباتات اور حشرات یا ستاروں کی دنیا۔ مگر اس سے کس قدر مختلف ہیں قرآن پاک کی تعلیمات جس کا ارشاد ہے کہ شہد کی مکھی ایسی حقیر شے بھی وحیٔ الٰہی سے بہرہ ہوئی اور جس نے بار بار اس اَمر کی دعوت دی کہ ہواؤں کے مسلسل تغیر و تبدل کا مشاہدہ کیا جائے۔ نیز دن رات کے اختلاف، تاروں بھرے آسمان اور بادلوں کا (بھی) مشاہدہ کیا جائے جو فضائے لامحدود میں تیرتے پھرتے ہیں۔ سقراط کے شاگردِ رشید افلاطون کو بھی ادراک بالحواس سے نفرت ہی رہی۔ اس کا خیال تھا کہ ادراک بالحواس سے کوئی حقیقی علم تو حاصل نہیں ہوتا ہم اس کی بناء پر ایک رائے قائم کر سکتے ہیں۔ برعکس اس کے قرآنِ مجید نے سمع و بصر کا شمار اللہ تعالیٰ کے گراں قدر انعامات میں کیا ہے اور عند اللہ اپنے اعمال و افعال کا جوابدہ ٹھہرایا۔ یہ حقیقت تھی جسے شروع شروع کے مسلمانوں نے قرآنِ مجید کے مطالعہ میں یونانی ظن و تخمین سے مسحور ہو کر نظر انداز کر دیا۔''

غالب کا یہ سوال کہ...... مشاہدہ ہے کس حساب میں؟...... اُسی قدیم یونانی فلسفہ کی طرف اشارہ کرتا ہے لیکن غالب کے اندازِ بیان میں ایک خوبی ہے۔ شعر کے لب ولہجہ سے یوں لگتا ہے جیسے غالب نے اسے تنقید کی نظر سے دیکھا۔ اگر غالب کی دوسری شاعری نظریۂ وحدت الوجود پر مبنی نہ ہوتی تو اس شعر کو ہم سچ مچ تنقید ہی شمار کرتے لیکن اب ہمیں تسلی ہے کہ سوال کرتے وقت غالب کے پیش نظر تنقید نہ تھی۔ غالب کی طرح...... اصل شہود وشاہد ومشہود...... کو ایک کہنے والے وحدت الوجود کے قائلین کے سامنے قرآن حکیم کی وہ آیت پیش کی جانی چاہیے جس میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو شاہد کہہ کر پکارا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم شاہد ہیں۔ ظاہر ہے آپؐ شاہد ہیں تو یقیناً کوئی مشہود بھی ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کے ننانوے ناموں میں سے ''المشہود'' بھی ایک نام ہے۔ اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم شاہد ہیں تو یقیناً آپ مشاہدہ بھی کرتے ہوں گے۔ چنانچہ یوں کہنا کہ ''مشاہدہ ہے کس حساب میں''...... درست نہیں۔

مشاہدہ کس حساب میں ہے؟...... اپنی اہمیت کے لحاظ سے یہ سوال ابھی تک اپنی جگہ پہ قائم ہے۔ مشاہدہ بھی فی الحقیقت علم الہیت کا موضوع ہے۔ ہم اپنی درسی کتابوں میں علم الہیت کو علم مکان، جیومیٹری، ٹرگنومیٹری یا علم فلکیات کی شکل میں دیکھتے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ مکان کا علم ہے۔ انسان نے جب سے ہوش سنبھالا یہ مختلف پہلو بدل بدل کر اپنے سامنے پھیلے ہوئے مکان کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ماسوائے اسلام کے دنیا کا ہر مذہب سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں سال سے مکان کو جھٹلاتا آیا ہے۔ یہ صرف قرآن حکیم ہے جس نے مکان کو...... وما خلقت ھٰذا باطل...... کہہ کر پکارا ہے۔ موجودہ دور تک مغرب کے بیسیوں مفکرین اپنے آباؤ اجداد کے قدیمی نظریۂ مکان کو

Marfat.com

شمشیر حقیقت کی ضرب سے بچانے کے لیے برسرِ پیکار ہیں۔ اُن کا قدیم نظریہ مکان یہی تھا کہ جو کچھ ہمیں نظر آتا ہے یہ باطل ہے۔ اور پھر اگر کسی نے اس کے خلاف بغاوت کی تو وہ مکان کو مطلق کہنے لگ گیا، جیسے نیوٹن۔ ظاہر ہے اس نظریہ کا لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا ہے۔ حقیقت مشہودات سے ماوراء ہے۔ حتیٰ کہ بیسویں صدی کے عظیم سائنسدان ''آئین سٹائن'' نے بھی نظریہء اضافیت پیش کرنے کے بعد قریب قریب یہی موقف اختیار کر لیا کہ یہ کائنات محض ایک فریب ہے۔ افسوس اسی بات کا ہے کہ کائنات کے مطالعہ میں مشرق و مغرب نے قرآن کے منفرد اندازِ تحقیق کو نظرانداز کر رکھا ہے۔ اگر آئین سٹائن افلاطونی آ. کٹوپس سے خوفزدہ نہ ہوتا تو آج دنیا کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔ یہاں ہمیں آئین سٹائن کا نظریۂ وحدت الوجود پیش کرنا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں آئین سٹائن کا نظریہ مکان اس طرح پیش کیا ہے:

> ''آئین سٹائن کے نزدیک مکان کا وجود اگرچہ حقیقی ہے لیکن ناظر کے لیے اضافی۔ وہ نیوٹن کا نظریۂ مکانِ مطلق تسلیم نہیں کرتا۔ اس لیے کہ ہم جس شے کا بھی مشاہدہ کریں گے اس میں تغیر و تبدل ممکن ہے۔ کیونکہ اس کا وجود ناظر کے لیے اضافی ہوگا۔ لہٰذا جوں جوں ناظر اپنے عمل اور رفتار میں تغیر و تبدیل کرتا چلا جائے گا۔ اس کی کمیت، شکل اور جسامت میں بھی تغیر و تبدل ہوتا جائے گا۔ بعینہٖ حرکت اور سکون کا وجود بھی اضافی ہے۔ اس لیے قدیم طبیعیات کا یہ عقیدہ کہ مادہ کوئی قائم بالذات شے ہے، صحیح نہیں لیکن یہاں ایک غلط فہمی کا احتمال ہے۔ اوپر کی عبارت سے جہاں مشاہدۂ فطرت کے سلسلے میں ناظر کا لفظ استعمال کیا گیا

Marfat.com

ہے ولڈن کار (Wildon carr) نے غلطی سے نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اضافیت کی انتہا بھی بالآخر حی و قدرک افراد کے اثبات پر ہوئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نظریۂ اضافیت کی رو سے مظاہر فطرت کی شکلوں، جسامتوں اور رفتاروں کو مطلق ٹھہرانا غلطی ہے۔ مگر جیسا کہ پروفیسر نن (nunn) نے بجا طور پر لکھا ہے...... اس کا یہ مطلب نہیں کہ زمانی، مکانی قالب کا انحصار ناظر کے ذہن پر ہے۔ اس کا انحصار کائنات کے اُس نقطے پر ہے جس سے ناظر کا جسم وابستہ ہے اور اس لیے ہم چاہیں تو ناظر کی بجائے کوئی تصویر گیر آلہ بھی استعمال کر سکتے ہیں۔"

آئین سٹائن ایک ریاضی دان تھا۔ علم الھیت میں اُسے دستگاہ حاصل تھی۔ اس نے ایک نئی طرز کا نظریۂ وحدت الوجود پیش کیا جس میں مکان کو ایک حقیقت تسلیم کرتے ہوئے بہر حال باطل قرار دیا گیا۔ اس کا انحصار ناظر یا تصویر گیر آلے پر ٹھہرا اور یوں مکان ایک مرتبہ پھر اضافی قرار دے دیا گیا۔ نظریۂ اضافیت کی رو سے زمانے کو مکان کی ہی ایک بُعد تسلیم کر کے زمانے کی تخلیقی فعالیت کو نظر انداز کر دیا گیا۔ علامہ اقبالؒ اگرچہ آئین سٹائن کے اکتشافات سے بہت خوش ہیں اور اس کے بارے میں اپنی رائے کا کھل کر اظہار کرتے ہیں لیکن انہیں پریشانی لاحق ہے تو اس بات کی کہ اس طرح پھر سے انسانی معاشرے پر وہی افلاطونی جمود چھا جانے کا اندیشہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"بہ ایں ہمہ فلسفیانہ اعتبار سے دیکھا جائے تو اس نظریے کی دو خوبیاں ہیں۔ ایک تو یہ کہ نظریہء اضافیت نے نفی کی ہے...... تو

اس خیال کی جس کے ماتحت قدیم طبیعات کو مادیت کا قائل ہونا پڑا اور جس کی رو سے جوہر کی حیثیت وقوع فی المکان سے زیادہ نہیں رہتی۔ فطرت کے وجود خارجی سے بہر حال اس نے انکار نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ جدید طبیعات میں جوہر کی تعریف اس طرح کی جاتی ہے کہ یہ باہم دگر مربوط حوادث کا ایک نظام ہے، شے نہیں کہ اپنی بدلتی ہوئی حالتوں کے ساتھ زمانے میں استمرار کرے۔ چنانچہ وائیٹ ہیڈ (White Head) نے یہ نظریہ جن الفاظ میں پیش کیا اُن میں مادے کا تصور وجودِ نامی کے تصور سے بدل گیا۔ نظریۂ اضافیت کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اس کی رو سے مکان کا دارومدار مادے پر ہے۔ لہٰذا آئین سٹائن کے نزدیک کائنات کا یہ تصور درست نہیں کہ اس کی مثال ایک ایسے جزیرے کی ہے جو مکان لامتناہی میں واقع ہے۔ اس لیے کہ مکان بجائے خود متناہی ہے گو غیر محدود۔ لہٰذا اس کے ماوراء مکانِ محض کا کوئی وجود ہی نہیں۔ گویا دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اگر مادے کا وجود نہ ہوتا تو کائنات بھی سمٹ کر ایک نقطے پر آ جاتی۔ بایں ہمہ جب میں اس نقطے کا خیال کرتا ہوں جو ان خطبات میں ہمارے پیش نظر ہے تو آئین سٹائن کی اضافیت سے ایک زبردست مشکل رونما ہوتی ہے اور وہ یہ کہ اگر اس کا نظریہ صحیح طور پر تسلیم کر لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ زمانے کا وجود بھی غیر حقیقی ہے۔ کیونکہ جس نظریے کی رو سے زمانے کی حیثیت

Marfat.com

بعد رابع سے زیادہ نہیں اُس سے یہ ماننا لازم آئے گا کہ ماضی کی طرح مستقبل کا وجود بھی پہلے سے قائم ہے اور اس لیے متعین۔ لہٰذا زمانہ کوئی آزاد تخلیقی حرکت نہیں۔ وہ مرور نہیں کرتا نہ حوادث رونما ہوتے ہیں۔ ہم صرف اُن سے دوچار ہوتے ہیں۔''

تصریحاتِ بالا اگرچہ مشاہدۂ فطرت اور مشاہدۂ حق سے متعلق ہیں لیکن ابھی بھی مشکل ہے۔ ہم اسے اپنی ذہنی سطح پر بھی سمجھنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ ہم زمین پر بسنے والے انسانوں کے ماضی پر ایک نظر ڈالیں تو ہمیں بہت سی باتیں سمجھ میں آتی ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ انسان ہمیشہ سے جنگ وجدال اور دنگا کرتا آیا ہے۔ دوسری یہ کہ انسان نے ذہنی طور پر بے پناہ ترقی، ڈھائی ہزار سال پہلے ہی حاصل کر لی تھی لیکن اُس نے اپنی تمام تر فکری کاوشوں سے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ یہ کائنات باطل ہے چنانچہ اس سے منہ موڑ لینا ہی بہتر ہے۔ پھر ہمیں چھٹی صدی عیسوی میں ایک نئی فکر دکھائی دیتی ہے جس نے اپنی الہامی قوت کے زور پر قدیم افلاطونی نظریات کا مقابلہ کیا اور مشاہدۂ فطرت کو مشاہدۂ حق قرار دیتے ہوئے انسان کی تخلیقی فعالیت کو زندہ کر دیا۔ پھر تاریخ میں ہمیں یہ دکھائی دیتا ہے کہ آغازِ اسلام کے ساتھ ہی مسلمانوں نے یورپ کی طرف پیش قدمی شروع کر دی تھی اور بہت جلد پورا مغرب ان کے قدموں تلے تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ قرآنی نظریات بھی یورپ منتقل ہو گئے اور پھر پندرہویں صدی عیسوی کے وسط میں یکایک سوئے ہوئے یورپ نے آنکھیں کھول دیں۔ پھر ہمیں دکھائی دیتا ہے کہ یورپ نے اپنے افلاطونی نظریات پر قائم رہتے ہوئے اسلام سے فائدہ اٹھایا۔ علامہ صاحبؒ نے اپنے خطبات میں بڑی وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ دوئی یا ثنویت کا نظریہ...... اثرات بھی دو ہی طرح کے مرتب کرتا ہے یا تو پرماتما کی محبت میں دنیا ترک کر دینے کا رجحان غلبہ پاتا ہے اور معاشرے کے تمام افراد بیکاری اور کاہلی کا شکار ہو کر خوار و زبوں حال ہو جاتے ہیں اور یا یوں ہوتا ہے کہ اس کائنات یعنی ''مایہ'' کو ایک

Marfat.com

عظیم الہیت بت بنا کر اپنے سامنے کھڑا کر لیا جاتا ہے اور تمام افراد مادیت پسندی میں سرتا سر غرق ہو جاتے ہیں جیسا کہ یورپ کے ساتھ ہوا۔ وحدت الوجود کا نظریہ بھی اسی طرح کے نتائج کا حامل ہے۔ جس میں اُسی تقدیر پرستی کا رجحان بدرجہ اتم پایا جاتا ہے جو ہمیشہ سے افلاطونی فکر کا خاصا رہی۔ آئین سٹائن کے نظریہ سے وحدت الوجود کو تقویت ملی۔ زمان و مکاں کو ایک ہی علت کا معلول قرار دے دیا گیا اور انسان کو مجبور محض تسلیم کر لیا گیا۔ حالانکہ ایک چھوٹی سی بات تھی جس کی جانب کسی کی توجہ نہ گئی اور جس پر سے ''مولانا جلال الدین رومیؒ'' اور پھر علامہ اقبالؒ نے پردہ ہٹایا اور وہ یہ تھی کہ وحدت اپنا اظہار کثرت میں کرتی ہے۔ وہ خود کو اپنی حقیقی شکل کے ساتھ اپنے سامنے مشہود دیکھ کر خوش ہوتی ہے اور اسی بات کا لطف لیتی ہے کہ کثرت میں اس کا اظہار ہر ہر سطح پر کس طرح انفرادی ہوتا ہے۔ کیا آپ بہ یک وقت اپنے دونوں ہاتھ کسی الگ الگ کام میں استعمال کر سکتے ہیں؟...... اتنی بڑی بات کو سمجھانے کے لیے شاید یہ مثال عامیانہ سی ہو لیکن ہے بہت آسان۔

کیا آپ اپنے دونوں ہاتھ اپنی مرضی سے دو الگ الگ کاموں میں استعمال کر سکتے ہیں؟ مثلاً ایک ہاتھ سے آپ کھانا کھائیں اور دوسرے ہاتھ سے میز بجائیں۔ اگر آپ اس طرح کر سکتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ آپ ایک انسان ہوتے ہوئے دو الگ الگ اختیارات کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ یہ جان کر یقیناً آپ کو خوشی ہو گی۔ حقیقت سرمدیہ کی بھی یہی آرزو ہے کہ وہ کثرت میں اپنا یوں اظہار کرے کہ کثرت کے ہر فرد میں اپنے الگ الگ اختیارات کا مظاہرہ دیکھے۔ علامہ صاحبؒ کا یہ مصرع اسی بات کی وضاحت کرتا ہے۔

ع ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ

یہ سادہ سی بات جسے گزشتہ ڈیڑھ ہزار سال سے قرآن حکیم سمجھانے کی کوشش کر رہا ہے ابھی تک انسانوں کی سمجھ میں نہیں آئی اور وہ ابھی تک اسی قدیم خیال پر قائم ہیں

کہ کائنات کی ہر چیز خود خدا ہے۔ چنانچہ اُن کے نزدیک اعمال انسانی کی اہمیت صفر ہو کر رہ جاتی ہے اور پھر اس طرح کی تقدیر پرستی کہ اچھا عمل ہو یا برا...... جو کچھ کرتا ہے خدا کرتا ہے...... ابھی تک اپنے پورے وزن کے ساتھ قائم ہے۔ حیرت ہے کہ انسان نے جب بھی کوئی نئی بات سیکھی تو اُسی کو حرفِ آخر مان لیا۔ حالانکہ مشاہدۂ فطرت تو منزلِ انسانی کے راستے میں محض ایک سنگِ میل تھا۔ آپ خود سوچیے! اشیائے کائنات کا مشاہدہ بالآخر کہاں تک کیا جا سکتا ہے۔ سائنسدان کہتے ہیں کہ پوری کائنات 10^{80} ایٹموں سے مل کر بنی ہے۔ اتنا مختصر مادہ جسے لکھنے کے لیے ایک لفظ جتنی جگہ درکار تھی اور جو کسی بھی وقت فنا ہو سکتا ہے ہمارے مشاہدے کا موضوعِ اصلی کیونکر ہو سکتا ہے۔ یہ تو ایک تھری ڈائمینشنل (3 Dimentional) ہستی کو مشاہدۂ حق کی مشق کروانے کا ایک ذریعہ تھا۔ ہم کبھی ون ڈائمینشنل (1 Dimentional) تھے۔ پھر ہم نے ارتقاء کیا اور اپنے آس پاس موجود دنیا کو پہلے سے زیادہ محسوس کرنے لگے۔ تب ہم ٹو ڈائمینشنل (2 Dimentional) ہو گئے۔ اس کے بعد پھر ہم نے ارتقاء کیا اور اشیاء کا سہ جہتی ادراک ہماری سمجھ میں آ گیا۔ اور ہم تھری ڈائمینشنل ہستیاں بن گئے۔ یہ کیا تھا؟ یہ زمانے کی تخلیق فعالیت تھی خدا اپنے اختیار کو بااختیاروں کے حوالے کر کے اپنے اختیار کے کھرب ہا مظاہرے دیکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مومن تقدیر کا پابند ہو، مومن تو خود زمانہ ہے، ہر لحظہ اُس کی شان بدلتی ہے اور وہ ایک تخلیقی فعالیت بن کر ایک نہ ختم ہونے والی زندگی جیتا ہے۔

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

Marfat.com

کیا ہیت ہی خدا ہے؟

وحدت الوجود والوں کو اکثر یہ کہتے سنا ہے:

جہاں میں آ کے ادھر ادھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

اشیائے مادی کی صورتوں کی وہ شبیہ جو ہماری آنکھ کے عدسے کی مدد سے ہماری آنکھ کے پردے پر بنتی ہے...... کیا حقیقت رکھتی ہے؟ ہم چیزوں کا حجم اور شکل وہیت دیکھتے ہیں تو اپنی آنکھ کے عدسے (lens) کی مدد سے۔ بالکل اُسی طرح جس طرح کیمرے میں لینز ہوتا ہے۔ تصویر کھینچنے والا کیمرا بالکل آنکھ کی طرز پر بنایا جاتا ہے۔ کیمرے میں عدسے پر پڑنے والی روشنی کی شعاعیں کیمرے کے اندر لگی فوٹوگرافک پلیٹ پر پڑتی ہیں جہاں وہ اصل چیز کی الٹی شبیہ بناتی ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ محدب عدسے الٹی شبیہیں بناتے ہیں۔ صدیوں پہلے مسلمان طبیعات دان ابن الہیثم نے انعکاسِ نور (The reflection of light) اور انعطافِ نور (The refrection of light) کے ایسے اٹل قوانین دریافت کر لیے تھے کہ جنہیں آج تک...... جدید طبیعات جوں کا توں مانتی چلی آ رہی ہے۔

''روشنی کسی واسطے میں داخل ہو کر اپنا راستہ بدل لیتی ہے۔''

پانی کی بالٹی میں ڈبوئی گئی چھڑی ہمیں ٹیڑھی کیوں دکھائی دیتی ہے کیونکہ روشنی ایک واسطے سے دوسرے واسطے میں داخل ہوتے ہوئے اپنا راستہ بدل لیتی ہے۔ روشنی کی شعاع ہر قسم کے واسطے میں داخل ہو کر اپنی سمت بدل لیتی ہیں۔ ہوا ایک لطیف

Marfat.com

واسطہ ہے اور پانی ایک کثیف واسطہ۔ ہوا میں سفر کرتی ہوئی روشنی کی شعاعیں جب پانی کی سطح سے ٹکراتی ہیں تو پانی میں داخل ہوتے ہی وہ اپنا راستہ بدل لیتی ہیں۔ اس لیے چھڑی ہمیں ٹیڑھی دکھائی دیتی ہے۔ شفاف شیشہ بھی ایک واسطہ ہی ہے شاید پانی سے ملتا جلتا۔ ہوا سے گزر کر جانے والی روشنی کی شعاعیں جب شفاف جسم میں داخل ہوتی ہیں تو اپنا راستہ بدل لیتی ہیں۔ لینز ایک شیشہ ہی ہے جسے مخصوص مقاصد کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ ایک عینک بنانے والا (چشمہ ساز) اپنی گرائنڈنگ مشین کی سان پر ایک سیدھے شیشے کو مختلف مقامات سے پتلا یا موٹا کر کے اپنا مطلوبہ لینز تیار کرتا ہے۔ ہماری آنکھ میں بھی لینز ہے۔ صرف ایک رگڑا ہوا شیشہ...... یا یوں سمجھ لیجیے کہ پانی کی ایک بوند۔ پانی کی ایک بوند ایک اچھا لینز ہے۔ بالکل شفاف، اتنی شفاف کہ شاید ہی کوئی کاریگر اتنی صفائی کے ساتھ شیشہ تراش سکے۔ سورج کی روشنی اشیاء پر پڑتی ہے اور اشیاء سے ٹکرانے کے بعد سورج کی شعاعیں، چیز کی سطح کے لحاظ سے چہار اطراف منعکس ہوتی ہیں۔ اگر قریب ہی کوئی لینز رکھا ہو تو وہ شعاعیں اس لینز پر بھی جا پڑتی ہیں۔ اب لینز میں سے گزر کر دوسری طرف منعکس ہونے والی شعاعیں اُسی چیز کی الٹی شبیہ بناتی ہیں۔ کیونکہ شئے مذکور کی جسمانی سطح مختلف ہوتی ہے۔ اس لیے شعاعیں بھی اُسی ترتیب سے لینز میں سے گزرتی ہیں۔ ہم اس چیز کو دیکھنے کے لیے آنکھ استعمال کریں یا کیمرا نتیجہ ایک جیسا ہی برآمد ہوگا۔ ہماری آنکھ کے عدسے کے عقب میں ایک نامیاتی فوٹوگرافک پلیٹ نصب ہے جس پر چیز کی شبیہ بنتی ہے اور ہماری بصارت کے حسی خلیے اُس کی خبر ہمارے دماغ تک پہنچاتے ہیں۔ ہماری آنکھ میں موجود لینز عام شیشے کی طرح سخت (Hard) نہیں ہے۔ یہ نرم اور لچکدار ہے۔ کسی شفاف موم کی طرح جسے جیسا چاہو پچکا کر موڑ لو۔ ہماری آنکھ کے لینز کے سامنے کیمرے کے شٹر کی

Marfat.com

طرح آنکھ کی پتلی کا شٹر ہوتا ہے۔ جب ہم ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دور دیکھتے ہیں تو آنکھ کی پتلی کا شٹر دوربین کی نالی جیسا لمبا ہو کر ہمیں دور کی چیز دیکھنے میں مدد دیتا ہے۔ ساتھ کے ساتھ ہمارا لینز بھی مطلوبہ حرکت کرتا ہے۔

کیا ہمیں دکھائی دینے والی اشیاء کی وہی شکل جو ہماری آنکھ دیکھتی ہے حقیقی ہے؟ یہ سمجھنے کے لیے ہمیں پہلے یہ جاننا ہوگا کہ سورج سے آنے والی روشنی کی شعاع اپنی ماہیت میں کیا ہے۔ ہم شعاعِ نور کا تفصیلی ذکر ''تصوف اور جدید طبیعات'' کی سرخی کے تحت کریں گے۔

دکھائی دینے والی روشنی، روشنی کے سپیکٹرم کا ساتواں حصہ ہے۔ جو اپنے مخصوص طولِ موج کی وجہ سے لینز کے لیے مناسب ہے۔ مندرجہ بالا طیف میں دوسری طرح کی لہریں بھی ہیں۔ مثلاً انفرا ریڈ یا لاسلکی وغیرہ۔ ان سب کا طولِ موج الگ الگ ہے۔ ہماری آنکھ کا لینز صرف ایک قسم کے طولِ موج کے لیے مناسب ہے۔ ہمیں انفرا ریڈ شعاعیں دکھائی نہیں دیتیں لیکن ہم انہیں استعمال کر سکتے ہیں۔ ہمارے مائیکرو ویو، اوون میں رکھے ہوئے سموسے اس طرح کی نہ نظر آنے والی شعاعوں کی بدولت ہی گرم ہوتے ہیں۔ ہمارے ٹی وی کا ریموٹ کنٹرول بھی اس طرح کی نہ نظر آنے والی شعاعوں کی بدولت کام کرتا ہے۔ بعض ایسی شعاعیں بھی ہیں جو کثیف واسطوں سے بھی گزر جاتی ہیں حالانکہ روشنی کی عام شعاع دیوار سے پار دوسرے کمرے تک نہیں جا سکتی لیکن جب ہم چائے کی پیالی مائیکرو ویو اوون میں رکھتے ہیں تو اُس کی مائیکرو ویوز پیالی کی جسامت کو پار کر جاتی ہیں۔ ایک اور قسم کی شعاعیں جو نیوٹرونو پر مشتمل ہیں وہ ہر قسم کی سطح سے پار ہو جاتی ہیں۔ ہماری آنکھ کا لینز تو انعکاسِ نور کے ان قوانین کے مطابق کام کرتا ہے جو دکھائی دینے والی شعاعوں پر مشتمل ہیں۔ کیا کوئی ایسا لینز ہماری آنکھ

میں فٹ کیا جا سکتا ہے جو کسی اور طرح کی شعاعوں کے لیے مناسب ہو۔ یقیناً ایسا کیا جا سکتا ہے۔ ایسے چشمے عام ملتے ہیں جو بعض مہین چیزوں کے پار دیکھ سکتے ہیں۔ رات کی تاریکی میں تصویر بنانے والا کیمرا بھی ایسی ہی ایک چیز ہے۔ اگر ہماری آنکھ وزیبل لائیٹ (Visible light) کی بجائے انفراریڈ شعاعوں کے لیے بنائی گئی ہوتی تو ہم پتلی پتلی دیواروں کے پار بھی دیکھ لیتے۔ ثابت ہوا کہ اشیاء کی ظاہری صورت جو ہماری آنکھ ہمیں دکھاتی ہے، روشنی کی شعاع کے ایک مخصوص طولِ موج کا نتیجہ ہے۔ اگر ہماری آنکھ کسی اور لہر کے لیے بنائی گئی ہوتی تو ہمیں دکھائی دینے والی اشیاء کی ماہیت بھی کچھ اور ہوتی۔ شاید ہم بعض چیزوں کو اندر سے بھی دیکھ لیتے۔ گویا دکھائی دینے والی اشیاء اپنی ہیت کے اعتبار سے حقیقی نہیں ہیں اور یہ بات سائنس کی ہے۔

ہم نے شعاعِ نور کی مدد سے اشیاء کی ماہیت کو جانچا لیکن ابھی تھوڑی سی بات باقی ہے۔ روشنی کے طیف کا وہ ساتواں حصہ جسے ہم دکھائی دینے والی لہر کہتے ہیں خود مزید سات حصوں پر مشتمل ہے۔ یہ لہر دراصل سات رنگوں پر مشتمل ہے۔ وہی سات رنگ، جو قوسِ قزح میں ہمیں دکھائی دیتے ہیں۔ بارش کے بعد جب بعض بہت ننھی بوندیں ہوا کے دوش پر تیرنے لگتی ہیں تو برشگال بن جاتی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے منشور جن میں سورج کی شعاعیں داخل ہوتی ہیں اور سات رنگوں میں نشر ہو جاتی ہیں تب ہمیں دھنک دکھائی دیتی ہے۔ سائنس کہتی ہے کہ اشیائے مادی کے رنگوں کی کوئی حقیقت نہیں۔ قرآن نے تو بار بار کہا تھا کہ رنگوں پر غور کرو لیکن ہم نے غور نہیں کیا اور مغربی سائنسدانوں نے غور کیا تو انہیں پتا چل گیا کہ ہر چیز کا دکھائی دینے والا رنگ حقیقت میں ہوتا ہی نہیں ہے۔ دراصل یہ اُس چیز میں موجود مادے کی خاصیت ہوتی ہے کہ وہ روشنی کی شعاع کے سات رنگوں میں سے بعض کو جذب کر لیتا ہے بعض کو منعکس۔ اگر

Marfat.com

کوئی مادہ روشنی کی شعاع کے ساتوں رنگ جذب کر لے تو وہ چیز کالی ہوتی ہے اور اگر ساتوں رنگ منعکس کر دے تو وہ چیز سفید ہوتی ہے لیکن اگر کچھ رنگ جذب کر لے اور کچھ منعکس کر دے تو وہ چیز اُسی لحاظ سے یعنی منعکس ہونے والے رنگوں کے امتزاج سے رنگدار کہلاتی رہے۔ مثلاً سبز، نیلی، پیلی، جامنی، نارنجی وغیرہ۔ ثابت یہ ہوا کہ اشیاء دیکھنے والے کے لیے سرتاسر غیر حقیقی ہوتی ہیں۔ محض روشنی کا ایک کرشمہ لیکن کیا اشیاء سچ مچ غیر حقیقی ہوتی ہیں۔ اس کے لیے ہمیں آئن سٹائن کی تعریف دیکھنی ہوگی۔ نظریۂ اضافیت یہ ہے کہ......

''یہ کائنات حقیقی ہے لیکن ناظر کے لیے اضافی''

اس کی مزید تفصیل ہم آگے دیکھیں گے...... گویا جدید سائنس بلکہ جدید طبیعات جو اس وقت علوم حاضرہ پر حکمرانی کر رہی ہے یہ تسلیم کرتی ہے کہ اشیاء مادی کا جو وجود ہمیں دکھائی دیتا ہے وہ حقیقی نہیں۔

اب ہم اشیائے مادی کی ظاہری شکل وصورت کو ایک اور پہلو سے دیکھتے ہیں۔ غالباً وحدت الوجود والوں نے بھی اشیائے مادی کا تصور اسی پہلو سے کیا تھا۔ یہ ہے اُن کی ہیت ظاہری کا پہلو۔ اہل وحدۃ الوجود کے نزدیک موم تو موم ہے چاہو تو اُسے موڑ کر شمع بنا لو، چاہو تو کسی اور چیز کا مجسمہ۔ مثلاً موم کو پچکا اور دبا کر ہم گھوڑا بنا لیتے ہیں۔ ہم اُس سے پرندہ یا کوئی برتن بھی بنا سکتے ہیں لیکن سب شکلوں میں موم کا وجود مشترک رہے گا۔ گویا موم ہر شکل کے وجود کا اصل ہے۔ بعینہ اسی طرح اشیائے مادی کی شکل و صورت بنیادی طور پر ایک ہی وجود کا حصہ ہے۔ وحدت الوجود والے کہتے ہیں کہ وہی خدا ہے جس طرح ہم موم کے بنائے ہوئے کھلونوں کو توڑ کر محض موم ہی حاصل کریں گے۔ اسی طرح اشیاء مادی کے ٹوٹنے پر خالص خدا ہی باقی بچ جاتا ہے۔ چنانچہ ہر

Marfat.com

چیز چاہے وہ انسان ہی کیوں نہ ہو، خدا کے وجود کا غیر منفصل حصہ ہے اور جب ہر چیز ختم ہوتی ہے تو خدا میں ضم ہو جاتی ہے۔

ایک نظم "To the challenge" ملاحظہ ہو:

تجھے خود میں سمونا چاہتا ہوں
یا مرے دل میں
ترے اندر سما جانے کی خواہش ہے
یہ کیا ہے؟
تو اگر مجھ میں اتر آئے
تو ایسا ہے
کہ جیسے
آسماں ہو آنکھ کے تل میں
سمندر آبگینے میں
طلاتم
ایک قطرے میں
اگر میں تجھ میں
در آؤں
اگر میں تجھ میں آ جاؤں
تو ایسا ہے
کہ جیسے
کوکھ میں واپس چلا جاؤں

Marfat.com

مگر سچ یہ ہے کہ وحدت الوجود منزل نہیں۔ یہ محض ایک سنگ میل ہے جسے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ پہلے زینے کے پہلے قدم سے بھی کمتر مانتے ہیں۔ میں ارتقائے مسلسل کا قائل ہوں۔ ہم اگلے جہان میں اپنی اسی ذات کے ساتھ ارتقاء کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جائیں گے۔ ہمیں حسن کا دیدار کرنا ہے جو ہم یہاں بھی کر رہے ہیں اور آخرت میں بھی اپنے ہر قدم پر کرتے چلے جائیں گے۔ آخوت میں بھی ہمارے درجات بلند ہوتے چلے جائیں گے اور ہم ابد الآباد تک ترقیاں پاتے چلے جائیں گے اور یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا اور حسن کا دیدار ہمیشہ پہلے سے بڑھ کر ہمیں نصیب ہوتا چلا جائے گا۔ ہماری انفرادیت اسی طرح برقرار رہے گی اور ہماری ذات میں اللہ تعالیٰ اپنے جلووں کا دم بدم اظہار جاری رکھیں گے۔ ہماری انفرادی ذات یا علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ہماری خودی ہمیشہ اپنی انفرادیت قائم رکھے گی اور ہمیشہ اُس میں اللہ جلوہ نشین ہوگا...... سوال یہ تھا کہ ہر چیز کے وجود میں خدا کا وجود داخل ہے۔ ہم نے سائنس سے پوچھا تو ہمیں بتایا گیا کہ دکھائی دینے والی چیزیں محض سراب ہیں۔ ہمارا سہ جہتی ادراک (3D) وزیبل لائٹ کی وجہ سے ہے۔ ہم دوسری قسم کی شعاعوں کی مدد سے دیکھنے لگیں تو ہمارا ادراک بھی اور طرح کا ہوگا لیکن اس تمام گفتگو میں مجھے اختلاف ہے تو وجود کے تصور سے...... نہ کہ ہیت کے۔ آپ اسے منطقی مغز ماری کہہ سکتے ہیں لیکن میں اسے وجود کے نظریے کی بجائے ہیت کے نظریے کی رو سے دیکھتا ہوں۔ مجھے ہیت کو خدا کہتے ہوئے اعتراض نہیں ہوتا لیکن میں وجود کو خدا کہتے ہوئے معترض ہوں۔ جیسا کہ میں نے گزشتہ سطور میں لکھا اب ذرا ہیت کے نقطۂ نگاہ سے اس بات کو دیکھتے ہیں۔ ہمیں جو اشیاء دکھائی دیتی ہیں ہم ان پر غور کرتے ہیں۔ مثلاً ہمارے سامنے لکڑی کا ایک میز ہے، لکڑی کی ایک کھڑکی، ایک صندوق اور کھڑکی کے

Marfat.com

باہر دکھائی دینے والا ایک درخت۔ گویا ہمارے سامنے چار اشیاء کی ہیت ہے ہمارے سہ جہتی (3D) ادراک نے انہیں میز، صندوق، کھڑکی اور درخت قرار دیا۔ اُن سب میں لکڑی مشترک ہے لیکن لکڑی ان کا مادہ تو ہو سکتی ہے وجود نہیں۔ اُن کا وجود اُن کی ہیت سے قائم ہے۔ ہم ان سب کو توڑ دیں، کاٹ کر یا پیس کر برادہ کر دیں تو لکڑی رہے گی یعنی مادہ تو رہے گا لیکن ہیت اور وجود دونوں غائب ہو جائیں گے۔ گویا وجود ہیت سے تھا اور ہیت وجود سے، نہ کہ وجود کا قیام مادے پر تھا۔ خدا کائنات کی لاکھوں کروڑوں چیزوں کو دم بدم ہیت دیتا اور لمحہ لمحہ نئی نئی چیزیں تخلیق کرتا رہتا ہے۔ ہیت مٹ جاتی ہے تو چیز کا وجود بھی ختم ہو جاتا ہے اور ہیت ظاہر ہوتی ہے تو چیز بھی مشہود ہو جاتی ہے۔ یہاں مجھے ''شکیل عاطرؔ'' کا شعر یاد آ رہا ہے۔ شاید میں اس کے ذریعے اپنا موقف بیان کر سکوں:

کب تلک ملے گا وہ، اوٹ سے مظاہر کی
حسن میرے اندر سے ہم کلام کب ہوگا

یہ بہت خوبصورت شعر ہے، بہت ہی خوبصورت۔ شاعر نے یوں نہیں کہا کہ..... کب تلک ملے گا وہ بیچ میں مظاہر کے..... بلکہ شاعر نے یوں کہا ہے..... کب تلک ملے گا وہ اوٹ سے مظاہر کی..... یہ ایک خالص قرآنی انداز ہے..... من وراءِ الحجاب..... کا واضح معنی..... ''اوٹ سے مظاہر کی''..... ہی ہو سکتا ہے۔ پوری آیت دیکھئے شاید ہیئت اشیاء کا مسئلہ آپ کی سمجھ میں آ جائے:

وما كان لبشرٍ ان يكلمه الله الا وحياً او من وراءِ حجابٍ او يرسل رسولاً فيوحي باذنه ما يشآءط انه عليٌ حكيمٌo

اور کسی آدمی کے لیے ممکن نہیں کہ خدا اُس سے بات کرے مگر

الہام کے ذریعے سے یا پردے کے پیچھے سے یا کوئی فرشتہ بھیج دے تو وہ خدا کے حکم سے جو خدا چاہے القا کرے، بے شک وہ عالی مرتبہ اور حکمت والا ہے۔'' (۵۱:۴۲)

اس آیت میں مِن ورآءِ حجاب کے الفاظ قابل غور ہیں۔ موسیٰؑ کو جب پہلی وحی ملی تو وہ آگ لینے پہاڑ پر گئے ہوئے تھے۔ وہاں ایک درخت میں سے یا درخت کے پیچھے سے انہیں خدا کی آواز سنائی دی۔ یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے جسے ہم سمجھ نہ سکیں۔ اللہ کی آیات اللہ والوں پر یوں نازل ہوا کرتی ہیں کہ بعض اوقات تو لفظاً لفظاً جیسا کہ قرآنِ کریم ہے انہیں وحی ہوتی ہے اور بعض اوقات انہیں اشیاء کو دیکھ کر ایک بالکل نیا درک ملتا ہے جو عام لوگوں کو ان اشیاء کے دیکھنے سے نہیں ملتا۔ آپ نے سنا ہوگا کہ نیوٹن کے سر پر سیب گرا تھا تو اس کے ذہن میں یہ جھماکا ہوا کہ زمین میں کشش ہے۔ نیوٹن کا جھماکہ ایک نبی کے شعورِ نبوت کے مقابلے میں کیا حیثیت رکھتا ہے جب نیوٹن کا جھماکا پوری زمین کے انسانوں کے لیے مفید اور حیران کن ہو سکتا ہے تو موسیٰؑ کے علم کا کیا حال ہوگا۔ موسیٰؑ کے ساتھ درخت نے بات کی یا خالص مذہبی الفاظ میں کہا جائے تو درخت میں خدا نے بات کی اور موسیٰؑ پر آیات نازل ہوئیں۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ موسیٰؑ نے عام وزیبل لائٹ (Visible Light) سے بڑھ کر کچھ دیکھ لیا تھا۔ موسیٰؑ کا معاملہ نیوٹن سے قطعاً مختلف ہے۔ نیوٹن کے ذہن میں اللہ نے ایک بالکل نئی حقیقت کا مفہوم ڈال دیا تھا جو نیوٹن نے اپنے الفاظ میں بیان کیا جبکہ نبی پر الفاظ نازل ہوتے ہیں۔ علامہ اقبال کا ایک جملہ بڑا لازوال ہے:

''فکر اور وجدان میں درجے کا فرق ہے نہ کہ نوعیت کا۔ اس کے برعکس شعورِ ولایت (وجدان) اور شعور نبوت میں نوعیت کا فرق

Marfat.com

ہے نہ کہ درجے کا۔''

بے شک وحی رسالت...... نوعیت کے لحاظ سے ایک بالکل مختلف چیز ہے۔ مختصراً یہ کہ وراءِ حجاب کے ذریعے اللہ اپنے بندوں سے گفتگو تو کرتا ہے لیکن اُس گفتگو کے مختلف درجات ہیں لیکن اس سے یہ کہاں اخذ ہوتا ہے کہ اشیاء کے وجود میں خدا کا وجود شامل ہے۔ اس سے تو بس یہی ثابت ہوتا ہے کہ اشیاء کی ہیئت میں خدا کی ہیئت کا ایک معمولی سا شمہ جس کا ذکر ہی کسی قطار شمار میں نہیں آتا، شامل ہے۔ یہ دم بدم بدلتی ہوئی کائنات تو قدرتِ الٰہی کا ایک معمولی سا مظہر ہے۔ ہم یوں نہیں کہہ سکتے کہ اللہ کے وجود کا کچھ حصہ اشیاء کے وجود میں داخل ہے۔ ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ہر چیز کی ہیئت میں اللہ کے اربوں کھربوں مظاہر میں سے کوئی ایک داخل ہے۔ وہ ایک ایسی لامتناہی ذات ہے جو متناہی اشیاء میں اپنی معمولی معمولی کرشمہ سازیوں کے ذریعے اپنے ہونے کا اظہار کرتی ہے۔ اُس کی تجلی جو پوری کائنات ہے اُس کے کل وجود کی تجلی نہیں بلکہ اُس کی بیکراں اور محیط ذات کا شاید ایک شمہ ہے اور شاید اُس سے بھی کم۔ کیونکہ ہم اُس کی تجزی نہیں کر سکتے اور نہ ہی اُس کے وجود کے حصوں کو اُس سے الگ دیکھ سکتے ہیں۔ ہم جو کچھ دیکھتے ہیں یہ سب کچھ ہے تو سہی...... وما خلقت هٰذا باطلا...... لیکن جو کچھ ہمیں دکھائی دیتا ہے یہ ہمارے نقطہ نگاہ سے حقیقی نہیں...... اور یہی جدید طبیعات کا بھی خیال ہے۔ تو پھر یوں کیوں نہ کہا جائے کہ ہیئت اشیاء میں اُس کی دم بدم بدلتی ہوئی ہیئت ہے۔ کیونکہ وہ کسی شے کی مثال نہیں۔...... لیس کمثله شيء...... لہٰذا اُس کی کوئی مخصوص ہیئت ہی نہیں۔ رہا وجود کا سوال تو وہ خالق وجود ہے نہ خود وجود۔ اگر ہم اللہ تبارک وتعالیٰ کو اشیائے مادی کے وجود میں یوں تسلیم کریں جیسا کہ اہل وحدت الوجود مانتے ہیں تو توحید کی طرف بڑھتے بڑھتے معاً ہمارا قدم ثنویت میں جا پڑتا ہے۔

Marfat.com

وحدت الوجود کے قائلین ایک انتہا پر ہیں اور دوسری انتہا پر پرلے درجے کے مادہ پرست۔ یہ ایک بہت ہی لطیف بات ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے اچھی خاصی بصیرت کی ضرورت ہے اور بات گھوم پھر کر...... پھر وہیں پر آ کر ٹھہرتی ہے۔ یعنی مادہ اور روح کا الگ الگ تصور ہمارے ذہنوں میں پیدا ہونے لگتا ہے۔ حالانکہ ہم سمجھتے ہیں کہ وحدت الوجود کو مان کر ہم توحید کے علمبردار ہونے کا ثبوت دے رہے ہیں۔ میں اس بات کو ثابت کرنے کے لیے ''اکبر بادشاہ'' کی مثال دیتا ہوں۔ اکبر بادشاہ نے اپنے دین کو دین الٰہی کا نام نہیں دیا تھا بلکہ وہ اسے ''توحید الٰہی'' کہہ کر پکارتا تھا۔ اکبر بادشاہ کے خاص مؤرخ علامہ عبدالقادر بدایونی'' نے لکھا ہے:

''بہ توحید الٰہی موسوم ساختند'' (علماء ہند کا شاندار ماضی)

ترجمہ: توحید الٰہی کے نام سے (اس مذہب کو) موسوم کیا گیا تھا''

حالانکہ اکبر وحدت الوجود کی انتہاؤں کو چھو رہا تھا۔ علامہ عبدالقادر بدایونی نے لکھا ہے:

''ہم چنیں آتش و آب و سنگ و درخت و سائر مظاہر روزگار تا گاؤ و نرگیس آں......'' (علماء ہند کا شاندار ماضی)

ترجمہ: اسی طرح آگ، پانی، درخت اور تمام مظاہر فطرت حتیٰ کہ گائے اور گائے کا گوبر تک...... (خدا ہے)۔''

وہ تو آفتاب کو ''جلت قدرتہ'' کہہ کر پکارتا تھا۔ خنزیر یعنی سور کے بارے میں اکبری دین کے ماننے والوں کا یہ خیال تھا:

''خوک ازاں مظہر ست کہ حق تعالیٰ درآں حلول کردہ (نعوذ باللہ)

Marfat.com

خنزیر بھی اُس کا مظہر ہے کیونکہ اُس میں بھی اللہ تعالیٰ حلول کیے ہوئے ہیں۔'' (علماء ہند کا شاندار ماضی)

یہ تھے اکبر کے نظریات جو سر تا سر وحدت الوجود کے نظریات ہیں۔ اکبر ایک بادشاہ تھا چنانچہ وحدت الوجود کا قائل ہونے پر اُس نے اپنی ذمہ داری سمجھی کہ اس نظریے کی رو سے حکومت چلائی جائے۔ ظاہر ہے جب بھی وحدت الوجود کو نظامِ حکومت کی بنیاد بنایا جائے گا تو یہی حال ہوگا۔ اکبر اپنے دین کو توحید الٰہی کہتا تھا لیکن کائنات کے ذرے ذرے کو پوجتے ہوئے شرک کی بدترین مثال پیش کرتا تھا۔ یہی لطیف بات ہے جسے سمجھنا بہت ضروری ہے۔ وحدت الوجود سے صرف کثرت کی پرستش کا عندیہ ہی نہیں ملتا بلکہ ایک بدترین قسم کی تقدیر پرستی بھی ثابت ہوتی ہے۔

وحدت الوجود کی بجائے اگر ہم ''وحدت ارتقائے وجود'' کا نظریہ مان لیں تو ہماری نظروں میں سب ابہام صاف ہو جائیں گے۔ دراصل وحدت الوجود ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ توحید پر عمل پیرا ہونے کا شوق اگر اعتدال کی حدوں سے نکل جائے تو ایسے ہی نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے وحدت الوجود کا خوب خوب پرچار کیا۔ ایک جگہ انہوں نے یونانی فلسفی افلاطون کو مقربِ الٰہی اور بہت بڑا ولی اللہ لکھا ہے۔ کیونکہ افلاطون نظریہء ثنویت کا بانی ہے۔ ایک جگہ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے مندرجہ ذیل عبارت تحریر فرمائی ہے:

''آیت...... ربنا ما خلقت هٰذا باطلاً...... کے ساتھ حدیث...... على كل شئ ما خلا الله الباطل ...... کو منظم کر کے بعض نے کہا کہ آیت اس قضیہ کی قوت میں ہے۔ المخلوق ليس بباطل ...... اور حدیث اس قضیہ کی قوت میں ہے۔ کل

Marfat.com

غیر اللہ باطل ...... ان دونوں مقدموں کا مجموعہ شکل ثانی ہے۔
بعد حذف حداوسط کے، نتیجہ یہ نکلا ...... المخلوق لیس غیر
اللہ ...... جب غیر نہ ہوا تو عین ہوا۔ اور یہی وحدت الوجود
ہے۔'' (بحوالہ ...... فلسفہء توحید اور نظریۂ وحدت الوجود کا تحقیقی
جائزہ از ظفر اقبال خان ص ۲۷۳)

(غالباً) اہل حدیث مصنف ظفر اقبال خان نے مولانا اشرف علی تھانویؒ کا جو بیان پیش کیا اُس میں تھانویؒ صاحب نے منطقی طرز استدلال کو اپناتے ہوئے وحدت الوجود کا اثبات کیا۔ منطق ایک قابل تحسین فن ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کریم کے ایک مترجم کو اس فن میں تاک ہونا چاہیے۔ تاکہ وہ منطقی مغالطوں سے بچتے ہوئے قرآنی آیات کا ترجمہ یا تفسیر کر سکے۔ اردو میں ہم مذکورہ بالا قضیہ یوں لکھیں گے:

مقدمہ نمبر ۱: مخلوق باطل نہیں ہے۔ (بحوالہ آیت)
مقدمہ نمبر ۲: ہر غیر اللہ باطل ہے۔ (حدیث)
نتیجہ : مخلوق غیر اللہ نہیں ہے۔

ارسطو کے قیاس کی رو سے ان دونوں مقدموں میں ''باطل'' حد اوسط ہے۔ قانون کے مطابق ہمیں حد اوسط کو حذف کرنا ہوتا ہے۔ ہم باطل کو حذف کرتے ہیں تو نتیجہ نکلتا ہے کہ مخلوق غیر اللہ نہیں۔ اتنے بڑے ماہر منطق ہو کر بھی مولانا اشرف علی تھانویؒ قیاسی منطق کے ایک عالمگیر قانون کو فراموش کر گئے ہیں۔ منطق کا ایک اٹل قانون ہے کہ:

''کسی مقدمہ میں پائی جانے والی غیر جامع حد کو نتیجے میں جامع نہیں لیا جا سکتا۔''

Marfat.com

اب ہم دیکھتے ہیں کہ آیت میں جس چیز کو مولانا اشرف علی تھانویؒ نے مخلوق سمجھا اور اُسے جامع لے کر نتیجہ نکالا...... کیا وہ حد جامع ہے؟...... نہیں! آیت میں تو یہ غیر جامع حد ہے۔ خلقت ھٰذا...... بالفاظ دیگر یہ مخلوق...... ''یہ'' کی ضمیر اس حد کو غیر جامع کر دیتی ہے اور یہ مقدمہ کلیہ سالبہ کی بجائے جزیہ سالبہ بن جاتا ہے۔ چنانچہ منطق کی رو سے یہ قیاس غلط ہے۔

لیکن یہاں تک پہنچ کر ہمیں ایک اور اُلجھن ہونے لگتی ہے۔ وحدت الوجود کے مقابلے میں وحدانیت کا ایک نظریہ موجود ہے۔ جسے عبدالوہاب نجدیؒ کے عہد میں شہرت ملی اور جو شاہ اسماعیل شہیدؒ کے ذریعے برصغیر میں متعارف ہوا۔ یہ مخلوق کو غیر سمجھتے ہیں، وحدانیت والوں کے نزدیک مخلوق خدا کا غیر ہے اور اس میں خدا موجود نہیں۔ میرے خیال میں یہ نظریہ وحدت الوجود سے بھی زیادہ ثنویت پر مبنی ہے۔ اس میں مادہ اور روح کو دو الگ الگ اشیاء کہا گیا ہے۔ اگر ہم اسے مانتے ہیں تو ہمیں اہرمن ویزداں کے دو خداؤں کے تصور کو ماننا پڑے گا۔ پاکستان میں اہل حدیث فرقہ کے لوگ اس نظریہ سے منسلک ہیں۔ دراصل اللہ کے وجود کا تصور کسی بھی مادی شے کے تصور سے...... کرنا سب سے بڑی غلط فہمی ہے۔ توحید تنزیہی تو یہ ہے کہ ہم اللہ کے وجود کو چشم تصور میں لانے کی بجائے اُس کی ذات کے احساس کو اپنے قلب پر طاری کریں۔ بالکل ایسے جیسے ہم خوشی یا درد کا احساس کر لیتے ہیں۔ چشم تصور میں تو ہم صرف اُس کی صفات کو ہی دیکھ سکتے ہیں۔ موسیٰؑ نے تو اُس کی صفات دیکھی تھیں لیکن رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قلب میں عین ذات کو محسوس کیا۔

موسیٰؑ زہوش رفت بیک جلوۂ صفات
تو عین ذات می نگری در تبسمی

Marfat.com

تصریحات بالا سے ثابت ہوتا ہے کہ اشیائے مادی کی ہیت صرف ایک احساس کا نام ہے جس کا کوئی حقیقی وجود اگر ہے تو وہ ہمارے فہم و ادراک سے باہر ہے۔ ہم نے ماہرین بصریات اور ماہرین شعاع نور کے حوالے سے بھی اسی حقیقت کا مشاہدہ کیا۔ الغرض نظریہء وحدت الوجود سے اسلامی توحید کی صحیح نمائندگی نہیں ہوتی۔ البتہ علامہ اقبال کا نظریہ ارتقائے خودی جسے، ہم چاہیں تو نظریۂ ارتقائے وجود کہہ لیں...... اسلامی توحید کی صحیح ترجمانی ہوتی ہے:

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بت کدۂ صفات میں

Marfat.com

باب:۴

تصوف اور جدید طبیعات

آئین سٹائن کا نظریہ اضافیت

''یہ کائنات حقیقی ہے لیکن ناظر کے لیے اضافی''

ہم خلاء اور وقت کے لامحدود سمندر میں بہتے چلے جا رہے ہیں۔ ہماری زمین خلاء کی پہنائیوں میں ایک تیرتا ہوا سیارہ ہے۔ جسے قرآن کریم نے ''فُلک مشحون''...... تیرتی ہوئی کشتی...... کہہ کر پکارا ہے۔ زمین اور اس کے ساتھ آٹھ دیگر بہن بھائی مل کر سورج کے گرد اگرد گردش کر رہے ہیں۔ چاند ایک ذیلی سیارہ ہے جو زمین کے گرد گھومتا ہے۔ زمین سورج کے گرد ۳۶۵ دن میں اپنا ایک چکر مکمل کرتی ہے۔ یہ اپنی پیدائش سے لے کر اب تک پانچ ارب سے زیادہ چکر لگا چکی ہے۔ خود سورج اپنی اولاد کو پروں تلے چھپائے کہکشاں کے مرکز کے گرد گھوم رہا ہے۔ کہکشاں میں ایک کھرب سے زیادہ سورج ہیں اور کائنات میں شاید ایک کھرب سے زیادہ کہکشائیں ہیں۔ ہماری کہکشاں کا نام ملکی وے (Milky Way) ہے۔ ہمارے اڑوس پڑوس میں اینڈرومیڈا اور میگالانیکی جیسی بڑی بڑی کہکشائیں موجود ہیں۔ ہم ہمیشہ سے کائنات کے مسافر رہے ہیں۔ زمین پر رہتے ہوئے ہم ہر چیز کا حساب زمین کے دنوں کے حساب سے لگاتے ہیں۔ حالانکہ زمین کا دن محض ایک سیارے کا دن ہے جو مشتری پر اور، اور زحل پر کسی اور طرح سے ہوگا۔ سورج ہر روز طلوع ہوتا ہے اور غروب ہو جاتا ہے لیکن حقیقت میں سورج نہ طلوع ہوتا ہے نہ غروب۔ اُس کا طلوع و

Marfat.com

غروب ہمارے لیے ایک اضافی منظر ہے۔ دراصل زمین اپنے محور کے گرد بھی گھومتی ہے۔ یہ چوبیس گھنٹے میں ایک چکر پورا کرتی ہے۔ جب پاکستان میں دن ہوتا ہے تو امریکہ میں رات۔ بی بی سی (BBC) ہر روز رات آٹھ بجے کی خبروں سے پہلے یہ بتاتی ہے کہ ''اس وقت لندن میں دن کے تین بجے ہیں۔''

آپ نے شاید کسی صحرا میں ریت کے طوفان کا منظر نہ دیکھا ہوگا۔ زمین سے لے کر آسمان تک ریت ہی ریت اُڑ رہی ہوتی ہے۔ ایک بند مٹھی ریت میں، کہتے ہیں دس ہزار ذرّات ہوتے ہیں۔ اگر ہم اجرامِ فلکی کا تصور کریں تو صحرا کے طوفان میں ریت کا کوئی ایک ذرہ حیثیت میں نسبتاً ہماری زمین سے بہت بڑا ہے۔ کائنات میں ستاروں کی دھول کے اندر تیرتا ہوا زمین کا سیارہ نسبتاً ریت کے اُس ذرے سے بہت چھوٹا ہے۔ ہماری زمین جیسی شاید کھربوں زمینیں ہوں جو کائنات کی دھول میں ریت کے ذرات کی طرح اڑتی پھر رہی ہوں۔ ہم کائنات کے ''وقت'' کو اپنے سیارے کے دنوں سے نہیں ماپ سکتے۔ ہمارا ایک سیکنڈ اور ہمارا ایک سال...... یہ سب زمینی وقت کو ناپنے کے پیمانے ہیں۔ یہ کائنات کب بنائی گئی یا کب بننی شروع ہوئی؟ اور پھر کائنات کب ختم ہوگی؟...... اس ''کب'' کا جواب پانے کے لیے ہمیں کسی اور طرح کے سیکنڈوں، منٹوں، دنوں اور سالوں کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ہماری زمین تو سورج سے الگ ہوئی ہے اور سورج ملکی وے کے مرکز سے۔ ہم اپنے وقت کی مدد سے کسی دور دراز کی کہکشاں کا صحیح زمانہ کیسے متعین کر سکتے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ کائنات کی ہر چیز ہمہ وقت حرکت میں ہے۔ جب تک کوئی ایک چیز ٹھہری ہوئی نہ ہو ہم کسی حرکت کرتی ہوئی چیز کا اندازہ کیسے لگا سکتے ہیں۔ کیونکہ دو حرکت کرتی ہوئی چیزیں ہمیں کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچاتی۔ سپیشل تھیوری آف ریلٹوٹی میں اسی نسبتی حرکت کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کائنات کی ہر

Marfat.com

چیز ناظر کے لیے اضافی ہے کیونکہ کائنات کی ہر چیز نسبتی ہے۔

۱۹۰۵ء میں آئن سٹائن نے سپیشل تھیوری آف ریلٹوٹی پر دو صفحات چھاپے جن میں اُس نے حرکت اور مکان کی مطلقیت کو رد کیا۔ آئن سٹائن کے مطابق کائنات میں کوئی بھی چیز ''مخصوص'' (Special) نہیں ہے جسے ایک مطلق حوالہ کہا جائے جو خلاء کے حوالے سے ساکن ہو۔ جب کوئی بھی چیز مطلق نہیں تو ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ہم کسی چیز کو دیکھ رہے ہیں۔ نظامِ شمسی کا مرکز وقتی طور پر ہمارے لیے ایک موزوں حوالہ (Fram of reffrence) ہے اور کسی بھی چیز کو اسی حوالے کی مدد سے دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے لیکن تب بھی یہ صرف ہمارے حساب سے ہوگا۔ الغرض کائنات کی کوئی چیز ایسی نہیں جسے معیار مان کر ہم باقی اشیاء کے مقامات، حرکت، پیدائش اور وجود کا تعین کریں۔ آئن سٹائن کے مطابق ہر حرکت نسبتی ہے۔ نیوٹن کو اس عجیب و غریب بات کا کچھ اندازہ تو تھا لیکن اُس کو کبھی شرح صدر نہیں ہوا اور وہ ایک جامد نظریہ کی افزائش کا باعث بنا۔ یہ ۱۷ ویں صدی میں ایک انگریز ماہر ریاضیات اور ماہر طبیعیات تھا۔ اس کا پورا نام ''اسحاق نیوٹن'' ہے اور اس نے چند طبعی قوانین وضع کیے۔ نظریہ اضافیت سے پہلے سائنسدان انہیں صحیح مانتے تھے لیکن اب ان قوانین کو کلاسیکل فزکس میں شمار کیا جاتا ہے۔ نیوٹینین اور ریلٹیوسٹک (Relativistic) مشینیں بنیادی قوانین اور ریاضیاتی اصولوں کے تحت ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں، جبکہ نتائج کے اعتبار سے ایک جیسی۔

آئن سٹائن کے بعد فزکس کو ماڈرن فزکس (جدید طبیعیات) کہا جاتا ہے۔ اس سے پہلے مادے کو مطلق مانا جاتا تھا۔ نیوٹن خلاء کو مطلق جانتا تھا۔ ایک بڑا سا گول کمرا یا کرہ جو شاید اس وقت بھی کھڑا رہے گا جب اس میں موجود تمام مادہ یعنی سورج، چاند،

Marfat.com

ستاروں وغیرہ کو ہٹا لیا جائے گا جبکہ کلاسیکل فزکس میں مادے کو ایک مستقل وجود مانا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ نیوٹن کے بعد مادیت پرستی کو عروج حاصل ہوا۔ ''قانون بقائے مادہ'' (Law of the conservation of Matter) کی رو سے یہ سمجھا جاتا تھا کہ مادہ کبھی فنا نہیں ہوتا لیکن آئن سٹائن نے کلاسیکل فزکس کے تمام دعووں کو ایسی ضربِ درویش لگائی کہ مادے کا عظیم الھیت بت ناک کے بل زمین پر آ رہا۔

حال کی جڑیں ہمیشہ کہیں ماضی میں گڑی ہوئی ہیں۔ ہم زمین پر رہتے ہوئے بھی ہمہ وقت خلاء میں تیزی کے ساتھ سفر کر رہے ہوتے ہیں۔ کیونکہ ہماری زمین انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ محوِ سفر ہے۔ ہم زمین پر اس طرح ہیں گویا کسی بحری جہاز کے عرشے پر ہوں اور وہ بحری جہاز یا قرآن کی زبان میں فلک مشحون...... تیزی سے سفر کر رہا ہے۔ ہماری زمین، خلا کے سمندر میں اسی طرح تیر رہی ہے۔ وقت کے بارے میں سائنس نے تو سوچنا ہی پچھلی صدی میں شروع کیا لیکن قرآن کریم نے ڈیڑھ ہزار برس قبل وقت کے بارے میں ایسے ایسے نقطے بتائے کہ جنہیں ہمیشہ حیرت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا رہے گا۔ جو ستارے ہم دیکھ سکتے ہیں یہ اصل کائنات کا ایک بہت حقیر سا حصہ ہیں۔ ستاروں کی تعداد ہماری زمین پر موجود تمام ریت اور مٹی کے ذرات سے کہیں زیادہ ہے۔ کارل ساگان کے الفاظ میں:

> ''اس سے پہلے کہ ہم سمجھ پاتے کہ ستارے بہت دور کے سورج ہیں، وہ ہمیں آسمانوں میں شکلیں بناتے نظر آتے تھے۔ مثلاً ایک بڑا جھرمٹ جو ''بگ ڈپر'' کہلاتا ہے بہت سی شکلیں بدل چکا ہے۔ ہر پرانی اور نئی تہذیب اپنے خدشات اور مسائل ستاروں

Marfat.com

سے وابستہ کرتی رہی ہے۔ زیادہ قدیم تہذیبیں اس قدیم جھرمٹ کی مختلف شکلیں دیکھتی ہوں گی۔ کیونکہ یہ ایک دوسرے کے مقابلے میں حرکت کرتے رہتے ہیں۔ ہم ایک کمپیوٹر کو قریبی ستاروں کے جھرمٹ کی تین جہتی (3D) حرکت اور معلومات فراہم کر کے پچھلے زمانوں میں اُس کی مختلف شکلوں کا سلسلہ معلوم کر سکتے ہیں۔ ستاروں کا ہر جھرمٹ کائناتی فلم کا ایک فوٹو ہے۔ کیونکہ ہماری زندگی بہت مختصر ہے اور ستاروں کی شکلیں اتنی آہستہ بدلتی ہیں کہ ہم محسوس ہی نہیں کر سکتے کہ ہمارے سامنے ایک فلم چل رہی ہے۔ تقریباً دس لاکھ سال پہلے کوئی بگ ڈپر نہیں تھا۔ ہمارے آباؤ اجداد جو ستاروں کو حیرت سے دیکھا کرتے تھے انہوں نے جنوبی آسمان میں کوئی اور ہی شکل دیکھی ہوگی۔ ہم ایک اور جھرمٹ دی لائن (The Lion) یا لیو (Leo) کو بھی کمپیوٹر پر دیکھ سکتے ہیں کہ وہ مستقبل میں کیسا ہوگا۔ اب سے کوئی دس لاکھ سال بعد ہماری آنے والی نسلیں شاید اسے ریڈیو ٹیلی سکوپ کا جھرمٹ کہیں گی۔ حالانکہ میرا خیال ہے کہ دس لاکھ سال بعد ریڈیو ٹیلی سکوپ بھی اتنی ہی قدیم چیز بن چکی ہوگی جتنے ہمارے لیے پتھر کے زمانے کے ہتھیار ہیں۔ جھرمٹ میں شکلیں بدل رہی ہیں۔ صرف اس لیے نہیں کہ ستارے حرکت کر رہے ہیں بلکہ اس لیے بھی کہ نئے ستارے پیدا ہو رہے ہیں۔''

.اینڈرومیڈا، یونانیوں کی وہ حسین دیوی تھی جس نے پرشیس (Perceus) کو

Marfat.com

سمندری بلا سے بچایا تھا۔ اینڈرومیڈا کا ایک ستارا بیٹا (Beta) زمین سے پچھتر نوری سال کے فاصلے پر ہے۔ وہ روشنی جس کی وجہ سے ہم اس ستارے کو دیکھ رہے ہیں۔ اُس نے زمین تک پہنچنے کے لیے خلاء میں پچھتر سال تک سفر کیا۔ ممکن ہے کہ یہ ستارا پچھلے ہفتے پھٹ گیا ہو لیکن ہم اگلے پچھتر سال تک یہ بات نہیں جان سکیں گے۔ خلاء بہت خالی ہے۔ ستارے اور سیارے ایک دوسرے سے بہت دور واقع ہیں۔ سورج سے ملکی وے کہکشاں کا فاصلہ تیس ہزار نوری سال ہے۔ ہماری کہکشاں سے قریب ترین کہکشاں M31 جو اینڈرومیڈا کے ہی جھرمٹ میں ہے، ہم سے بیس لاکھ نوری سال کے فاصلے پر ہے۔ علم فلکیات میں اس سے بھی عظیم فاصلے پائے جاتے ہیں۔ سب سے دور نظر آنے والا کوئسار (Quesar) ہم سے دس ارب نوری سال دور ہے۔ آج ہم اُسے اُس شکل میں دیکھتے ہیں جیسا وہ زمین کی پیدائش سے پہلے تھا۔ حتیٰ کہ ملکی وے کہکشاں بھی اُس وقت نہیں تھی۔ اگر ہم خلاء میں سفر کرنا چاہیں تو ہم ستاروں تک کیسے پہنچ سکتے ہیں۔ ایک نوری سال کیا چیز ہے۔ بظاہر الفاظ سے تو یہ نظر آتا ہے کہ نوری سال سے مراد وقت کی پیمائش ہے۔ مثلاً ایک سال دو سال وغیرہ لیکن نوری سال کے الفاظ وقت کی پیمائش کے لیے نہیں بولے جاتے بلکہ فاصلوں کی پیمائش کے لیے بولے جاتے ہیں۔ جیسے زمین پر ہم فاصلوں کی پیمائش کے لیے میل یا کلومیٹر کے الفاظ بولتے ہیں۔ جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں ستارا ہم سے ایک نوری سال کے فاصلے پر ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ اگر ہم روشنی کی شعاع پر بیٹھ کر سفر کریں تو ہم ایک سال میں اُس تک پہنچیں گے۔ روشنی کی شعاع ایک سیکنڈ میں تین لاکھ کلومیٹر کا فاصلہ کرتی ہے۔ ظاہر ہے دو سیکنڈ میں چھ لاکھ کلومیٹر اور تین سیکنڈ میں نو لاکھ کلومیٹر کا فاصلہ طے کرے گی۔ اسی حساب سے ہم دیکھیں گے کہ ایک سال میں کتنے سیکنڈز ہوتے ہیں۔ ہم ہر سیکنڈ کے

Marfat.com

ساتھ تین لاکھ کلومیٹر کو جمع کرتے رہیں گے۔ یہاں تک کہ ہمیں فاصلے کی پیمائش کلومیٹروں میں مل جائے گی۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم فلاں ستارے سے دس نوری سال کے فاصلے پر ہیں تو اس سے مراد یہ ہے کہ روشنی کی شعاع یہ فاصلہ دس سالوں میں طے کرتی ہے۔ ہم چاہیں تو یہ فاصلہ کلومیٹروں میں نکال سکتے ہیں۔ جس کے لیے ہمیں سال کو مہینوں، مہینوں کو دنوں، دونوں کو گھنٹوں، گھنٹوں کو منٹوں اور منٹوں کو سیکنڈوں میں نکالنے کے بعد تین لاکھ کلومیٹر کو اس کے ساتھ ضرب دینی ہوگی۔ اس طرح دس نوری سال کا فاصلہ کلومیٹروں میں نکل آئے گا۔ کیا ہم اتنے دور دراز مقامات تک سفر کر سکتے ہیں۔ جدید سائنس نے اب یہ تسلیم کر لیا کہ ہم یہ سفر کر سکتے ہیں۔ قرآن کریم نے سوا چودہ سو سال پہلے یہ دعویٰ پیش کیا تھا۔

سبحان الذی اسریٰ بعبدہٖ لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصا الذی بٰرکنا حولہ...... (سورۃ بنی اسرائیل آیت نمبر۱)

ترجمہ: سبحان ہے وہ جس نے سیر کرائی اپنے عبد کو ایک رات میں مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک''۔

منکرین معراج خصوصاً ''غلام احمد پرویز'' جیسے مفکرین نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے بہت سے سوالات اٹھائے ہیں۔ خصوصاً یہ کہ آیت میں آسمانوں پر جانے کی بات نہیں۔ بلکہ مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک جانے کی بات ہے لیکن میں سمجھتا ہوں مسجد حرام سے مراد پوری زمین ہے۔ کیونکہ ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے ''تمہارے لیے پوری زمین مسجد بنا دی'' اسی طرح میرا خیال ہے کہ مسجد اقصیٰ سے مراد ''مقام محمود'' ہے۔ جہاں تک پہنچانے کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کر رکھا تھا۔

Marfat.com

عسٰی ان یبعثک ربک مقاماً محمودا

’’قریب ہے خدا تم کو مقامِ محمود میں داخل کرے۔‘‘

جبکہ مقام محمود کیا ہے؟ یہ ایک الگ گفتگو ہے جسے میں انشاء اللہ سیرت کی کتاب میں اٹھاؤں گا۔

خلاء میں اب تک جو سب سے زیادہ تیز رفتار چیز بھیجی گئی ہے وہ وائیجر ہے۔ ایک تیز رفتار خلائی جہاز۔ اب تک کئی وائیجر بھیجے گئے ہیں۔ وائیجر کی رفتار روشنی کی رفتار سے دس ہزار گنا کم ہے۔ ایک وائیجر ہمارے قریب ترین ستارے تک چالیس ہزار سال میں پہنچے گا۔ یہ اتنی طویل مدت ہے کہ ہم اس قدر طویل منصوبہ بنانے کی اہلیت ہی نہیں رکھتے لیکن کیا کوئی ایسا طریقہ ہے کہ ہم کم وقت میں ستاروں کا سفر کریں۔ کم سے کم وقت میں ہم زیادہ سے زیادہ کائنات کو دیکھنے کے قابل کس طرح ہو سکتے ہیں۔ کیا ہمیں اس کے لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج جیسی کوئی چیز حاصل کرنا ہوگی یا ہمیں کوئی ایسا خلائی جہاز بنانا ہوگا جو تیز رفتاری کے ساتھ کائنات میں سفر کر سکے۔ سائنسدانوں کا کہنا یہ ہے اگر روشنی کی رفتار سے سفر کیا جائے تو ہم ساری کائنات کو دیکھ سکتے ہیں۔ آئن سٹائن کے نزدیک روشنی کی شعاع ہی وہ واحد سہارا ہے جسے ہم نسبتوں سے لبریز اس کائنات میں وقتی طور پر (Absolute) کہہ سکتے ہیں۔ آئن سٹائن نے اجسام کی حرکت کو روشنی کے حوالے سے دیکھا اور بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ روشنی کی ولاسٹی کا مربع ایک ایسی رفتار ہے جس تک پہنچ کر مادے کا وجود کلیتاً فنا ہو جاتا ہے۔

روشنی کی ولاسٹی کا مربع ......۳ لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ × ۳ لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ ہے۔

......گویا ۹ لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے حرکت کرتا ہوا مادہ انرجی میں بدل جاتا ہے۔ آئن سٹائن کی مساوات یہ ہے:

$$E=mc^2$$

یہ وہی رفتار ہے جسے قرآن نے ''نور علیٰ نور'' ...... کہہ کر پکارا ہے۔

نور × نور یا (نور^2)

......قرآن وحدیث کی زبان میں اسے ''البراق'' بھی کہا گیا ہے۔ جو صریحاً برق کا اسم مکبر یعنی مربع ہے۔ ہم اسے برق × برق ...... یا (برق^2) بھی کہہ سکتے ہیں۔ اسی کو آئین سٹائن C^2 کہتا ہے، لیکن کیا روشنی کی رفتار کا مربع حاصل کرنا ممکن ہے۔ ایک انسان نے ایسا کر کے دکھایا اور وہ ایسا انسان ہے جس کی زندگی کو سب انسانوں کے لیے بہترین نمونہ قرار دیا گیا ہے۔ گویا ثابت ہوا کہ روشنی کی رفتار کا مربع انسان کے لیے حاصل کرنا ممکن ہے۔ سائنسدان اس کوشش میں ہیں کہ وہ کسی طرح اپنی رفتار بڑھا کر روشنی کی رفتار کے نزدیک پہنچ سکیں۔ روشنی کی رفتار میں ایک عجیب جادو ہے جو کارل ساگان کے نزدیک وقت اور خلاء کو سمجھنے کی چابی ہے۔

آئن سٹائن کا نظریہ اضافیت سمجھنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم ایک سادہ سی مثال سے اپنے لیے پیش آمدہ موضوع کو آسان کر لیں۔ یہ مثال بہت سادہ اور بہت آسان ہے۔ ہم اپنے گھر کی وال کلاک کی طرف نظر اٹھاتے ہیں تو ہمیں اُس میں گھومتی ہوئی سوئیاں دکھائی دیتی ہیں۔ جو ایک طرف تو اپنے مرکز کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں جبکہ اُن کا دوسرا سرا ایک بڑے دائرے میں گھومتا رہتا ہے۔ ہم ایسی ہی ایک بہت بڑی سوئی تصور میں لاتے ہیں اتنی بڑی کہ اُس کا ایک سرا زمین پر ہو اور دوسرا آسمان میں کہیں دور تک چلا گیا ہو۔ اب ہم جب اس سوئی کو حرکت دیتے ہیں تو ایک حیران کن بات ہمیں دکھائی دیتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سوئی کا نچلا سرا جو ہمارے پاس ہے ایک سیکنڈ میں اگر صرف ایک فٹ فاصلہ طے کرتا ہے تو اس کا دوسرا سرا جو آسمانوں میں کہیں ہے، اُسی سیکنڈ میں لاکھوں کلومیٹر کا فاصلے طے کرتا ہے۔ یہ کتنی عجیب بات ہے۔ آپ نے سرکس والوں کی لائٹ تو دیکھی ہوگی جو بہت تیز اور طاقتور لائٹ ہوتی ہے۔ یہ سرچ

لائٹ زمین سے آسمان کی طرف بلند ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ روشنی کی یہ سیدھی شعاع ایک قوس کی صورت مسلسل حرکت کرتی رہتی ہے۔ لائٹ کا ایک سرا...... یا وہ جگہ جہاں سے وہ لائٹ نکل رہی ہے دورانِ حرکت محض ایک فٹ کا فاصلہ طے کرتا ہے۔ جبکہ دوسرا سرا ہزاروں فٹ کا فاصلہ طے کرتا ہے اور یہ عمل ہم ہر روز دیکھتے ہیں۔ سوئی یا لائٹ کی مثال فزکس کے طلباء کو احمقانہ محسوس ہوتی ہوگی کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ دائرے کا رداس اس حرکت میں خاص کردار ادا کرتا ہے۔ دوسرا سرا فاصلہ زیادہ طے نہیں کرتا بلکہ یہ رداس کا کرشمہ ہے ہر لمحہ سمت بدلتا ہوا نقطہ فاصلے کی مثال نہیں بن سکتا لیکن عام قاری کو اسی مثال سے فاصلہ کی سمجھ آ سکتی ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ دراصل سیدھے خط کے ہر نقطے کی حرکت اپنے سے پچھلے نقطے کی حرکت کی پابند ہوتی ہے۔ گویا ایک نقطے کی پیٹھ پر دوسرا نقطہ سوار ہوتا ہے۔ ہم جب بھی کسی دائرے کے رداس (Radious) کو گھڑی وار (Clock wise) یا مخالف گھڑی وار حرکت دیتے ہیں تو اُس کا مرکزی سرا بہت کم جبکہ مخالف سرا بہت زیادہ فاصلہ طے کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کرۂ کائنات کی ہر چیز دوسری چیز کے حوالے سے نسبتی ہے۔ ہم زمین پر چلتے ہیں۔ زمین سورج کے گرد گردش کرتی ہے۔ سورج کہکشاں کے بازو میں ایک لمبے سفر پر چلتا جا رہا ہے اور کہکشاں اندھا دھند کائنات سے باہر کی طرف دوڑتی چلی جا رہی ہے۔ دوسری کہکشائیں، سورج، ستارے اور سیارے بھی ایسا ہی کر رہے ہیں۔ وکلٌ فی فلکٍ یسبحون ...... کائنات میں کوئی چیز ساکن نہیں۔ بقول اقبالؒ:

ع ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں
سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں

انسان نے بڑی مشکلوں اور محنتوں سے آج یہ مقام پایا ہے کہ وہ خلاء اور وقت کو سمجھ سکے۔ اب آئن سٹائن کا نظریہ پیش کرنے سے پہلے ہم یہاں آئن سٹائن کا مختصر

Marfat.com

تعارف پیش کرتے ہیں جو کارل ساگان کے الفاظ میں ہے:

''اندازہ ہے کہ روشنی کی رفتار میں ایک عجیب وغریب چیز پوشیدہ ہے جو وقت اور خلاء کو سمجھنے کی چابی ہے۔ اس کی دریافت کی کہانی ہمیں جنوبی اٹلی کے شہر ٹسکینی (Tuscany) لے جاتی ہے۔ اس جگہ کی ایک خوبی یہ ہے کہ وقت کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ ایک صدی پہلے بھی وہ جگہ ایسی ہی لگتی تھی۔ اگر آپ ۱۸۹۵ء میں ان سڑکوں پر سے گزر رہے ہوتے تو آپ کو جرمن سکول سے نکالا ہوا ایک سولہ سالہ لڑکا ملتا جس کے استادوں نے اُس سے کہا تھا کہ ''تم کبھی کچھ نہیں بن سکو گے۔ تمہارے الٹے سیدھے سوالات کلاس کی فضا کو خراب کرتے ہیں۔ تمہارا سکول سے باہر رہنا تمہارے لیے بہتر ہوگا۔'' چنانچہ اُس نے سکول چھوڑ دیا اور آوارہ گردی شروع کر دی۔ اس طرح اُس نے ذہن کو بھی چیزوں کو سمجھنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا۔ ایک دن اُس نے روشنی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا کہ یہ کتنی تیز چلتی ہے۔ ہم اپنی روزمرہ زندگی میں حرکت کرنے والی چیزوں کی رفتار دوسری چیزوں کی نسبت سے دیکھتے ہیں۔ میں تقریباً ۱۰ کلومیٹر فی گھنٹے کی رفتار سے حرکت کر رہا ہوں زمین کی نسبت سے لیکن زمین بھی بے حرکت نہیں ہے۔ وہ سولہ ہزار کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے حرکت کر رہی ہے۔ سورج دوسرے ستاروں کے درمیان گردش کر رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ایک نوجوان کے لیے اس نسبتی (ریلٹو) حرکت

کا کوئی پیمانہ مقرر کرنا بہت مشکل تھا۔ وہ جانتا تھا کہ آواز کی لہریں ہوا کی تھرتھراہٹ ہیں اور ان کی رفتار ہوا کی نسبت سے متعین ہوتی ہے لیکن روشنی خالی خلاء میں سفر کرتی ہے۔ تو کیا روشنی کی لہریں بھی کسی دوسری چیز کی نسبت سے سفر کرتی ہیں؟ اگر ایسا ہے تو کس چیز کی نسبت سے۔ سکول سے نکالا ہوا یہ نوجوان البرٹ آئین سٹائن تھا...... وہ حیران تھا کہ اگر روشنی کی لہر پر بیٹھ کر سفر کیا جائے تو دنیا کیسی لگے گی؟ روشنی کی رفتار سے سفر کیسا ہوگا؟ سورج کی روشنی سے چمکتی ہوئی دیہات کی سڑکوں پر ایک آوارہ گرد لڑکے کے ذہن کے لیے یہ سوالات حیرت انگیز اور مسحور کن تھے۔ اگر آپ ایک کرن پر سوار ہوں تو آپ اُس لہر پر سوار رہیں گے اور یہ احساس ختم ہو جائے گا کہ یہ ایک لہر ہے۔ روشنی کی رفتار تک پہنچ کر کوئی عجیب وغریب بات ہوتی ہے۔ آئن سٹائن جتنا اس مسئلے پر سوچتا یہ مسئلہ اتنا ہی پریشان کن ہوتا چلا جاتا تھا۔ روشنی کی رفتار تک پہنچتے ہی مہمل حقیقتیں اور تضادات ہر طرف سے لپک پڑتے تھے۔ کچھ نظریات کو بغیر کسی غور و فکر کے صحیح تسلیم کر لیا گیا تھا۔ آئن سٹائن نے بالکل سادہ سے سوالات کیے جو کئی صدیاں پہلے بھی کیے جا سکتے تھے۔ مثلاً اس سے ہمارا مقصد کیا ہوتا ہے جب ہم یہ کہتے ہیں دو واقعات ایک ساتھ ہو رہے ہیں۔

تصور کریں میں سائیکل پر آپ کی طرف آ رہا ہوں۔ جیسے ہی میں ایک چوراہے پر پہنچتا ہوں میری ایک گھوڑا گاڑی سے ٹکر ہونے

لگتی ہے۔ میں لڑکھڑاتا ہوں اور بڑی مشکل سے گاڑی کے نیچے کچلے جانے سے بچتا ہوں۔ اب ذرا اس واقعے کے بارے میں دوبارہ سوچیے اور تصور کیجیے کہ سائیکل اور گھوڑا گاڑی دونوں تقریباً روشنی کی رفتار سے چل رہی ہیں۔ آپ سڑک کے کنارے کھڑے ہیں۔ گاڑی آپ کی نظر کی لائن پر رائٹ اینگل سے (دائیں طرف سے) آرہی ہے۔ آپ منعکس ہونے والی روشنی میں مجھے اپنی طرف آتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اگر میری سائیکل کی رفتار کو بھی روشنی کی رفتار میں شامل کر دیا جائے تو میرا عکس آپ تک گاڑی کے عکس سے پہلے پہنچ جائے گا۔ گاڑی کو وہاں پہنچتا ہوا دیکھنے سے پہلے آپ مجھے لڑکھڑاتا ہوا دیکھیں گے۔ میں اور گاڑی دونوں چوراہے پر میرے نقطۂ نگاہ سے ایک ساتھ پہنچیں گے لیکن آپ کے لیے نہیں۔ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ میں تو ٹکرانے سے بڑی مشکل سے بچا اور آپ کے لیے میں آرام سے سیٹی بجاتا ہوا شہر کی طرف جا رہا ہوں۔ یہ بالکل عجیب اور نازک سوالات ہیں۔ یہ ایک ظاہری بات کو چیلنج کرتے ہیں۔ آئن سٹائن سے پہلے لوگوں نے ایسے سوالات نہیں کیے۔ اتنے ابتدائی سوالات سے آئن سٹائن نے دنیا کو...... دنیا کے بارے میں دوبارہ سوچنے پر آمادہ کر لیا۔ یہ طبیعیات میں ایک انقلاب تھا۔

اگر دنیا کو سمجھنا ہے، اگر بہت تیز رفتار سے سفر کرنا ہے تو پھر منطقی طور پر مہمل قیاسوں سے بچنا پڑے گا۔ کچھ اصولوں کو تسلیم کرنا

پڑے گا۔ آئین سٹائن ان اصولوں کو سپیشل تھیوری آف ریلیٹوٹی کہتا تھا۔ روشنی ہر چیز سے برابر کی رفتار سے سفر کرتی ہے۔ چاہے وہ چیز ٹھہری ہوئی ہو یا حرکت میں ہو۔ روشنی کی رفتار کے ساتھ کسی دوسری شے کی رفتار کو شامل نہیں کیا جا سکتا۔ علم طبیعیات کا کوئی اصول ایسا نہیں جو ہمیں روشنی کی رفتار کے قریب سفر کرنے سے روک سکے۔ روشنی کی ۹۹.۹۹ رفتار تک پہنچا جا سکتا ہے لیکن آپ کتنی بار بھی کوشش کریں یہ آخری ۱.۰ فیصد تک آپ کبھی نہیں پہنچ سکیں گے۔ دنیا کو استدلالی طور پر مستقل مزاج رکھنے کے لیے کائنات میں رفتار کی ایک حد مقرر کرنی ہی ہوگی۔ ورنہ آپ کسی بھی چلتی ہوئی چیز کی رفتار کو روشنی کی رفتار میں شامل کر کے لامحدود رفتار تک پہنچ سکتے ہیں۔''

کائنات کی ہر چیز حرکت میں ہے اس لیے ایک چیز کی حرکت دوسری چیز کی حرکت سے کچھ خاص نسبت رکھتی ہے۔ اس سادہ سی بات کو سمجھنے کے لیے ہم ایک دو سادہ سی مثالیں دیکھتے ہیں۔ نمبر ایک فرض کریں آپ موٹر سائیکل پر ساٹھ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کر رہے ہیں جبکہ سامنے سے ایک موٹر سائیکل آ رہی ہے جس کی رفتار چالیس کلومیٹر فی گھنٹہ ہے۔ اب آپ سوچیے! کہ آپ کی رفتار سامنے سے آنے والی موٹر سائیکل کی رفتار کے حوالے سے کتنی ہے؟ زمین پر سڑک کے کنارے کھڑے لوگ آپ کو دیکھ رہے ہیں کہ آپ کی رفتار ساٹھ کلومیٹر فی گھنٹہ ہے اور وہ موٹر سائیکل سوار بھی آپ کو دیکھ رہا ہے جو سامنے سے آپ کی طرف آ رہا ہے۔ کیا اُس کے نزدیک بھی آپ کی رفتار ساٹھ کلومیٹر ہے؟ یقیناً نہیں۔ کیونکہ وہ تو چالیس کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار

سے آپ کی جانب بڑھ بھی رہا ہے۔ آپ دونوں ایک دوسرے کی طرف بڑھ رہے ہیں تو آپ دونوں کی رفتار کو جمع کرنا پڑے گا۔ آپ اُس موٹر سائیکل کی طرف ۱۰۰ کلومیٹر کی رفتار سے بڑھ رہے ہیں اور وہ موٹر سائیکل بھی آپ کی طرف سو کلومیٹر کی رفتار سے بڑھ رہی ہے۔ مختصر یہ کہ آپ دونوں ایک دوسرے کی طرف سو کلومیٹر کی رفتار سے بڑھ رہے ہیں۔ حالانکہ سڑک کے کنارے کھڑے لوگوں کی نظر میں آپ دونوں کی رفتار ساٹھ اور چالیس کلومیٹر فی گھنٹہ ہے۔

نمبر دو! آپ ایک موٹر سائیکل پر ساٹھ کلومیٹر کی رفتار سے سفر کر رہے ہیں۔ آپ کے پہلو میں آپ کا ایک دوست بھی ساٹھ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کر رہا ہے۔ گویا آپ دونوں پہلو بہ پہلو موٹر سائیکلیں دوڑا رہے ہیں۔ سڑک کے کنارے کھڑے لوگوں کے نزدیک آپ دونوں کی رفتار ساٹھ اور ساٹھ کلومیٹر ہے لیکن ایک...... دوسرے کے حوالے سے آپ دونوں کی رفتار کیا ہے؟ ایک دوسرے کے حوالے سے آپ دونوں رکے ہوئے ہیں۔ آپ چاہیں تو ہاتھ بڑھا کر اپنے ساتھی سے کوئی چیز مانگ لیں یا کوئی چیز اُسے تھما دیں۔ کیونکہ آپ کے لحاظ سے وہ رکا ہوا ہے۔ اگر آپ کے لحاظ سے وہ حرکت میں ہوتا تو آپ اُسے کبھی نہ چھو سکتے۔ اس طرح آپ کی رفتار اُس کے لحاظ سے ''زیرو'' کلومیٹر فی گھنٹہ ہے اور آپ کے لحاظ سے اُس کی رفتار بھی ''زیرو'' کلومیٹر فی گھنٹہ ہی ہے۔ بالفاظ دیگر آپ دونوں رکے ہوئے ہیں۔

نمبر تین: کھلے سمندر میں امریکی نیوی کا ایک بڑا جہاز دو سو کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے مشرق کی جانب بڑھ رہا ہے۔ اس جہاز پر بنی ایک سڑک کے اوپر امریکی بمبار طیارہ پرواز کرنے کے لیے تیار ہے۔ پرواز سے پہلے وہ جہاز کے رن وے پر دو سو کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے مشرق کی طرف دوڑتا ہے۔ دونوں کا رخ مشرق کی طرف

Marfat.com

ہے۔ بحری جہاز کا بھی اور طیارے کا بھی۔ اب ذرا سوچیے! کہ زمین کے حوالے سے طیارے کی رفتار کیا ہوگی؟ وہ طیارہ جو بحری جہاز پر دو سو کلومیٹر کی رفتار سے دوڑ رہا ہے زمین کے حوالے سے چار سو کلومیٹر کی رفتار سے دوڑ رہا ہے۔ کیونکہ طیارے کے پیروں تلے دو سو کلومیٹر کی رفتار سے بحری جہاز بھی تو دوڑ رہا ہے۔ فرض کریں کہ سمندر میں طوفان آ جاتا ہے اور بحری جہاز جو خود دو سو کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے تیر رہا ہے ایک ایسی طوفانی لہر پر تیرنے لگتا ہے جس کا پانی بھی دو سو کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے مشرق کی جانب دوڑ رہا ہے۔ اب زمین کے حوالے سے طیارے کی رفتار چھ سو کلومیٹر ہو جائے گی۔ کیونکہ اب دو سو کلومیٹر کی رفتار سے دوڑتا ہوا پانی بھی اِس کے ساتھ ریلیٹو (Relative) ہوگیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ زمین سولہ ہزار کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے سورج کے گرد گھوم رہی ہے۔ اگر ہم زمین کی حرکت کو مشرق کی طرف فرض کر لیں اور زمین سے باہر خلاء میں کھڑے ہو کر امریکی بمبار طیارے کی رفتار نوٹ کریں تو یہ سولہ ہزار چھ سو کلومیٹر ہوگی۔ اگر ہم چند قدم مزید دور جا کھڑے ہوں اور زمین کو سورج سمیت حرکت کرتا ہوا دیکھیں تو شاید امریکی بمبار طیارے کی رفتار ہمیں ایک لاکھ کلومیٹر سے زیادہ نوٹ کرنی پڑے، لیکن طیارے میں بیٹھا پائلٹ خود کو ایک لاکھ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتا ہوا محسوس نہیں کرے گا۔ وہ تو یہی سمجھے گا کہ وہ دو سو کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہا ہے۔ خلاء کے حوالے سے اُس نے کتنا فاصلہ طے کیا؟ شاید لاکھوں میل، لیکن بحری جہاز کے حوالے سے شاید وہ چند میٹر ہی رن وے پر دوڑے گا۔

کیا واقعی ایسا ہے؟ کہ ہم ان رفتاروں کو پورا پورا...... آپس میں جمع کر سکتے ہیں۔ آئن سٹائن یہاں پہنچ کر بہت عجیب مؤقف اپناتا ہے۔ وہ کہتا ہے نسبتی حرکتوں کی وجہ سے ہم ان رفتاروں کو جمع تو کر سکتے ہیں، لیکن پورا پورا نہیں، انتہائی معمولی قسم کی کمی بیشی

ہوتی ہے۔ جس سے اضافیت جنم لیتی ہے۔

کائنات کا ہر جسم حرکت میں ہے کسی ناظر کے حوالے سے اس کی رفتار کم ہے تو کسی اور ناظر کے حوالے سے زیادہ۔ آئن سٹائن ناظر کے حوالے کو فریم آف ریفرنس (Fram of reffrence) کہتا ہے۔ اب ذرا نظریہ اضافیت کی تعریف پر ایک بار پھر نظر ڈالیے:

''یہ کائنات حقیقی ہے لیکن ناظر کے لیے اضافی۔''

ہم زمین سے ہر روز...... رات کے وقت ستاروں کو دیکھتے ہیں۔ ہماری نظر کو یہ ستارے بظاہر ٹھہرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ حالانکہ سب کے سب حرکت میں ہیں اور پھر ہماری نظر کے حوالے سے ہر سیارے یا ستارے کی رفتار الگ الگ ہے۔ کیا رفتار کے لیے کوئی ایسا پیمانہ نہیں ہوسکتا جسے ہم معیار مان کر ہر چیز کی حرکت کا جائزہ لے سکیں۔ ہاں! روشنی کی شعاع وہ معیار ہے کیونکہ روشنی کی شعاع ہر چیز سے ایک جیسی رفتار کے ساتھ سفر کرتی ہے۔ آپ کی آنکھوں کے سامنے ایک سیدھی سڑک ہے اور ایک تیز رفتار موٹر سائیکل سوار آپ کی طرف بڑھ رہا ہے تو ایسا نہیں ہوگا کہ حرکت کرتے ہوئے موٹر سائیکل سے منعکس ہوکر آنے والی شعاعیں آپ تک پہلے پہنچیں اور آس پاس کی ساکن چیزوں مثلاً کھمبے سے منعکس ہوکر آنے والی شعاعیں آپ تک بعد میں پہنچیں۔ دراصل روشنی ایک ایسی چیز ہے جس کی رفتار میں کسی حرکت کرتی ہوئی شے کی رفتار کو جمع نہیں کیا جا سکتا۔ یہ موٹر سائیکل اور کھمبے سے ایک جیسی رفتار کے ساتھ ہماری جانب بڑھے گی۔ اگر روشنی کی رفتار موٹر سائیکل کی رفتار میں جمع ہوسکتی تو موٹر سائیکل سے منعکس ہوکر آنے والی شعاعیں ہماری آنکھ تک آس پاس کی شعاعوں کی نسبت جلد پہنچ جاتی لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ روشنی کی رفتار ہر چیز سے یکساں سفر کرتی ہے

Marfat.com

یہی وجہ ہے کہ ہم روشنی کو مطلق جان کر باقی اشیاء کی حرکت کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ اگر نسبتی حرکتیں ایک دوسرے کی نسبت سے اپنی رفتار بڑھاتی چلی جائیں جیسا کہ ہم نے امریکی بمبار طیارے کی مثال میں غور کیا تو حرکت کی رفتار بہت زیادہ بڑھائی جا سکتی ہے۔ ہم بہت سی ریلٹو حرکتیں فرض کر سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ نسبتی حرکتیں جمع ہوتے ہوتے تین لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار تک پہنچ جائیں تو ایسی صورت میں آنکھ کی طرف آنے والی شعاع اور مذکورہ جسم کی رفتار برابر ہو جائیں گی۔ نتیجتاً وہ جسم حرکت کرتا ہوا دکھائی نہیں دے گا۔ شاید ایک لمبی لکیر دکھائی دے گی۔ اُس کی کمیت بڑھ جائے گی اور شاید وہ ایک سرخ رنگ کی سیدھی سی لکیر محسوس ہو۔ یہاں ہم کارل ساگان کے الفاظ بھی دیکھ لیں تو بہتر ہوگا:

> ''روشنی کی رفتار کے قریب پہنچ کر آپ کو دنیا عجیب و غریب لگنے لگتی ہے۔ ہر چیز سکڑ کر آپ کی نظروں کے سامنے ایک گول کھڑکی میں آ جاتی ہے۔ جو پورے سفر میں آپ کے سامنے رہتی ہے۔ جو آدمی کھڑا ہوا آپ کو دیکھ رہا ہوتا ہے، اس کے لیے آپ سے منعکس ہونے والی روشنی سرخی مائل ہو جائے گی۔ آپ سے خارج ہونے والی انفرا ریڈ شعاعیں نظر نہ آنے والی چھوٹی طول موج (Wave Lengths) میں بدل جائیں گی۔ آپ اپنی حرکت کی سمت میں دب جائیں گے۔ آپ کا Mass (کمیت) بڑھ جائے گا اور وقت کی رفتار سست ہو جائے گی۔ روشنی کی رفتار سے سفر کرنے پر جو حیرت انگیز تجربہ آپ کو ہوگا اسے نظریۂ اضافیت کی رو سے ٹائم ڈائی لیشن (Time

Dilation) کہتے ہیں۔''

روشنی کی رفتار کے قریب پہنچ کر سفر کرتے ہوئے ہمارے وقت کی رفتار سست ہو جاتی ہے؟ کیا زمین پر موجود اپنے دوسرے دوستوں کی نسبت ہمارا کم وقت گزرے گا؟ یہ ایک سوال ہے جس کا جواب سائنس کا تازہ ترین موضوع ہے۔ 21 ویں صدی میں شاید اس کا کوئی کافی وشافی جواب سامنے آسکے۔ تاحال سائنس اس سوال کا جو جواب دیتی ہے وہ بعض حوالوں سے قابل تنقید ہے۔ بہرحال مجموعی طور پر وہ علمی دنیا کا سب سے دلچسپ سوال ہے۔ مثلاً ''کارل ساگان'' کے ہی الفاظ دیکھئے:۔

> ''روشنی کی رفتار کے قریب سفر کرتے ہوئے آپ کی عمر میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔ جبکہ زمین پر آپ کے دوست اور عزیز عام رفتار سے بوڑھے ہو رہے ہوں گے۔ جب آپ اپنے سفر سے واپس آئیں گے تو وہ بوڑھے ہو چکے ہوں گے۔ جبکہ آپ کی عمر پر کوئی فرق نہیں پڑا ہوگا۔ روشنی کی رفتار سے سفر کرنا انسان کے لیے آب حیات ہے۔ کیونکہ روشنی کی رفتار کے قریب وقت آہستہ ہو جاتا ہے اور روشنی کی رفتار تک پہنچ کر بالکل ٹھہر جاتا ہے۔ "Special theory of Relativity" ہمیں وہ ذریعہ مہیا کرتی ہے جو ہمیں ستاروں تک پہنچا سکتا ہے۔''

یہ سائنس کا تازہ ترین خیال ہے۔ جو ابھی ایک نومولود بچے کی طرح 21 ویں صدی کی ابتداء میں پرورش پا رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کل وقت گزرنے کا یہ احساس بدل جائے۔ لیکن سردست ہم سائنس کے اسی جدید خیال کی روشنی میں کچھ چیزوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ ہم انسانوں نے فی الحال ایسا کوئی جہاز نہیں بنایا جو روشنی کی رفتار سے سفر کرتا

Marfat.com

ہو۔ اگر کبھی ایسا جہاز بنا لیا گیا جو روشنی کی رفتار سے سفر کرتا ہو تو سائنس کے تازہ ترین خیال کے مطابق اس جہاز میں بیٹھے مسافروں کا وقت تھم جائے گا۔ وہ خلا میں سفر کرتے ہوئے ہر چیز کو.......... کائنات کی ہر چیز کو، اپنی آنکھوں کے سامنے ایک گول کھڑکی میں دیکھیں گے۔ اس موضوع پر بے شمار فلمیں بن چکی ہیں۔ جن میں سائنس فکشن کی مدد سے ٹائم کو مختلف جہات سے دکھا کر ٹائم ڈائی لیشن کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بعض سر پھرے سائنسدانوں نے ایسے جہازوں کے منصوبے بھی پیش کیے ہیں جو روشنی کی رفتار تو نہیں' لیکن روشنی کی رفتار کے قریب سفر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں گے۔ ان جہازوں کے ابتدائی ڈیزائن بنا لیے گئے ہیں۔ یہ جہاز لوگوں کو ستاروں تک لے جائیں گے۔ ان جہازوں کو زمین سے باہر خلاء میں زمین کے مدار کے اندر رہتے ہوئے بنایا جائے گا۔ اور وہاں سے یہ جہاز اپنے خلائی سفر پر روانہ ہوں گے۔ ان میں سے ایک ''پروجیکٹ اورئن'' (Project orion) ہے۔ Orion کا ڈیزائن اس طرح تیار کیا گیا ہے کہ اس میں ہائیڈروجن بم کے دھماکے ہوں گے۔ نیوکلیائی ہتھیار ایک اندرونی پلیٹ پر دھماکہ کریں گے۔ ایک طرح سے اس سے پٹ پٹ کی آواز آئے گی جیسا کہ موٹر بوٹ سے آتی ہے۔ انجینئر نگ کے نقطۂ نظر سے Orion ایک قابل عمل منصوبہ ہے۔ امریکہ میں اس پر سنجیدگی سے کام جاری تھا لیکن ایک عالمی معاہدہ کے تحت خلاء میں نیوکلیائی دھماکوں پر پابندی لگا دی گئی۔ حالانکہ نیوکلیائی بم دھماکوں کا اگر کوئی مثبت پہلو تھا تو وہ یہی ایک' کہ نیوکلیئر بم خلا میں استعمال کر کے تسخیر کائنات کے کام کی طرف توجہ دی جائے۔ آنے والی صدیوں میں ہم سے زیادہ ترقی یافتہ دنیا کے لوگ ہمارے بارے میں یہی لکھیں گے کہ ہم نے ایک عظیم طاقت، ایک بے پایاں توانائی یعنی ایٹم بم اور نیوکلیئر بم تو حاصل کر لیا تھا، لیکن اس توانائی سے کوئی گاڑی کھینچنے کی

Marfat.com

بجائے ہم نے اسے اپنے انسان بھائیوں کی تباہی کے لیے استعمال کیا۔ کیا یہ بالکل ویسا نہیں ہے جیسے کسی معصوم بچے کے ہاتھ میں بم تھما دیا جائے اور وہ اسے اپنی کھیل کود کے لیے یوں استعمال کرے کہ خود کو ہلاک کر لے۔ لگتا ہے انسان کو وقت سے پہلے نیوکلیئر انرجی عطا کر دی گئی ہے۔ کہتے ہیں کولمبس نے امریکہ کے ساحل پر اترتے ہی صلیبی پرچم اور اپنی تلوار زمین میں گاڑ دی تھی۔ ریڈ انڈینوں نے تلوار کبھی نہیں دیکھی تھی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر تلوار کو چھوا اور اپنی انگلیاں کاٹ لیں۔ آج ہمارے پاس ایٹمی ہتھیار ہیں۔ ہم چاہیں تو انہیں محض ایک توانائی کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔ نیوکلیئر توانائی بڑے کام کی چیز ہے۔ ہم چٹکی بھر مادے سے اتنی بجلی پیدا کر سکتے ہیں جو پچاس سال تک پاکستان کے ہر شہر میں چراغاں کر دے۔ ایک نیوکلیئر بم اگر انجن کے ایک سڑوک کے طور پر استعمال کیا جائے تو خلا میں چلنے والی موٹر بوٹ کی رفتار کا کیا حال ہوگا۔ ہم جانتے ہیں کہ ایک ایٹم بم میں کتنی توانائی ہوتی ہے۔ اگر ایک بم انجن کا ایک سڑوک ہو اور عام گاڑی کے انجن کی طرح بم پھٹتے رہیں اور پھٹ پھٹ ہوتی رہے تو آپ اندازہ لگائیے کہ خلا میں چلنے والی موٹر بوٹ روشنی کے قریب رفتار حاصل کر لے گی یا نہیں؟ پراجیکٹ ڈیکڈالس (Project Decdalus) ایک جدید منصوبہ ہے جو امریکی انگریزوں نے تیار کیا ہے۔ اس میں ایندھن کے لیے ایک نیوکلیائی بھٹی کا استعمال کیا جائے گا۔ جس سے زمین کے خلائی جہاز روشنی کی رفتار کا دس فیصد حاصل کر لیں گے۔ اور ''ایلفا سینچری'' ستارے تک جو ہم سے ساڑھے چار نوری سال کے فاصلے پر ہے ہم پینتالیس سال کے عرصہ میں پہنچ سکیں گے۔ ابھی یہ ممکن نظر نہیں آتا کہ ایسے جہاز 21 ویں صدی کے وسط تک بنائے جا سکیں گے۔ اس موقع پر کارل ساگان یوں لکھتا ہے:۔

''حالانکہ ایسے جہاز ہم آج بھی بنا سکتے ہیں۔ لیکن ستاروں کے سفر کے لیے ہمیں اور بھی بہت کچھ کرنا پڑے گا۔ کیونکہ یہ جہاز کئی نسلوں کا مسئلہ ہوں گے۔ جب یہ جہاز واپس آئیں گے تو یہاں ان کی کئی نسلیں گزر چکی ہوں گی۔ جو صدیوں پہلے یہاں سے روانہ ہوئے تھے۔ اور شاید انسان کو محفوظ رکھنے کا کوئی طریقہ دریافت کرنا پڑے گا کہ خلائی جہاز کے مسافروں کو جما دیا جائے اور صدیوں بعد وہ منزل پر دوبارہ جاگیں۔''

لیکن میرے خیال میں اس طرح کی باتیں بھی سائنس فکشن کا حصہ ہیں۔ سائنس فکشن ایک لحاظ سے اچھی چیز بھی ہے کہ اس سے قوم کے بچوں میں سائنسی شعور جنم لیتا ہے لیکن سائنس فکشن کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس میں انتہا درجہ کی مبالغہ آرائی پائی جاتی ہے۔ گویا بات کا بتنگڑ بنا دیا جاتا ہے۔ میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ ٹائم ڈائی لیشن کا مسئلہ دراصل ہمارے فہم شعوری کی خامی ہے۔ ہم اپنے اس بدن کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں جیسا کہ باقی جاندار چاہتے ہیں۔ ہم، ہمہ وقت موت سے ڈرتے ہیں، جیسا کہ باقی جانور ڈرتے ہیں۔ ہم ہمہ وقت محتاط رہنا چاہتے ہیں، جیسا کہ باقی جانور کرتے ہیں۔ ایک بیٹھی ہوئی بکری کے عقب سے جا کر زمین پر زور سے پیر ماریں تو وہ بری طرح ڈر کر اٹھ کھڑی ہوگی۔ اسی طرح ذرا سا ہاتھ اوپر اٹھائیں تو دیوار پر بیٹھا کوا مارے ڈر کے فوراً اڑ جائے گا۔ بکری کو فارسی میں ''بز'' کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے انسان کو جو ڈرتا ہو ''بزدل'' کہتے ہیں، یعنی بکری کے دل والا۔ ثابت ہوا کہ خوف خالصتاً حیوانی خصلت ہے اور میں اب تک قرآن وحدیث سے جتنا کچھ سمجھ پایا ہوں وہ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ ہمیں ہر طرح کے خوف سے نجات حاصل کرنے کا حکم دیا گیا۔

Marfat.com

ٹائم ڈائی لیشن سے ڈرنے والے اپنے جسموں کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ اس لیے ان کے فہم میں ٹائم ڈائی لیشن کی اصل صورت داخل نہیں ہو رہی۔ میں کوئی ماہر طبیعات تو نہیں، لیکن پھر بھی میں نے ایک حرکت ہوئے جسم پر ایک اور حرکت کرتے ہوئے جسم کو رکھا اور یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ دو' ریلٹو (Relative) حرکتوں کے مابین ٹائم ڈائی لیش کی کیا کیفیت ہے؟ میں نے کمپیوٹر کے ایک 3D پروگرام میں حرکت کرتے ہوئے کئی اجسام کو ایک دوسرے پر سوار کر کے ان کی ریلٹو حرکتوں کا بخوبی جائزہ لیا۔ اگرچہ اس طرح میں، کسی سائنسی نتیجے پر تو نہیں پہنچ سکتا تھا کیونکہ زمین پر دو ریلٹو اجسام کے مابین ریلٹوٹی کا تناسب اتنے کم فرق کے ساتھ ہوتا ہے کہ اُسے نوٹ کرنا قریب قریب ممکن نہیں۔ مزید تفصیل آپ اگلے مضمون میں ملاحظہ کریں گے۔ بہرحال آپ بھی ایسا کر سکتے ہیں۔ کسی بھی 3D پروگرام مثلاً مایا (MAYA) یا 3D MAX وغیرہ میں آپ ایسے آبجیکٹ آسانی سے بنا سکتے ہیں جو ایک دوسرے کی پشت پر سوار ہوں اور اپنی اپنی جگہ سب حرکت کر رہے ہوں۔ تو آپ دیکھیں گے کہ ریلٹو (Relative) حرکت کی وجہ سے ان کی رفتاروں کی نسبتیں حسابی طریقے سے معلوم کی جا سکیں گی۔ اگر تمام اجسام ایک ہی سمت میں ایک ہی رفتار سے سفر کر رہے ہوں تو بہت ہی عجیب نتیجہ سامنے آئے گا۔ آپ دیکھیں گے کہ تمام جسم ایک ہی رفتار سے ایک ہی سمت میں حرکت کر رہے ہیں اور ایک ہی وقت میں مختلف جسم مختلف فاصلہ طے کرتے ہیں۔ یہ بہت عجیب بات ہے۔ جب رفتار ایک ہو مثلاً ساٹھ کلو میٹر فی گھنٹہ، سمت اور وقت بھی ایک ہو حتیٰ کہ سطح بھی ایک، تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی جسم زیادہ فاصلہ طے کرے اور کوئی کم۔ آپ موٹر وے پر ایک ہی رفتار سے چلنے والی دو کاروں کے بارے میں سوچیے! مثلاً دونوں کاریں ایک ہی رفتار سے اسلام آباد کی جانب جا رہی ہیں۔ ان

Marfat.com

کی رفتار سو کلومیٹر فی گھنٹہ ہے۔ سو کلومیٹر فی گھنٹہ کا مطلب ہے کہ وہ دونوں ایک گھنٹے میں سو کلومیٹر فاصلہ طے کریں گی۔ پھر یہ کیونکہ ممکن ہے کہ ایک کار تو سو کلومیٹر فاصلہ طے کرے اور دوسری دو سو کلومیٹر۔ یہ ایک ناممکن بات ہے۔ لیکن نظریۂ اضافیت کی رو سے یہ ممکن ہے۔ بشرطیکہ اجسام کی حرکت کو آپس میں ریلٹو (Relative) کر دیا جائے۔ اسے آپ ایک مثال سے سمجھیے! مثلاً ایک فٹ لمبا ایک مستطیل مشینی ڈبہ اپنے سے دوگنے یعنی دو فٹ لمبے مشینی ڈبے کی پشت پر سوار ہے۔ اور سو کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے حرکت کر رہا ہے۔ اب ذرا آگے بڑھیے! وہ دو فٹ لمبا مستطیل مشینی ڈبہ جس کی پشت پر ایک فٹ والا ڈبہ سوار ہے.......... ایک تیسرے ڈبے کی پشت پر اسی رفتار سے حرکت کر رہا ہے۔ یہ تیسرا ڈبا دوسرے ڈبے کا دوگنا ہے اور اسی کی پشت پر دو فٹ والا ڈبہ اسی رفتار سے آگے بڑھ رہا ہے.......... اب ایک قدم اور آگے بڑھیے! اور یہ دیکھئے کہ تیسرا ڈبہ ایک چوتھے ڈبے پر رکھا ہے۔ جبکہ ان کی آپس میں پیمائش نسبتی حرکت اور رفتار ایک جیسی ہے۔ گویا ایک نسبت دو، دو نسبت چار، چار نسبت آٹھ، آٹھ نسبت سولہ وغیرہ وغیرہ۔ اب ہم اپنی بنائی ہوئی اس مشین کو زمین پر کھڑے ہو کر دیکھتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سب سے اوپر والا ڈبہ جس کے پاس حرکت کرنے کے لیے صرف دو فٹ جگہ تھی اپنے نچلے ڈبوں کی وجہ سے بہت آگے تک چلا گیا۔ جب سب سے نچلے ڈبے نے تھوڑی سی حرکت کی تو سب سے اوپر والا ڈبہ بہت زیادہ آگے جا چکا تھا۔ حالانکہ دونوں ایک ہی مقام سے شروع ہوئے تھے۔ دونوں کی رفتار بھی ایک جیسی تھی۔ لیکن ایک ہی وقت میں نچلے ڈبے نے تو تھوڑا سا فاصلہ طے کیا۔ لیکن اوپر والے ڈبے نے سب سے زیادہ فاصلہ طے کیا۔

آپ خود تجربہ کر کے دیکھ لیں۔ یہ ایک بہت آسان اور سادہ سا تجربہ ہے۔ ہم

چاہیں تو ڈبوں کی تعداد بڑھا کر اس مقام تک جا پہنچیں۔ جب سب سے اوپر کا ڈبہ ایک سیکنڈ میں تین لاکھ کلومیٹر کا فاصلہ طے کرے۔ حالانکہ سب سے نچلا ڈبہ اس وقت ایک سیکنڈ میں شاید صرف ایک کلومیٹر فاصلہ طے کرے گا۔ ہوتا یہ ہے کہ سب ڈبوں کی رفتاریں اور فاصلے آپس میں جمع ہو جاتے ہیں۔ لیکن انتہائی معمولی فرق کے ساتھ اور یہی فرق اضافیت ہے۔ چنانچہ سب سے اوپر والا ڈبہ تھوڑے وقت میں زیادہ فاصلہ طے کرتا ہے۔ اور سب سے نیچے والا ڈبہ زیادہ وقت میں تھوڑا فاصلہ طے کرتا ہے۔ مثلاً ایک سیکنڈ میں نیچے والا ڈبہ ایک کلومیٹر فاصلہ طے کرتا ہے تو اسی سیکنڈ میں اوپر والا ڈبہ تین لاکھ کلومیٹر فاصلہ طے کرسکتا ہے۔ اس طرح ایک ہی وقت اور ایک ہی رفتار میں دو اجسام مختلف فاصلہ طے کرتے ہیں۔ اب ہم دلچسپ بات کی طرف آتے ہیں۔ اگر ہم سب سے اوپر والے مشینی ڈبے میں بیٹھے ہیں تو زمین کے حوالے سے ہماری رفتار 3 لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ گویا روشنی کی رفتار ہوگی۔ لیکن ڈبے میں بیٹھے ہوئے افراد خود کو تیز رفتار محسوس نہیں کریں گے۔ وجہ صاف ظاہر ہے۔ ان کا ڈبہ تو اپنی سطح پر اسی مخصوص رفتار سے چل رہا ہے جو سب سے نچلے ڈبے کی ہے۔ جس قدر آرام سے نچلے ڈبے میں بیٹھے ہوئے لوگ سفر کریں گے بالکل اسی آرام اور اطمینان سے اوپر والے ڈبے میں بیٹھے ہوئے لوگ بھی سفر کریں گے۔ لیکن حیرت یہ ہے کہ ایک سیکنڈ کے عرصے میں وہ تین لاکھ کلومیٹر کا فاصلہ طے کریں گے۔ حالانکہ سب سے نچلے ڈبے والوں نے ایک سیکنڈ میں صرف ایک کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اوپر والوں کا یہ کہنا کہ ہمارا وقت تھم گیا ہے سیکنڈ ہے کہ گزرتا ہی نہیں۔ ہم آرام سے سفر کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ تین لاکھ کلومیٹر کے علاقے کی ہم نے بہ اطمینان سیر کر لی۔ ایک ایک چیز کو اسی طرح دھیان سے دیکھا جس

Marfat.com

طرح سب سے نچلے ڈبے میں بیٹھے لوگوں نے اطمینان سے اپنے اردگرد کی اشیاء کو دوران سفر دیکھا تھا.......... تو اوپر والوں کا ایسا کہنا بے جا نہ ہوگا۔ واقعی ان کا وقت تو تھم گیا ہے۔ بہت ہی تھوڑا وقت گزرا۔ لیکن انہوں نے بہت ہی زیادہ سیر کرلی۔ کیونکہ ان کی حرکت دوسرے حرکت کرتے ہوئے اجسام کی پشت پر تھی۔ گویا خود تو وہ عام سی حرکت کر رہے تھے۔ لیکن ان کے نیچے والوں کی حرکت نے انہیں بہت آگے تک پہنچا دیا لیکن اس طرح کے مشینی ڈبے حقیقت میں بنانا، شاید زمین پر آسانی سے ممکن نہیں، کیونکہ ایک دوسرے پر سوار ہوتے ہی نچلے ڈبوں کی رفتار آہستہ ہو جائے گی، بوجہ کشش ثقل۔ ہمارے پاس اس کے ثبوت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج کی شہادت موجود ہے۔ آپؐ ''البراق'' پر سوار ہو کر پوری کائنات کی سیر کرنے کے لیے نکلے۔ آپ نے نہایت اطمینان کے ساتھ پوری کائنات کی سیر کی۔ کہیں بھی آپ کو جانے کی .... جلدی نہ تھی۔ آپؐ پوری تسلی سے ایک ایک چیز اور ایک ایک مقام کا مشاہدہ کرتے ہوئے سموات کو دیکھتے رہے۔ آپ نے سدرۃ المنتہیٰ اور عرش معلیٰ کی سیر کی۔ یہ تمام کام شاید ہم کسی مشین میں بیٹھ کر کریں اور زمینی دنوں کے حساب سے جمع تفریق کریں تو کروڑوں، اربوں سال کا عرصہ بیت جائے۔ لیکن جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم معراج سے واپس لوٹے اور البراق (C^2) سے نیچے اترے تو ابھی زمین پر ایک لمحہ ہی مشکل سے بیتا تھا۔ حدیث میں آیا ہے کہ وہ پانی جس سے آپؐ نے وضو کیا تھا ابھی بہہ رہا تھا اور دروازے کی کنڈی ابھی ہل رہی تھی۔

میں حیران ہوتا ہوں جب دامن اسلام میں ایسے ایسے جدید نظریات کو خوابیدہ دیکھتا ہوں۔ جنہیں معلوم کرنے کے لیے امریکی سائنسدان کروڑوں ڈالر خرچ کر دیتے ہیں۔ میں نے نظریۂ اضافیت کا مطالعہ کیا تو میرے سیکھنے کا انداز اور تھا۔ میرے

Marfat.com

سامنے معراج کا واقعہ تھا۔ جبکہ ٹائم ڈائی لیشن والوں کا یہ کہنا ہے کہ کائنات میں جانے والوں کا وقت تو نہیں گزرے گا لیکن زمین پر رہنے والے گزر جائیں گے حتیٰ کہ زمین فناء ہو جائے گی اور جب خلاوالے واپس آئیں گے تو زمین اپنی جگہ پر نہیں ہوگی۔ لیکن معراج سے ثابت ہوتا ہے کہ وقت دونوں کا ایک جیسا گزرے گا حتیٰ کہ کیفیت بھی دونوں کی ایک جیسی رہے گی یعنی دونوں ہر چیز کا مشاہدہ اطمینان سے کرسکیں گے۔ البتہ خلاوالا لاکھوں کلومیٹر کا فاصلہ طے کرلے گا جبکہ زمین والا بہت کم۔

ریلٹوٹی (Relativity) کے نتیجے میں پیدا ہونے والی حرکت کا اثر فاصلوں پر پڑتا ہے نہ کہ وقت پر۔ معراج کے واقعہ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے اور ریلٹو اجسام ایک دوسرے پر رکھ کر حرکت دینے سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ کیا واقعی ایسا ہے کہ واقعۂ معراج اور جدید ٹائم ڈائی لیشن...... ایک دوسرے کے متضاد ہیں؟...... کیا واقعی ایسا ہے کہ سائنسدانوں کے بنائے ہوئے تیز رفتار راکٹ میں جب ہم روشنی کی رفتار سے سفر کریں گے تو ہمارا وقت نہیں گزرے گا اور زمین والوں کا گزر جائے گا؟...... اور کیا واقعی ایسا ہے کہ معراج رسالت کے وقت زمین پر ایک لمحہ بھی نہیں گزرا تھا جبکہ آپؐ پوری کائنات اور ماورائے کائنات کی سیر کر کے لوٹ آئے تھے؟

دراصل ان دونوں حقائق میں تضاد نہیں!...... واقعہ معراج سائنسدانوں کے انکشافات سے بہت آگے کی چیز ہے۔ سائنسدان تو یہ بھی تسلیم نہیں کرتے کہ کوئی شخص روشنی کی رفتار کا ۱۰۰ فیصد حاصل کرسکتا ہے۔ دیکھیے کارل ساگان کی عبارت:

> ''کائنات کی کوئی فزکس ہمیں روشنی کی رفتار کا ۹۹.۹۹ فیصد حاصل کرنے سے نہیں روک سکتی لیکن یہ آخری ۱۰۱ فیصد ہم کبھی حاصل نہیں کر پائیں گے''۔

Marfat.com

جبکہ معراج کے بارے میں میں نے بڑی تفصیل کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ رسول اکرمؐ کی رفتار روشنی کی رفتار کا مربع تھی، جسے قرآن کریم نے نورٌ علیٰ نور کہا ہے اور جسے آئن اسٹائین روشنی کی ولاسٹی کا مربع (C^2) کہتا ہے۔ چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ جب انسان روشنی کی رفتار کے سو فیصد سے گزر جاتا ہے تو اُس کے سامنے زمانے کے مرور اور مکان کی حرکت کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ یوں سمجھ لیجیے کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج حاصل کیا تو گویا پوری کائنات کا آنِ واحد میں ارتقاء ہو گیا...... یا یوں سمجھ لیجیے کہ وقت کی چرخی اتنی تیزی سے گھوم کر اپنے مقامِ حقیقی پر واپس آئی کہ کسی کو احساس ہی نہ ہو سکا، یا یوں سمجھ لیجیے کہ معراج کے وقت کائنات سمٹ کر ایک نقطے اور ایک لمحے میں تبدیل ہو گئی...... جسے ہم نہیں پہچان سکتے۔ آپ کو یہ باتیں بھی فکشن لگ سکتی ہیں لیکن اگر ہم سوچیں کہ مادی ماحول سے ماوراء...... ''خودی'' کا سفر یقیناً امریکیوں کے جہازوں سے مختلف ہوگا اور یقیناً اس کے نتائج اُن کے نتائج سے مختلف ہوں گے تو شاید بات ہماری سمجھ میں آ جائے۔ روشنی کی رفتار کا سو فیصد عبور کرتے ہوئے، وقت کی کہانی ایک مرتبہ پھر عجیب و غریب مظاہر دکھانے لگتی ہے۔

اب ایک مرتبہ پھر اسی اولین مثال کو دیکھیے جو میں نے اس باب کے شروع میں دی تھی۔ وال کلاک کی ایک سوئی جس کا ایک سرا زمین پر ہے اور دوسرا لاکھوں میل دور خلاء میں جب حرکت کرتی ہے تو اس کے مختلف نقاط ایک ہی وقت میں مختلف فاصلہ طے کرتے محسوس ہوتے ہیں۔ زمین پر موجود سرا شاید ایک ملی میٹر کا فاصلہ طے کرتا ہے تو آسمانوں میں موجود دوسرا سرا اسی وقت میں لاکھوں کلومیٹر۔ حالانکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا، بس ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے۔ ہم کرۂ کائنات کے کسی نہ کسی رداس کے کسی نہ کسی نقطے پر ہیں۔ کائنات کے بعض حوالوں (Frams of Reffrences) سے شاید ہم اب بھی روشنی کی رفتار پر ہوں۔ اور کائنات کی بعض چیزیں ہمارے حوالے سے

شاید روشنی کی رفتار پر ہوں۔ مختصراً ہم یہی کہیں گے کہ کائنات کی ہر چیز دوسری چیز کے حوالے سے مختلف رفتار میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کائنات کو ناظر کے لیے اضافی کہا جاتا ہے۔ آئین سٹائین ہوں یا دیگر مذہبی .... ان سب کا المیہ یہ ہے کہ یہ متشابہات کی اتباع کرتے ہیں۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:۔

فاما الذین فی قلوبھم زیغ فیتبعون ماتشا بھا منہُ ابتغاء الفتنہ۔

ترجمہ:۔ جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے تو وہ اُن (آیات) کی اتباع کرتے ہیں جو متشابہ ہیں تا کہ فتنہ برپا کریں۔

یہ لوگ حقیقت کی طرف بڑھنے کے لیے متبادل راستے اختیار کرتے ہیں۔ جب آئین سٹائین نے نظریاتی طور پر مادے کا بت توڑ دیا۔ تو انھوں (مغربی مفکرین) نے قانون بقائے مادہ کی جگہ قانون بقائے توانائی کو دے دی، اور یہ کہہ دیا کہ:۔

''اس کائنات میں توانائی کی مقدار ہمیشہ یکساں رہتی ہے۔ یہ توانائی کبھی مادہ بن جاتی ہے اور کبھی پھر سے توانائی۔ ازل سے یہ عمل جاری ہے۔ یہ کائنات نہ جانے کتنی بار اسی طرح بنائی اور مٹائی جا چکی ہے۔''

اس نظریے کو اصطلاحاً ''رجعت ابدی'' کا نظریہ کہتے ہیں جسے علامہ اقبالؒ نے کبھی پسند نہیں کیا۔ اس نظریے کا بانی ''الیگزینڈر سولزنیٹسن المعروف نیٹشے'' تھا۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں رجعت ابدی پر ان الفاظ میں بات کی ہے:۔

البتہ ایک نظریہ ہے جو فکر جدید نے بقائے دوام کے بارے میں قائم کیا ہے۔ ہمارا مطلب ہے نٹیشے کا عقیدہ رجعت ابدی۔ جو صرف اس لیے غور طلب نہیں کہ نٹیشے نے اسے ایک پیغمبرانہ جوش

کے ساتھ پیش کیا۔ بلکہ اس لیے بھی کہ آج کل کی طبائع کا رجحان فی الواقعہ اسی جانب ہے۔ (حیات بعد الموت کی حمایت میں)۔ دراصل رجعت ابدی کا خیال ایک ہی وقت میں متعدد انسانوں کے دل میں پیدا ہوا۔ چنانچہ اس کے کچھ مبادیات ہربرٹ اسپنسر میں بھی موجود تھے۔ لیکن یہ اس خیال کی اندرونی قوت تھی نہ کہ اس کی منطقی صحت جس سے نیٹشے کا ذہن متاثر ہوا۔ اور جو پھر اس امر کا ثبوت ہے کہ حقائق کی کنہ اور ماہیت کے بارے میں ہم جو نظریات قائم کرتے ہیں فیضان باطن کی بناء پر کرتے ہیں۔ مابعد الطبیعی غور وفکر کے زور پر نہیں کرتے۔ بایں ہمہ نیٹشے نے یہ خیال چونکہ ایک باقاعدہ اور مدلل نظریے کی شکل میں پیش کیا ہے۔ اس لئے ہم اس کی تحقیق میں حق بجانب ٹھہرتے ہیں۔ رجعت ابدی کی بناء اس مفروضے پر ہے کہ کائنات میں توانائی کی مقدار ہمیشہ یکساں رہتی ہے۔ لہٰذا ہم اسے متناہی ٹھہرائیں گے۔ مکان صرف ایک صورت باطنی ہے۔ (یعنی وہ صرف ہمارے ذہن کی تخلیق ہے خارج میں اس کا کوئی وجود نہیں) اور اِس لیے کائنات کے وقوع فی المکان کا یہ مطلب نہیں کہ وہ خلائے محض میں واقعہ ہے۔ ایسا کہنا ایک بے معنی سی بات ہوگی۔ رہا زمانے کا تصور سو اس میں نیٹشے نے کانٹ اور شوپن ہاؤر دونوں کے خلاف یہ رائے قائم کی کہ اس کا تعلق محض ہمارے داخل سے نہیں (یعنی اس کا وجود خارجی اور حقیقی ہے) وہ ایک حقیقی اور لامتناہی عمل ہے جسے دوری

Marfat.com

ہی ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ لہٰذا مکان کے لامتناہی خلاء میں توانائی کے زوال اور فساد کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ یوں بھی اس توانائی کے مراکز چونکہ باعتبارِ تعداد محدود ہیں اس لیے ہم اُن کے امتزاجات کا بھی بآسانی تخمینہ کر سکتے ہیں۔ مزید یہ کہ اس دواماً فعال توانائی کا نہ کوئی آغاز ہے نہ انجام۔ نہ اس میں توازن کا سوال پیدا ہوتا ہے نہ کسی پہلے اور آخری تغیر کا۔ زمانہ لامتناہی ہے اور اس لیے توانائی کے جتنے بھی ممکن امتزاجات ہیں سب کے سب ظہور میں آ چکے ہیں۔ کائنات کا کوئی حادثہ نیا حادثہ نہیں جو کچھ ہو رہا ہے پہلے بھی ہو چکا ہے۔ ایک نہیں کئی بار اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔ لہٰذا نیٹشے کے اس نظریے کی رُو سے حوادثِ کائنات کی ترتیب مقرر بھی ہے اور ناقابل تغیر و تبدل بھی۔ اس لیے کہ زمانے کی اس لامتناہی مدت میں جس کا گزر ہو چکا ہے توانائی کے جملہ مراکز بھی اپنے طور طریق کا ایک قطعی راستہ اختیار کر چکے ہوں گے۔ لفظ ''رجعت'' کا زور بھی دراصل اسی قطعیت پر ہے۔ لہٰذا یہ ماننا لازم آئے گا کہ مراکز توانائی کا وہ امتزاج جو ایک مرتبہ ظہور میں آ چکا ہے اس کا بار بار ظہور ناگزیر ہے۔ ورنہ اس امر کی کوئی ضمانت نہیں کہ فوق البشر کی رجعت یقینی ہے۔''

اس کے بعد علامہ اقبالؒ نے نیٹشے کے اپنے الفاظ کا حوالہ دیا۔ نیٹشے کے الفاظ یہ ہیں:

''ہر شے واپس آ چکی ہے۔ شعریٰ اور مکڑی! اور یہ خیالات جو

اس وقت تیرے دل میں ہیں اور یہ تیرا آخری خیال کہ ہر شے واپس آئے گی۔ اے میرے ہم جنس! تیری ساری زندگی شیشہء ساعت کی طرح پُر اور خالی ہوتی رہے گی اور یہ حلقہ جس میں تیری حیثیت ایک دانہء ریگ سے زیادہ نہیں۔ ہمیشہ رخشاں اور نمایاں رہے گا۔''

نیٹشے کے اپنے الفاظ پیش کرنے کے بعد علامہ اقبال نے اُس کے نظریے پر تنقید کی:

''یہ ہے نیٹشے کا عقیدۂ رجعت ابدی۔ جسے گویا ایک نہایت کڑی میکانیت سے تعبیر کرنا چاہیے۔ (یعنی علت و معلول کے ایک سلسلے میں، جس میں انسان مجبورِ محض ہے) اور جس کی بناء کسی ثابت شدہ حقیقت کی بجائے سائنس کے ایک ایسے مفروضے پر جس سے محض کام لینا درکار تھا۔ زمانے کے مسئلے پر بھی نیٹشے نے کماحقہ غور نہیں کیا۔ وہ اس کو خارجی قرار دیتا اور یہ سمجھتا ہے کہ زمانہ عبارت ہے حوادث کے اُس لامتناہی سلسلے سے جس کا تکرار ہمیشہ جاری رہے گا۔ حالانکہ زمانے کی حرکت کو دوری ٹھہرایا جائے تو بقائے دوام کا تصور ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔ جس کا خود نیٹشے کو بھی احساس تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حیات بعد الموت کے اس نظریے کو حیات بعد الموت کی بجائے ایک ایسے نظریے سے تعبیر کرتا ہے جس کی بدولت حیات بعد الموت کا تصور قابل برداشت ہو جاتا ہے۔''

Marfat.com

علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ہم نے نیٹشے کا نظریہ اس مضمون میں اس لیے دیکھا کہ یہی وہ نظریہ تھا جس نے آئن سٹائن کی ضرب سے گرتی ہوئی مادے کی عمارت کو وقتی طور پر سہارا دیا۔ نیٹشے کا نظریہ موجود تھا۔ جب آئن سٹائن نے $E=mc^2$ پیش کر کے مادے کی دھجیاں اڑائیں تو دہریت پسند مفکرین نیٹشے کی جانب لپکے اور قانون بقائے مادہ کی جگہ قانون بقائے توانائی نے لے لی۔ یہ گویا کان کو الٹے ہاتھ سے پکڑنے والی بات تھی۔ اگر نیٹشے کا نظریہ مادے کی عمارت کو سہارا نہ دیتا تو $E=mc^2$ سے مادے کا بت پوری طرح مسمار ہو چکا تھا۔ ہمیشہ مستقل توانائی کے تصور نے مادہ پرستوں کو حوصلہ دیا اور انہوں نے کہا کائنات میں مادے کی مقدار کل "10^{80}" ایٹم ہے اور $E=mc^2$ کی رو سے یہ ایٹم کسی بھی وقت توانائی میں بدل سکتے ہیں لیکن توانائی کی مقدار ہمیشہ یکساں رہتی ہے۔ چنانچہ وہ پھر مادہ بن جاتی ہے اور دوبارہ بھی 10^{80} ایٹم ہی بناتی ہے۔ یہ عمل ازل سے جاری ہے اور کھرب ہا مرتبہ دوہرایا جا چکا ہے۔ چنانچہ ہر ایٹم نے اپنی پیدائش سے لے کر خاتمہ تک اپنی تمام منزلیں زبانی یاد کر رکھی ہیں۔ اس لیے ہر چیز بار بار بنائی جا رہی ہے۔ ہم پہلے بھی لاکھوں بار اسی طرح پیدا کیے جا چکے ہیں اور پھر بھی اسی طرح پیدا کیے جاتے رہیں گے ہم جیسے اس دنیا میں آئے، ہم نے یہاں جو کچھ کیا حتیٰ کہ جو کچھ سوچا یہ سب کچھ پہلے بھی بار ہا مرتبہ دوہرایا جا چکا ہے اور آئندہ بھی ہمیشہ ہمیشہ دہرایا جاتا رہے گا۔ یہ ہے نیٹشے کا نظریہ رجعت ابدی جسے علامہ اقبالؒ نے بدترین قسم کی تقدیر پرستی سے بھی برا نظریہ کہہ کر پکارا ہے۔ علامہؒ عمر بھر نیٹشے سے متاثر بھی رہے اور ناراض بھی۔ اپنے ایک شعر میں علامہ اقبالؒ نے نیٹشے کو "مجذوبِ فرنگی" کہہ کر پکارا لیکن ساتھ ہی اُس کی غلط فہمیوں کی طرف اشارہ بھی کر دیا۔

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اِس زمانے میں
تو اقبال اُس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے؟

Marfat.com

رجعت ابدی کے مقابلے میں علامہ اقبالؒ کا نظریہء ارتقائے خودی ایک لازوال اور زندہ و جاوید نظریہ ہے جس کی رو سے ارتقائے کائنات مادے کا محتاج نہیں اور نہ ہی مکان کا۔ ایٹموں کی تعداد اگر 10^{80} ہے تو یقیناً ایٹموں کی تقدیر لکھی جا چکی ہے لیکن کیا انسانی خودی ایٹموں کا مجموعہ ہے۔ جو مادے کی خصلتوں کے زیر اثر رہے؟ تقدیر کا پابند تو مادہ ہو سکتا ہے انسان نہیں۔ کیونکہ انسان صرف مادہ نہیں بلکہ مادہ و روح دونوں کا مجموعہ یعنی خودی ہے۔

تقدیر کے پابند نباتات جمادات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

آئین سٹائن کے نظریہ اضافیت سے ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اہل مغرب مادیت کے مقابلے میں روحانیت کی طرف مائل ہوتے لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ البتہ آئین سٹائن خود اپنی کتاب ''Out of my later years'' میں اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اصل حقیقت محض روح ہے۔ نہ جانے اہل مغرب کب تک اپنے آپ کو دھوکہ دیتے رہیں گے۔ حق تو یہ ہے کہ وہ فراخ دلی سے سچائی کا سامنا کریں اور مادیت کو مسترد کر کے ایک ایسا نظریہ اختیار کریں جو مادے کی تسخیر کے ذریعے بالآخر قلب انسانی کی پوشیدہ توانائیوں تک پہنچا دیتا ہے۔ یہ نظریہ قرآن کا نظریہ ہے۔

آئین سٹائن کا نظریہء اضافیت دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک...... Spacial theory of relativity کے نام سے اور دوسرا...... General Theory of Relativity کے نام سے جانا جاتا ہے۔ سپیشل تھیوری میں آئین سٹائن نے حرکت کرتے ہوئے اجسام کے مابین اضافیت (Relativity) کو بیان کیا ہے اور یہ اعلان کیا ہے کہ روشنی کی رفتار کے قریب سفر کرتے ہوئے اجسام کی رفتار ایک دوسرے میں جمع نہیں کی جا سکتی اور یہ کہ روشنی کی رفتار کے قریب سفر کرتے ہوئے

Marfat.com

جسم کا وقت روشنی کی رفتار سے کم حرکت کرتے ہوئے جسموں کے وقت کے مقابلے میں بہت کم گزرتا ہے۔

اس کے ساتھ ''جنرل تھیوری آف ریلیٹیوٹی'' میں آئین سٹائن نے کشش ثقل کے ذریعے یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ اجسام اور اجسام کی حرکت اضافی (Relative) ہے۔ جنرل تھیوری کی رو سے ایک حرکت کرتا ہوں جسم جس سمت میں حرکت کرتا ہے، اس کی مخالف سمت میں ردعمل پیدا ہونے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ اس پر رکھی ہوئی اشیاء اتنی ہی قوت سے جتنی قوت سے جسم حرکت کر رہا ہے مخالف سمت میں دباؤ ڈالتی ہے۔ کشش ثقل کی قوت 9.8 میٹر فی سیکنڈ فی سیکنڈ ہے۔ خلاء میں موجود ایک راکٹ عام طور پر کشش ثقل (Gravitation) سے محروم رہتا ہے اور اس میں رکھی ہوئی اشیاء خلاء میں معلق ہو کر اڑتی پھرتی ہیں لیکن اگر ہم اس راکٹ کی رفتار بڑھا کر 9.8 میٹر فی سیکنڈ فی سیکنڈ کر دیں تو راکٹ کی سطح میں بھی زمین کی طرح کشش ثقل پیدا ہو جائے گی اور اُس میں موجود اشیاء جو معلق تھیں راکٹ کی سطح پر یوں آ گریں گی جیسے زمین پر گرتی ہیں۔ ٹھیک اُسی وقت جب راکٹ میں کشش ثقل پیدا ہو گی اُس پر پڑنے والی روشنی کی شعاع میں ہلکا سا خم آ جائے گا۔ حالانکہ جب راکٹ میں کشش ثقل نہیں تھی تو راکٹ پر پڑنے والی شعاع بالکل سیدھی اُس پر پڑتی تھی۔ گویا راکٹ میں مصنوعی کشش ثقل بھی زمین کی قدرتی کششِ ثقل جیسی تھی۔ کیونکہ زمین پر پڑتی ہوئی سورج کی شعاعیں بھی کشش ثقل کی وجہ سے خمدار ہوتی ہیں۔ ہم جوں جوں راکٹ کی رفتار بڑھاتے چلے جائیں گے اس میں کشش کی قوت بھی بڑھتی چلی جائے گی۔ کیا روشنی کی شعاعیں خم کھا جاتی ہیں؟ یا ہمارا دماغ انہیں ایسا محسوس کرتا ہے۔ جہاں تک روشنی کی شعاع کے رُخ بدلنے کا تعلق ہے تو اس کا جواب ہم پیچھے دے چکے ہیں۔ ر...

Marfat.com

کی شعاع جب کسی لطیف واسطے سے کثیف واسطے میں داخل ہوتی ہے تو اپنا رخ بدل لیتی ہے۔ پانی میں ٹیڑھی نظر آنے والی چھڑی اسی کی مثال ہے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اس طرح رُخ بدلنے سے روشنی کی شعاع کی رفتار پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یعنی یوں نہیں ہوتا کہ پانی میں داخل ہونے کے بعد اُس کی اپنی رفتار تین لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ سے کم ہو جائے۔ روشنی ہر چیز سے برابر کی رفتار کے ساتھ سفر کرتی ہے۔ روشنی کا یہ طرزِ عمل ایک روحانی توانائی کے طرزِ عمل جیسا ہے لیکن جب مختلف واسطوں میں اپنا رُخ بدلتی ہے تو اُس کا طرزِ عمل ایک مادی توانائی کے طرزِ عمل جیسا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سائنسدانوں نے روشنی کو دوہری فطرت (Duel Nature) کی حامل قرار دیا ہے۔ یعنی یہ مادی اور روحانی دونوں فطرتوں کا مظاہرہ کرتی ہے۔

کیا کششِ ثقل بھی ایک واسطہ ہے؟ جس میں داخل ہوتے ہی روشنی کی شعاع مڑ جاتی ہے جیسا کہ پانی میں داخل ہو کر وہ مڑ جاتی ہے۔ آئین سٹائن کی جنرل تھیوری سے پہلے تک یہ بات واضح نہیں ہوئی تھی لیکن جنرل تھیوری کے بعد اب یہ یقین کر لیا گیا ہے کہ کششِ ثقل (Gravitation) بھی اضافی ہے۔ اس کا تعلق بھی بنیادی طور پر حرکت کے ساتھ ہے۔ الغرض آئین سٹائن کے دونوں انکشافات سے یہی ایک نتیجہ نکلتا ہے کہ ''اس کائنات کی ہر چیز ناظر کے لیے اضافی ہے۔'' لیکن ایک بات یاد رہے کہ یہاں ناظر سے مراد کوئی ذی شعور ہستی نہیں بلکہ ہم کسی بے جان کیمرے کو بھی فریم آف ریفرنس (Fram of Reffrence) مانتے ہوئے ویسے ہی نتائج حاصل کر سکتے ہیں جو ایک ذی شعور آنکھ کو دکھائی دیں گے۔ کیونکہ اشیائے ظاہری کو دکھانے والی چیز روشنی ہے جو کیمرے کے لینز (Lens) پر ویسے ہی پڑتی ہے جیسی آنکھ کے لینز (Lens) پر۔ بہرحال آئین سٹائن کے نظریہء اضافیت نے کائنات کے بارے میں

Marfat.com

غور کرنے کے انسانی انداز کو ارتقاء بخش دیا اور حقیقت کے بارے میں سوچنے کا سائنسی اندازِ فکر یکسر بدل گیا۔ ہم نے علم الہیت کے مضمون میں xyz محور کو تفصیل سے سمجھایا اور یہ بتایا کہ ہم صرف اشیاء کا سہ جہتی (3d) ادراک رکھتے ہیں۔ ہم نے یہ بھی ثابت کیا کہ چوپائے دو جہتی (2d) اور حشرات یک جہتی (1d) ادراک کے حامل ہیں۔ یہ ہمارے ادراکات ہیں جو روشنی کی بدولت پیدا ہوتے ہیں۔ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ روشنی کی شعاع صرف وزیبل لائیٹ پر ہی مشتمل نہیں بلکہ چھ اور طرح کی بھی شعاعیں ہیں جو ہمیں دکھائی نہیں دیتیں۔ مثلاً انفراریڈ یا الٹرا وائیلٹ وغیرہ۔ ہم وزیبل لائٹ (Vilible Light) کی مدد سے چیزوں کو دیکھتے ہیں۔ اگر ہم اور طرح کی شعاعوں کی مدد سے چیزوں کو دیکھتے تو شاید اشیاء کی جہات بھی کچھ اور ہوتیں۔ الغرض گزشتہ تمام تر مضامین میں کی گئی بحثیں بالآخر ہمیں ایک ہی نتیجے پر پہنچاتی ہیں اور وہ یہ کہ کائنات ہے تو سہی لیکن جیسی ہم اپنے حواس کی مدد سے دیکھتے ہیں ویسی نہیں۔ ہمارے حواس بعینہٖ اُس چوپائے کے حواس کی طرح ناکافی ہیں جو تھری ڈائمنشنل (3 Dimentional) چیزوں کا ادراک نہیں کرسکتا۔ جب ہمارے حواس ہی ناکافی ہیں تو پھر ہم اپنے حواس کے نتائج کو حتمی کیوں قرار دیتے ہیں۔ دراصل ہمیں کسی ایسی حس کی ضرورت ہے جو ہمارے حواسِ خمسہ سے بہت بلند ہو اور جو اُن توانائیوں کی مدد سے حقیقت کی طرف بڑھے جو حواسِ خمسہ کی مدد سے ہمارے احاطہء شعور میں نہیں آسکتیں۔ جبکہ یہ بات تو ثابت ہے کہ ایسی توانائیاں موجود ہیں۔ ''غلام احمد پرویز'' نے ذاتِ سرمدیہ کے لیے 'الوہیاتی توانائی' کا الفظ استعمال کیا ہے۔ ہمیں اسی طرح کا ہی کوئی لفظ استعمال کرنا ہوگا تب شاید ہم تمام توانائیاں (فرشتے) اپنی گرفت میں لاسکیں لیکن الوہیاتی توانائی جو تمام توانائیوں کے علاوہ خود ہماری ذات کی خالق ہے۔ ہماری

Marfat.com

گرفت میں آئے گی تو اس طرح کہ ہم اُسے تسخیر نہیں کر پائیں گے۔ البتہ وہ ہماری آنکھوں کا نور بن جائے گی اور اُس کی بدولت ہم کائنات کے ہر غیب اور ظاہر کو دیکھ سکیں۔

لگتا ہے سائنس بھی تصوف کی گود میں پناہ لینا چاہتی ہے۔ نفسیات سائنس کا ایک مضمون ہے جو پچھلے ساٹھ برس سے میکانیکی سائنس کے غلبے کی وجہ سے بری طرح سر پیٹ رہا ہے۔ ایک ایسا گمراہ کن...... نہیں بلکہ راہ گم کردہ مضمون جس کا دعویٰ تو ہے کہ وہ ذاتِ انسانی تک رسائی حاصل کرے گا لیکن طرزِ عمل یہ ہے کہ وہ آج تک خود کو فزکس، کیمسٹری کے قواعد سے الگ نہیں کر پایا۔ یہ مضمون نفسیات ہی ہے۔ علامہ صاحبؒ نے اپنی کتاب میں نفسیات کو مشورہ دیا ہے کہ وہ نئے سائنسی طریقے دریافت کرے۔ جو انسانی ذات تک رسائی حاصل کرنے کے اہل ہوں۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

باب: ۵

فزکس اور میٹا فزکس

(Metaphysics)

بہت جلد ایسا وقت آنے والا ہے کہ فزکس اور میٹا فزکس دو الگ الگ مضمون نہیں رہیں گے بلکہ یہ دونوں ایک ہی مضمون بن جائیں گے۔ ہو سکتا ہے میری اس بات کو سن کر کوئی استہزائیہ انداز میں ہنس دے۔ کیونکہ فزکس اور میٹا فزکس بظاہر دو الگ الگ مضمون ہیں۔ میٹا فزکس کا مطلب ہی یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو فزکس سے بالاتر ہوگی میٹا فزکس کے احاطے میں آئے گی۔ اردو میں اس کے لیے طبیعیات کے مقابلے میں مابعد الطبیعیات کے الفاظ اسی بات کی وضاحت کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جدید طبیعیات کا اگلا قدم اور مابعد الطبیعیات کا اگلا قدم یعنی دونوں کے اگلے قدم اب ایک ہی منزل پر پڑنے والے ہیں۔ مجھے اپنے چشم تصور میں یوں لگتا ہے جیسے طبیعیات روشنی کے پارٹیکل والے (مادی) حصے میں کھڑی ہے اور مابعد الطبیعیات نان پارٹیکل والے (روحانی) حصے میں۔ اگر ہم آئن سٹائن کے مقابلے میں شیخ ''الاشراق شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے نظریات نور اور نور مجرد پر نظر ڈالیں تو ہمیں کچھ ایسا ہی محسوس ہوگا۔ غالباً شیخ الاشراق مابعد الطبیعیات والوں کے آئن سٹائن تھے۔ یا پھر ہم منطق کے قانون عکس کی رو سے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ آئن سٹائن طبیعیات والوں کا شیخ الاشراق تھا۔ دونوں طرف نے ماہرین، روشنی کا پرچم اٹھائے قدم بقدم حقیقت کی طرف بڑھتے چلے آئے۔ یہاں تک کہ اب یوں لگتا ہے کہ جیسے

Marfat.com

روشنی کی دوہری فطرت ان دونوں کو دو مختلف اطراف سے کھینچ کر کسی ایک شعاع نور کا حصہ بنا دے گی۔

اللہ نور السموت والارض............اللہ زمینوں اور آسمانوں کا نور ہے۔

ہم نے آتش پرستی کا ذکر کرتے ہوئے بڑی وضاحت کے ساتھ یہ بتایا تھا کہ آتش، مادی اور روحانی ہر دونوں قوتوں کا مشترکہ مظہر ہے۔ اس کا شعلہ مادہ نہ ہوتے ہوئے بھی مادہ ہے اور مادہ ہوتے ہوئے بھی مادہ نہیں ہے بعینہ یہی مشکل روشنی کی ہے۔ سورج کی روشنی کبھی تو سائنسدانوں کو مادی ذرات پر مشتمل دکھائی دیتی ہے اور کبھی ایک خالص روحانی لہر۔ آج تک کی تمام سائنس اس بات پر متفق ہے کہ روشنی دوہری فطرت کی مالک ہے۔ اسے سائنس کی زبان میں ڈوئل نیچر کہتے ہیں۔ غالباً یہی وہ مقام ہے جہاں فزکس اور میٹا فزکس اکٹھا ہونے والی ہیں۔

میٹا فزکس کا میدان عمل اشیائے مادی سے بالاتر ہے۔ لیکن مغرب میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو فزکس اور میٹا فزکس دونوں کی یکساں اہمیت کو سمجھتے ہیں۔ ولیم جیمز بھی ان میں سے ایک تھا وہ ایک ماہر مابعد الطبیعات تھا۔ اس کی مشہور زمانہ کتاب کا نام ہے............''مشاھدات مذہب کی گونا گونی''............

"Variety of Religious Experience"

علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں ولیم جیمز کا ذکر متعدد مرتبہ کیا ہے۔ یہ شخص نہ صرف ایک قابل فلسفی تھا بلکہ ایک درویش خدا مست اور کسی حد تک ایک سائنسدان بھی تھا۔ ولیم جیمز کی مندرجہ ذیل عبارت دیکھ کر آپ کے دل میں بھی یقیناً اس کے احترام کا جذبہ پیدا ہوگا۔ مشہور نفسیات دان پروفیسر ولیم جیمز کے مندرجہ ذیل خیالات علامہ اقبالؒ نے اپنی کتاب میں قوسین کے اندر درج کیے ہیں۔

Marfat.com

''سائنس کچھ بھی کہے، مجھے تو یوں نظر آتا ہے کہ جب تک دنیا قائم ہے دعا یا عبادت کا سلسلہ بھی قائم رہے گا۔ الا یہ کہ ہم انسانوں کی ذہنی ساخت میں کوئی تبدیلی پیدا ہو جائے، مگر جس کا جہاں تک ہمارے علم کا تعلق ہے، کوئی امکان نہیں۔ دراصل دعا کو تحریک ہوتی ہے تو اس لیے کہ اختباراً نفس انسانی کے اگرچہ کئی مراتب ہیں (مثلاً انزوا اور انفراد) بایں ہمہ اس کی تہوں میں ایک نفس اجتماعی پوشیدہ ہے۔ جسے اپنا سچا ہمدم (رفیق اعلیٰ) کسی مثالی دنیا میں ہی مل سکتا ہے .... لہٰذا کتنے انسان ہیں جو ہمیشہ نہیں تو اکثر اس ہمدمِ صادق کی تمنا اپنے سینوں میں لیے پھرتے ہیں اور جس کی بدولت ایک حقیر انسان بھی جسے بظاہر لوگوں نے دھتکار رکھا ہو محسوس کرتا ہے کہ اس کی ہستی بھی اپنی جگہ پر کچھ ہے۔ یہ اندرونی سہارا نہ ہو تو ان حالتوں میں جب ہمارا نفسِ اجتماعی ناکام ہو کر ہمارا ساتھ چھوڑ دیتا ہے، دنیا بہتوں کے لیے جہنم بن جائے۔ میں کہتا ہوں بہتوں کے لیے .... کیونکہ جہاں تک یہ احساس ہے کہ ایک اعلیٰ وارفع ہستی ہمارے اعمال و افعال کو دیکھ رہی ہے، بعض لوگوں میں تو بڑا قوی ہوگا، بعض میں خفیف۔ گو بعض طبیعتوں کی ساخت ہی ایسی ہے کہ ان میں یہ احساس بہ نسبت دوسروں کے زیادہ شدت کے ساتھ جاگزیں ہو۔ لہٰذا میں سمجھتا ہوں جتنا یہ احساس کسی دل میں قوی ہوگا۔ اتنا ہی مذہب سے اسے زیادہ گہرا لگاؤ ہوگا۔ لیکن پھر اس کے ساتھ

مجھے یہ بھی یقین ہے کہ جو لوگ اس سے انکار کرتے ہیں وہ اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں۔ کیونکہ تھوڑا ہو یا بہت یہ احساس ان کے اندر بھی موجود ہوگا۔''

آپ نے دیکھا نفسیات، دعا یا عبادت کو ایک جبلی امر سمجھتی ہے۔ ولیم جیمز نے اسی طرح کے اکتشافات کے ذریعے مادے کو روح اور روح کو مادے کے نزدیک کرنے کی کوشش کی۔ لیکن شاید قرآن کریم کا گہرا مطالعہ نہ ہونے کی وجہ سے ولیم جیمز اپنے مشن میں کامیاب نہیں ہوا۔ اور اس نے روحانی واردات کو شعور کے طبعی مرتبے سے الگ قرار دیا۔

مابعد الطبیعیات کے زیرِ عنوان زمان و مکاں کے وہ ماورائی تصورات بھی آتے ہیں جنہیں اہل کشف آج تک بیان کرتے رہے۔ امام ابن خلدون مابعد الطبیعیاتی نہیں تھے۔ لیکن علامہ اقبالؒ نے انہیں برگسان کا پیش رو کہا ہے۔ کیونکہ ابن خلدون نے زمانے کا وہ جدید ترین تصور پیش کیا جسے برگسان جیسا عظیم فلسفی بھی جھٹلا نہیں سکا۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ دیکھیے:

''ابن خلدون کو مابعد الطبیعیات سے مطلق دلچسپی نہیں تھی۔ بلکہ درحقیقت وہ اس کا مخالف تھا۔ (یعنی قیاسی مابعد الطبیعیات یا محض عقلیت کا جیسا کہ قدیم فلسفہ کا انداز تھا) بایں ہمہ اس نے زمانے کا تصور جس رنگ میں کیا ہم اس کے پیش نظر اس کا شمار برگسان کے پیش رؤں میں کریں گے۔ (جیسے خود اقبالؒ کے) اسلامی تہذیب و ثقافت کی تاریخ میں اس تصور کے ذہنی سوابق کی طرف ہم اس سے پہلے اشارہ کر آئے ہیں۔ قرآن مجید کا یہ ارشاد کہ

Marfat.com

''اختلاف لیل ونہار'' کو حقیقت مطلقہ کی، جس کی ہر لحظہ ایک نئی شان ہے (55:29 ۔ قرآن) ایک آیت تصور کرنا چاہیے۔ اسلامی مابعد الطبیعیات کا یہ رجحان کہ زمانہ ایک خارجی حقیقت ہے۔ ''ابن مسکویہؒ'' کا یہ نظریہ کہ زندگی عبارت ہے ایک ارتقائی حرکت سے اور آخرالامر ''بیرونی'' کا یہ صاف وصریح اور واضح اقدام کہ کائنات کا تصور بطور ایک عمل تکوین کے کرنا، یہ سب باتیں ابن خلدون کو ذہناً ورثے میں ملیں لہٰذا اس کا سب سے بڑا کارنامہ بھی یہ ہے کہ وہ اس تہذیب وتمدن کی روح کو خوب سمجھ گیا تھا جس کا وہ خود سب سے زیادہ روشن اور تابناک مظہر تھا اور یہی وجہ ہے کہ اس نے اس کی ترجمانی بھی بڑی باقاعدہ اور مرتب شکل میں کی۔ چنانچہ یہ اس کی ذہانت اور فطانت تھی کہ قرآن مجید کی روح جو سرتاسر یونانیت کے منافی ہے حکمت یونان پر ہمیشہ کے لیے غالب آ گئی۔ یونانیوں کے نزدیک زمانے کی یا تو کوئی حقیقت ہی نہیں تھی جیسا کہ زینو اور افلاطون کا خیال تھا یا یہ کہ وہ ایک دائرے میں گردش کرتا رہتا ہے۔ (جیسے ہندوؤں کا سنسار چکر) جیسا کہ ہراقِ بطوس اور رواقیین نے اس کا تصور کیا۔ حالانکہ ہم کسی تخلیقی حرکت کے پیش رس اقدامات پر جس معیار کے رو سے بھی حکم لگائیں گے اس حرکت کا تصور بطور ایک دائرے کے کیا گیا تو اس کی خلاقی کالعدم ہو جائے گی۔ دوامی رجعت، دوامی تخلیق نہیں ۔ اسے دوامی تکرار ہی کہا جائے گا۔

Marfat.com

''میرا خیال ہے اب شاید ہم بخوبی سمجھ گئے ہیں کہ عالم اسلام میں یونانی فلسفے کے خلاف ذہناً جو بغاوت پیدا ہوئی اس کی اہمیت کیا ہے۔ پھر یہ امر کہ اس بغاوت کا آغاز خالصاً الٰہیاتی نقطہ نظر سے ہوا اور یہ اس حقیقت کا بین ثبوت ہے کہ قرآن مجید کی روح چونکہ اساساً یونانیت کی ضد ہے لہٰذا بالآخر وہ اس پر غالب آئے گی۔ حالانکہ شروع شروع میں بعض افراد کی فی الواقعہ یہ خواہش تھی کہ قرآن پاک کی ترجمانی بھی فلسفۂ یونان ہی کی روشنی میں کریں۔''

حدیث مبارکہ کی رو سے کہ......... ولاتسبّو الدھر .... زمانے کو گالی مت دو کیونکہ زمانہ اللہ کی ہی ایک صفت ہے......... اسلامی مابعد الطبیعیات کا رخ ایک فعال ماحول کی طرف ہو جاتا ہے۔ زمانہ ہر آن ایک بالکل نئی صورت میں خود کو ظاہر کرتا ہے۔ جدید سائنس کے بقول زمانہ حوادث کا ایک مربوط نظام ہے، جو یکے بعد دیگرے رو پذیر ہوتے ہیں۔ لیکن اسلامی نقطۂ نگاہ سے یہ حوادث ہر آن ایک نئے جہان کی پیشگوئی کرتے ہوئے رونما ہوتے ہیں۔ قرآن کریم کے بقول:

''کل یوم ھو فی شان......''

ترجمہ:۔ ''ہر یوم میں اس کی ایک نئی شان ہے۔''

یہاں ''یوم'' کا ترجمہ کرتے ہوئے ہمیں ''زمانہ'' مراد لینے پر کوئی لغت نہیں ٹوکتی۔ ہم یوں کہہ سکتے ہیں ہر زمانے میں اس کی نئی شان ہے۔ لیکن زمانے کو ایک طویل العمر یا سن رسیدہ بزرگ کی طرح نہیں جاننا چاہیے۔ اس کا تعقل کرنے کے لیے ہمیں ایک لمحے کو تصور میں لانا ہوگا اور اس لحاظ سے ہمیں مذکورہ آیت کا یوں ترجمہ کرنا

Marfat.com

چاہیے کہ اس کی ''ہر آن نئی شان'' ہے۔ زمانے کا یہ تصور رجعت یا تکرار کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ یہی علامہ اقبالؒ کا زمانہ ہے۔ بقول شاعر:

ع زمانہ آنکھ سے اوجھل، مکان سامنے ہے
چھپی ہوئی ہے حقیقت، گمان سامنے ہے

میں عرض کروں گا کہ مکان کو تو ہم اشیاء کی مدد سے پہچانتے ہیں۔ مکان وہ ہوتا ہے جس میں اشیاء حرکت کریں۔ ہم یہاں سے وہاں تک نظر دوڑاتے تو ہمیں دور آسمانوں میں کہکشائیں اور ستارے دکھائی دیتے ہیں۔ جہاں تک اشیائے مادی پھیلی ہوئی ہیں وہاں تک مکان پھیلا ہوا ہے اور مادے کی کیا حقیقت ہے یہ تو ہم قبل ازیں دیکھ چکے ہیں۔ ظاہر ہے جب مادہ ہمارے لیے اضافی ہے تو مکان کیونکر مطلق ہوسکتا ہے۔ ایک مکڑی ایک بالشت فاصلے پر دیکھ سکتی ہے ہم کچھ دیر کے لیے مکڑی بن کر سوچیں تو ہمیں چاروں طرف ایک دائرے کی صورت صرف بالشت بھر دور پڑی اشیاء دکھائی دیں گی۔ اس وقت ہمارے لیے وہی مکان ہوگا۔ تو کیا ہم اسے مطلق کہہ دیں گے؟ یقیناً نہیں مکان کو مطلق سمجھنے والے فی الحقیقت اس مینڈک کی طرح ہیں جو ایک کنویں میں رہتا تھا اور یہی سمجھتا تھا کہ ساری کائنات یہی کنواں ہے۔ ایک دن باہر کی دنیا کا ایک مینڈک پھسل کر کنویں میں جا گرا۔ کنویں کے مینڈک نے حقارت سے اس کی جانب دیکھا اور اس سے پوچھا کہ تم کہاں سے آئے ہو۔ نو وارد مینڈک نے جواب دیا میں باہر کی بڑی دنیا سے آیا ہوں۔ تب کنویں کے مینڈک نے کہا۔ بڑی دنیا؟ کتنی بڑی دنیا؟ کیا اتنی بڑی؟ یہ کہہ کہ کنویں کے مینڈک نے ایک چھلانگ لگائی۔ نو وارد نے کہا نہیں یہ تو اس دنیا کا صرف ایک قدم ہے تب کنویں کے مینڈک نے دوسری چھلانگ لگائی، تیسری لگائی۔ نو وارد مینڈک مسلسل نفی میں سر ہلاتا رہا۔ یہاں تک کہ کنویں کے

مینڈک نے پورے کنویں کا چکر لگا لیا اور پھر غصے سے کہنے لگا نہیں یہ نہیں ہوسکتا یہ ناممکن ہے۔اس سے بڑی دنیا نہیں ہوسکتی۔

ہم مکان کو مطلق (Absolute) جان کر اس مینڈک کے سے طرزِ عمل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ جبکہ قرآن کریم کا نظریہ یہ ہے کہ کائنات خدائے قادر کی قدرتوں کا ایک معمولی سا کرشمہ ہے۔ یہ پوری کائنات مل کر بھی ریت کے صحرا میں ایک ذرے سے کم وقعت کی حامل ہے۔ کائنات کی ساری کہانی جو اربوں سال پر محیط ہے اللہ تعالیٰ کی آن بھی نہیں۔ یعنی اس سے بھی کم ہے۔ وہ ایک ایسی محیط اور برتر ذات ہے جس کا تصور، جتنے بھی وسیع ذہن کے ساتھ کیا جائے پھر بھی ہم اس ذات کا احاطہ نہیں کرسکتے۔ کیونکہ قرآن کے بقول وہ ہمیں احاطہ کیے ہوئے ہے۔ فزکس بیچاری ریت کے ایک صحرا میں چھوٹے سے ذرّے اور پھر اس چھوٹے سے ذرّے کو کائنات سمجھتے ہوئے اس کائنات میں موجود ستاروں اور سیاروں پر تحقیق کرسکتی ہے۔ لیکن مابعد الطبیعات اس ذرے سے باہر کا کھوج لگانا چاہتی ہے۔ نیٹشے کا نظریہ رجعت ابدی مغرب کی مابعد الطبیعات کا نقطۂ عروج ہے۔ اس نے دوامی زندگی کے لیے ایک ایسے تکرار کا تصور دیا جو ہمارے ایک ایک عمل کو لایعنی اور بے مقصد بنا دیتا ہے۔ مشرق میں علامہ اقبالؒ نے زمانے کا جو تصور قائم کیا بعض لوگوں کے بقول وہ برگسان سے مستعار لیا گیا ہے۔ لیکن بہت سے لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ علامہ اقبال کا تصور زمانہ قرآن وحدیث سے ماخوذ ہے۔ انھیں روسی صوفی ''اوسپنسکی'' کے اس خیال سے اختلاف تھا کہ زمانہ مکان کی بعد رابع ہے نہ کہ کوئی آزاد فعالیت۔ علامہ اقبالؒ کا یہ اعتراض درست تھا۔ آپ نے فرمایا کہ سال کی پیمائش ہم سینٹ پیٹرز برگ سے نہیں کرسکتے۔ کیونکہ یہ ہر سمت کے عمود میں واقع ہے، متوازی کسی سے نہیں، لیکن متوازی ممکن ہو جانے سے زمانے کی فعالیت پر

Marfat.com

کوئی فرق نہیں آتا۔ جیسا کہ علامہ اقبالؒ کو خدشہ تھا۔ دراصل بعد رابع کو مکان کی ایک جہت سمجھنا ایک مشکل کام ہے۔ ہم اسے مکان کا جزو نہیں کہہ سکتے جیسا کہ باقی جہات کو کہہ سکتے ہیں۔ یہ تو مکان میں جاری و ساری ہے۔ دراصل ہمیں زمانے کو مکان کا بعد سمجھتے ہوئے یہ غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ مکان کو اپنے ابعاد ثلاثہ کی وجہ سے زمانے پر فوقیت حاصل ہے۔ دراصل او سپنسکی نے زمانے کو مکان کی چوتھی بعد کہتے ہوئے "چار (۴)" کا جو عدد استعمال کیا ساری غلط فہمی نے اسی سے جنم لیا۔ زمانہ مکان کی چوتھی بعد نہیں ہے۔ ہم چاہیں تو اسے پہلی اور باقی ابعاد کو دوسری تیسری اور چوتھی کہہ سکتے ہیں۔ دراصل زمانہ مکان کی بدولت ہمیں محسوس ہوتا ہے اسی لیے مکان کو ہم اپنے تصور میں اولیت دیتے ہیں۔ ہم پچھلے ابواب میں بڑی تحقیق سے دیکھ چکے ہیں کہ مکان کے ابعاد حقیقی نہیں یا اگر حقیقی ہیں تو کم از کم ہمارے لیے اضافی ہیں۔ ہمیں جو کچھ دکھائی دیتا ہے سب کچھ ویسا نہیں۔ سب کچھ کسی اور طرح کا ہے۔ حقیقت تو یہ کہ ہمیں اپنے تصور کو بھی بتدریج کثیف سے لطیف کرنا ہوتا ہے۔ جس طرح کائنات کی ہر چیز کا رجحان کثافت سے لطافت کی طرف ہے مثلاً ایک پتھر جیسی جامد شے (لوہا پیتل یا کچھ اور) کو جب حرارت دی جاتی ہے تو وہ تیزی کے ساتھ کثافت سے لطافت کی جانب حرکت کرنے لگتی ہے۔ لوہا پگھل کر پہلے مائع بنتا ہے پھر مائع سے بتدریج گیس بن کر ہوا میں اڑنے لگتا ہے۔ پوری کائنات کی فطرت میں کثافت سے لطافت کی طرف بڑھنے کا رجحان ہے۔ نظریہ ارتقاء کے باب میں ہم نے دیکھا کہ زندگی کس طرح زمین کی پستیوں سے اٹھی اور طبق در طبق بلندیوں کی جانب بڑھتی چلی گئی۔ وہ کھجور بن کر اوپر اٹھی لیکن اسے مزا نہیں آیا۔ وہ پرندہ، حتیٰ کہ شاہین بن کر اوپر اٹھی لیکن اسے مزا نہیں آیا۔ بالآخر وہ انسان بن کر اوپر اٹھی تو مقام محمود تک جا پہنچی۔ تب تو اوپر اٹھنا انسانیت کے لیے اعزاز

Marfat.com

ہو گیا۔ آج امریکہ کے خلائی جہاز سب چیزوں سے بلندی پر ہیں اور کرہ ارض کی ہر چیز، ان سے پست ہے قرآن کا وعدہ ہے کہ اگر تم مومن ہو تو بلندی پر رہو گے۔ یا یوں کہیے کہ سب سے بلند رہو گے۔ "و انتم الاعلون ان کنتم مومنین .... اگر تم مومن ہو تو بلندی پر رہو گے۔"

مختصر یہ کہ کائنات کی ہر چیز کثافت سے لطافت کی طرف بڑھنے کا رجحان رکھتی ہے۔ زمانے کا تصور کرتے ہوئے بھی ہمیں اس ترتیب کو ملحوظ رکھنا ہو گا۔ مکان کثیف ہے کیونکہ مادے کی وجہ سے وہ ہمیں دکھائی دیتا ہے اور زمانہ لطیف کیونکہ وہ اپنی موجودگی کا ہمیں صرف احساس دلاتا ہے تو لازمی طور پر فوقیت زمانے کو حاصل ہو گی۔ اس لیے اُسے مکان کا بعد رابع کہنے کی بجائے اپنے ذہن کا فہم رابع کہہ دینا زیادہ برانہ تھا۔ اوسپنسکی سے غلطی یہی ہوئی کہ اُس نے اسے تھری ڈائمنشنز (Three Dimentions) کے بعد فورتھ ڈائمنشن کا نام دیا۔ حالانکہ اُسے زمانے کے لیے کسی مدد کا سہارا لینے کی ضرورت نہ تھی۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اوسپنکی کا مفروضہ سائنسی نوعیت کا حامل ہے اس لیے بعد رابع کہنا ہی پڑے گا۔ ایسی صورت میں ہم اُس کے مفروضے پر نظر ڈالیں گے۔ اوسپنکی کا یہ کہنا ہے:

> "نقطوں، خطوں اور سطحوں کی اُس سمت میں حرکت سے جو ان کے اندر موجود نہیں مکان کے ابعادِ ثلاثہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ بعینہٖ جب کوئی سہ بعدی شکل اُس سمت میں حرکت کرتی ہے جو اُس کے اندر موجود نہیں تو اس سے مکان کے بعد رابع کا ظہور ہوتا ہے۔
> اب چونکہ زمانہ ہی وہ فاصلہ ہے جو باعتبارِ تواتر حوادث کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے اور مختلف نظامات میں ترتیب دیتا

Marfat.com

ہے۔ لہٰذا یہی وہ فاصلہ ہے جو سہ بعدی مکان میں موجود نہیں۔''

(بحوالہ تشکیل جدید)

اوسپنسکی کا مفروضہ بظاہر پرکشش دکھائی دیتا ہے یہاں تک تو وہ سچ کہتا ہے کہ ایک نقطے (•) میں کسی سمت میں حرکت کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ اُس کے لیے ہر سمت بند ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ اُس کے اندر سمتوں میں حرکت کا رجحان نہیں لیکن جب ہم اُس نقطے کو کھینچ کر ایک خط (—) بنا دیتے ہیں تو اس کے اندر دو سمتوں میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ یعنی اگر وہ اُفقی ہے تو دائیں بائیں اور عمودی ہے تو اوپر نیچے کی سمت میں وہ حرکت کر سکتا ہے لیکن اب بھی اُس میں باقی سمتوں کی حرکت موجود نہیں۔ مثلاً ایک اُفقی خط (—) میں اوپر نیچے کی حرکت موجود نہیں لیکن جونہی ہم اُس خط کو اوپر کی طرف اٹھاتے ہیں تو وہ ایک خط سے ایک سطح بن جاتا ہے۔

ہم نے دیکھا کہ خط میں جو حرکت نہیں تھی وہ پیدا کرنے سے خط ایک سطح بن گیا۔ اب اس سطح میں عمودی (y,y) اور اُفقی (x,x) حرکت تو پیدا ہو گئی لیکن آمنے سامنے کی حرکت (Z,Z) اُس سطح میں موجود نہیں اب جب ہم اس سطح میں آمنے سامنے کی حرکت پیدا کرتے ہیں تو وہ صفحہ قرطاس پر بنی ہوئی ایک دو رُخی سطح ہی نہیں رہتی بلکہ ایک تھری ڈائمنشنل چیز بن جاتی ہے۔ مثلاً وہ سطح ایک مربع شکل کے ڈبے میں بدل جاتی ہے۔ یہاں تک اوسپنسکی کی بات درست ہے۔ واقعتاً نقطے، خط اور سطح میں جو حرکت نہیں پائی جاتی تھی وہ پیدا کرنے سے مکان کے ابعادِ ثلاثہ کا ظہور ہوا لیکن سہ بعدی اشکال کی اُس سمت میں حرکت جو اُن میں موجود نہیں تھی مکان کا بعد رابع نہیں ہو سکتی۔ یہ غلط فہمی جدید طبیعات کے بعد پیدا ہوئی۔ جس نے خلاء میں سفر کرتے ہوئے اجسام کا تصور کیا اور یہ دیکھا کہ خلاء میں حرکت کرتی ہوئی چیزیں کسی مکان میں سفر کرنے کی

Marfat.com

بجائے وقت میں سفر کرتی ہیں۔ وہ مستقبل میں آگے تک چلی جاتی ہیں اور بعض کا تو یہ بھی خیال ہے کہ لوٹ کر ماضی میں بھی جا سکتی ہیں۔ روشنی کی رفتار کے ۱۰/۱ سے سفر کرنے والا جہاز زمین پر موجود لوگوں کے وقت کے مقابلے میں بہت آہستہ ہوگا۔ یہ جدید سائنس کا خیال ہے۔ جب اُس جہاز کے مسافر لوٹیں گے تو زمین پر ہزاروں سال بیت چکے ہوں گے۔ جدید سائنس کی یہی وہ غلط فہمی ہے جس کی بنا پر اُس نے کہا کہ خلاء میں سفر کرنے والے اجسام خلاء میں سفر نہیں کرتے بلکہ وقت میں سفر کرتے ہیں......

"They are not going into the space,

They are going into the time."

......اور اوسپنسکی کو بھی اسی وجہ سے کہنا پڑا کہ سہ بعدی (3d) اشکال وقت میں سفر کرتی ہیں۔ اوسپنسکی کے زمانے تک خلائی سفر کا رواج نہیں تھا۔ اس نے یہ بات اپنے علم طبیعات کی بناء پر کہی لیکن اگر ہم اوسپنسکی کی دلیل کا منطقی تجزیہ کریں تو یہ ایک مغالطے پر مبنی دکھائی دیتی ہے۔ نقطے نے حرکت کی تو وہ ایک، یک بعدی شکل بن گیا۔ یعنی خط اور جب خط نے حرکت کی تو وہ ایک دو بعدی شکل بن گیا یعنی سطح۔ اور جب سطح نے حرکت کی تو وہ ایک سہ بعدی شکل میں تبدیل ہو گیا۔ مثلاً ایک ڈبہ۔ چنانچہ جب ڈبے نے حرکت کی تو اُسے ایک چار بعدی شکل بن جانا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ کسی چار بعدی شکل میں تبدیل نہیں ہوا۔ بلکہ اوسپنسکی نے یہ کہہ دیا کہ اب وہ تین بعدی شکل یعنی ڈبہ ایک چوتھے بعد میں سفر کرنے لگا اور یہ چوتھا بعد ''زمانہ'' ہے۔ اگر استنتاج کا یہی انداز معقول ہے تو سہ بعدی شکل کو بھی ثابت قرار نہیں دیا جانا چاہیے تھا۔ ہم سمتوں سے سمتوں کا اور اشیاء سے اشیاء کا استنتاج تو کر سکتے ہیں لیکن اشیاء سے سمتوں کا یا سمتوں سے اشیاء کا نتیجہ نہیں لے سکتے۔

علاوہ ازیں اوسپنسکی نے زمانے کی وہ تعریف جو فزکس کے نزدیک درست ہے اپنے حق میں ایک دلیل کے طور پر لی۔ زمانے کی جدید تعریف یہ ہے کہ یہ مربوط حوادث کا ایک نظام ہے۔ جو باعتبار تواتر حوادث کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے اور مختلف نظامات میں ترتیب دیتا ہے۔ لہٰذا یہی وہ فاصلہ ہے اور اُس سمت میں واقع جو سہ بعدی مکان میں موجود نہیں لیکن علامہ اقبالؒ نے بجا طور پر اوسپنسکی کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ کیونکہ جب دو حادثات تواتر کے اعتبار سے ایک دوسرے سے جدا ہوں گے تو ان کے لیے ایک دوسرے کے متوازی ہونا لازمی ہے۔ جبکہ ایسا نہیں ہوتا اس طرح زمانہ کوئی تخلیقی حرکت نہیں رہتا۔ علامہ اقبالؒ نے اوسپنسکی کے بیان میں تضاد کا ذکر کیا ہے۔ ایک طرف تو زمانے کو حوادث کا جدا کرنے والا جبکہ دوسری طرف نقطوں اور خطوں سے بعد مکانی میں سفر کرنے والا زمانہ علامہ اقبالؒ کے نزدیک ابہام و تضادات سے آلودہ ہے۔ چنانچہ ہم اگر زمانے کو مکان کی بعد کہیں تو یہ زیادہ درست نہیں ہوگا لیکن اگر ہم مکان کو زمانے کی بعد کہیں تو یہ زیادہ غلط نہیں ہوگا۔ دراصل ہم محسوس کے خوگر ہیں چنانچہ لطیف حقیقتوں کی طرف سفر کرتے ہوئے جان بوجھ کر کثافتوں کے بیچوں بیچ سے ہو کر گزرنا چاہتے ہیں۔ ہم ایک ایک چیز کو چھو کر دیکھنا چاہتے ہیں اور محسوس کرتے ہوئے آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ آج تک سب فلسفی مابعد الطبعیات کے عظیم قضیے سلجھانے کے لیے نقطے اور لمحے کی بحث میں غرق رہے ہیں۔ یہ سب اُسی شعور کا کرشمہ ہے جو محسوس کا خوگر ہے اور ارتقاء کے ذریعے ہمیں ملا۔ جو نقطے اور لمحے سے باہر نکل کر سوچنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا جس روز فزکس یا میٹا فزکس احساس کی دنیا میں داخل ہو گئی یوں سمجھ لیجیے دنیا کا سارا نظام ہی بدل جائے گا۔ نقطے اور لمحے' جواہر اور ان کا مرور' موضوعات اور معروضات' داخل اور خارج' آتما اور شریر' روح اور بدن...... یہ سب

Marfat.com

بحثیں اُسی روز ختم ہو جائیں گی جس روز احساس کو ایک ذریعہ علم اور ایک الگ مضمون کا درجہ دیا جائے گا۔ کتنا عجیب لگے گا؟ ہو سکتا ہے تمام مضامین کی جگہ ایک ہی مضمون پڑھایا جانے لگے۔ شاید اُس کا نام ''احساسات'' ہو۔ کیونکہ نفسیات' احساسات کا مطالعہ نہیں کرتی۔ حالانکہ احساسات اِسی مضمون کے تحت آتے ہیں لیکن نفسیات صرف شعور یا کردار کا مطالعہ کرتی ہے۔ ہمیں احساس کی دنیا کو تلاش کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ میں اسے فہم حقیقی سے تعبیر کرتا ہوں۔ زمانے کا کیا ہے وہ تو ایک محدود کائنات کی وجہ سے ہمارے لیے پرکشش ہے۔ احساس کا کوئی زمانہ نہیں ہوتا اور احساس کی دنیا میں آ کر زمانے کا معنی اور مفہوم بالکل بدل جاتا ہے۔ آئین سٹائن جسے جدید طبعیات کا بانی اور نئی دنیاؤں کا مفکر اول مانا جاتا ہے زمانے کو احساس کا ہی ایک جزو قرار دیتا ہے۔ آئین سٹائن کی مشہور کوٹیشن یہ ہے:

> "When you are corting with a nice girl an hour seems like a second. When you sit on red-hot cinder, a second seems like an hour. That's relativity."
>
> جب آپ کسی اچھی لڑکی سے گفتگو کر رہے ہوں تو ایک گھنٹہ ایک سیکنڈ محسوس ہوتا ہے اور جب آپ سرخ دہکتی راکھ پر بیٹھے ہوں تو ایک سیکنڈ ایک گھنٹہ محسوس ہوتا ہے۔ یہی اضافیت ہے۔''

(آئین سٹائن' انسائیکلوپیڈیا آف ارنکارٹا)

آئین سٹائن کے نزدیک اضافیت ایک احساس ہے اور زمانہ (Time) کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ زمانے کی حقیقت یہی ہے کہ ہم اس کا احساس اپنے من میں پیدا کر

لیں۔ اسے چوتھا بعد کہیے یا آٹھواں آسمان، یہ ہوگا محض ایک احساس ہی۔ خواب میں کیا ہوتا ہے؟ ہم نیند میں ایک رات کے اندر کتنے زمانوں کی سیر کر سکتے ہیں۔ کیا وہ سیر ہمارے شعور نے کی؟ جس کی رفتار کو سائنسدان گدھا گاڑی کے برابر قرار دیتے ہیں۔ اس ضمن میں کارل ساگان کے الفاظ دیکھیے!

''ہم کبھی کبھی ایسی چیزوں کے بارے میں بھی سنتے ہیں جو روشنی کی رفتار سے زیادہ تیزی کے ساتھ سفر کرتی ہیں۔ مثلاً خیال (جو شعور میں پیدا ہوتا ہے)...... یہ ایک انتہائی احمقانہ خیال ہے۔ خاص طور پر اس لیے کہ ہمارے دماغ کی نیورانز (Neurons) سے جو خیال کی لہریں گزرتی ہیں اُن کی رفتارت قریباً گدھا گاڑی کے برابر ہوتی ہے۔''

اگر خیال کی رو گدھا گاڑی کی رفتار سے چلتی ہے تو خواب میں اُس گدھا گاڑی کی رفتار تیز کیوں ہو جاتی ہے۔ ہم دس منٹ کے خواب میں دو دن کی پوری کہانی دیکھ سکتے ہیں۔ جبکہ خواب میں دکھائی دینے والی ہر چیز کو ہم اُسی طرح محسوس کرتے ہیں جس طرح کہ عالم بیداری میں۔ ثابت ہوا کہ زمانے کا تعقل ہم احساس کی بدولت ہی کر سکتے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ مکان کا تعقل بھی ہم احساس کی بدولت ہی صحیح طور پر کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ کسی شاعر نے کیا خواب کہا:

جیسا موڈ ہو ویسا منظر ہوتا ہے
موسم تو انسان کے اندر ہوتا ہے

ہم گزشتہ ابواب میں یہ ثابت کر چکے ہیں کہ یہ تمام ظاہری کائنات جو ہمیں دکھائی دیتی ہے حقیقت میں ویسی نہیں ہے جیسی ہم اسے دیکھتے ہیں۔ تو پھر یہ حقیقت میں کیسی

ہے؟ سائنس مانتی ہے کہ یہ بات ہم حواسِ خمسہ کی مدد سے کبھی معلوم نہیں کر سکتے لیکن احساس کے ذریعے ہم جان سکتے ہیں کہ یہ کائنات کیسی ہے؟ اور زمان و مکان کی کیا حیثیت ہے؟ دیکھیے! ہم پر اپنی زندگی میں طرح طرح کی کیفیات طاری ہوتی ہیں۔ گویا ہم احساس کے مختلف ذائقوں سے روشناس ہوتے ہیں۔ مثلاً جب ہمارا بہت ہی پیارا کوئی مر جائے تو ہمیں ساری دنیا بے معنی لگنے لگتی ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی کھویا ہوا ''اپنا'' عرصہ بعد ملے تو کائنات کی ہر شے بامعنی دکھائی دینے لگتی ہے۔ کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ اچھے سے اچھا کھا پی کر بھی من نہیں بھرتا اور کبھی کبھی یوں ہوتا ہے کہ بھوکے پیٹ رہ کر بھی کھانے کو جی نہیں چاہتا۔ آپ ایک بھوکے کو روٹی سے بنی کوٹھڑی میں قید کر دیں تو وہ پیٹ بھرنے سے زیادہ باہر نکلنے کو ترجیح دے گا۔ آپ نے کبھی کھویا ہوا بچہ دیکھا جو اپنے والدین کے لیے رو رہا ہو۔ اُسے کچھ اچھا نہیں لگتا مثلاً کھانے کی کوئی چیز یا کھلونے وغیرہ۔ بڑے سے بڑا میکانیکی ذہن، بڑے سے بڑا نیچرلسٹ، بڑے سے بڑا فلسفی اور بڑے سے بڑا سائنسدان ان احساسات کے بغیر جی نہیں سکتا۔ اُس کی سائنس اور تمام عقلی دلیلیں اُس وقت کہاں جاتی ہیں جب وہ اپنے مرتے ہوئے بچے کو گود میں اٹھائے مارا مارا پھرتا ہے تو اُسے پوری کائنات صرف دکھوں کا گھر دکھائی دیتی ہے۔ اُس کا مشکل وقت گزرنے کی رفتار سست ہو جاتی ہے۔ جبکہ خوشیوں کے لمحات جھٹ سے گزر جاتے ہیں۔

یہ ایک لحاظ سے زمانے کا جدید ترین تصور ہے اور ایک لحاظ سے کافی قدیم بھی۔ کیونکہ زمانے کو ایک احساس کے طور پر کسی نہ کسی حد تک ماضی میں بھی پہچانا جاتا رہا ہے۔ ہم جب اس دنیا سے رخصت ہوں گے تو ہمارا زمان و مکاں بدل جائے گا۔ ہم جب نیند میں سپنا دیکھتے ہیں تو بھی ہمارا زمان و مکان بدل جاتا ہے۔ یہ دنیا اور زمین

Marfat.com

جس پر ہم رہتے ہیں اور کائنات میں جو کچھ ہم دیکھتے ہیں۔ یہ سب زمان و مکان کی صرف ایک قسم ہے۔ ہمارا زمان و مکاں بدل گیا تو ہمارے لیے سہ بعدی (3d) اشیاء کی کوئی حقیقت نہیں رہ جائے گی۔ حدیث مبارکہ کی رو سے...... ولا تسبو الدھر ...... زمانے کو گالی مت دو...... اللہ خود زمانہ ہے یا یوں کہہ لیں کہ اللہ کی ایک صفت زمانہ ہے اور اس لحاظ سے ''عبدالدھر'' نام بھی رکھا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ عبدالغفار اور عبدالحی وغیرہ۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ''دھریہ'' کہلوانا صفاتِ الٰہی میں سے کسی کے ساتھ خود کو منسوب کرنا ہوا لیکن اصطلاح میں دہریہ اُسے کہتے ہیں جو قطعی طور پر مادہ پرست ہو اور اللہ کے وجود سے انکاری۔

زمانے کا تعقل احساس کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے۔ حواس کے ذریعے یہ ممکن نہیں۔ ہم جب کسی ٹریفک بھرے روڈ کو پار کرنا چاہتے ہیں مثلاً مال روڈ یا کوئی اور پرہجوم سڑک، کوئی ایسی سڑک جس پر سے گاڑیاں ہی گاڑیاں گزر رہی ہوں۔ ہم سڑک کے کنارے کھڑے یہ انتظار کرتے ہیں کہ کب اشارہ بند ہو، گاڑیاں رکیں اور ہم سڑک پار کریں۔ تب ہمارے دل پر ایک کیفیتِ احساس ہوتی ہے۔ ہمیں یوں لگتا ہے جیسے وقت بہت آہستگی سے گزر رہا ہے۔ حالانکہ مال روڈ کا ایک اشارہ صرف ایک منٹ کے لیے کھلتا اور بند ہوتا ہے لیکن بازار میں کھڑے کھڑے ہم سوچتے ہیں گویا دو تین منٹ گزر گئے۔

ہم دہکتے ہوئے کوئلوں پر زیادہ دیر تک ہاتھ نہیں تاپ سکتے لیکن اگر ہم جان بوجھ کر ایسا کریں اور کوئلوں پر دیر تک ہاتھ تاپتے رہیں تو ہمیں وقت کا صحیح احساس ہوگا۔ ہمیں یوں لگے گا جیسے ایک سیکنڈ کئی کئی منٹ تک طویل ہو گیا ہے۔ اسی کو آئن سٹائن اضافیت کہتا ہے۔ اس مضمون کے شروع میں میں نے کہا تھا کہ میٹا فزکس اور فزکس ایک

ہونے والی ہیں۔ دراصل فزکس نے پچھلی صدی کے آغاز میں پہلی مرتبہ میٹافزکس کی طرف دوستانہ قدم بڑھایا۔ فزکس جیسی کڑی تنقید کرنے والی سوچ نے زمانے کا تعقل کرنے کے لیے ہمیں احساس کی طرف متوجہ کیا۔ اب کم از کم احساس کا مطالعہ تو فزکس کا میدان نہیں ہے۔ اب اگر فزکس یا طبیعیات احساس کو اپنا موضوعِ مطالعہ بناتی ہے تو ہم بڑی بے فکری کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کا رُخ مادیت سے ہٹ کر روحانیت کی طرف ہونے والا ہے۔ ذرا ذہن پر زور دے کر یاد کریں آپ جب بچے تھے اور کبھی میلہ دیکھنے جاتے تھے تو وقت کیسے گزرتا تھا۔ فرض کریں آپ کھلونا ٹرین میں سفر کرنا چاہتے ہیں جس کا ٹکٹ پانچ روپے ہے اور ٹرین پانچ سو میٹر کا فاصلہ زمین پر کھڑے لوگوں کے حساب سے دس منٹ میں طے کرتی ہے۔ فرض کریں آپ کا بچہ ٹرین میں بیٹھا ہے اور آپ باہر والدین کے ساتھ کھڑے اپنے بچے کو خوش ہوتا دیکھ رہے ہیں۔ تب آپ کا وقت تو دس منٹ ہی گزرے گا لیکن آپ کا بچہ جب سیر کر کے واپس لوٹے گا تو وہ آپ سے کہے گا کہ اتنی جلدی کھیل ختم ہو گیا۔ اُسے لگے گا جیسے ٹرین نے صرف ایک منٹ تک سفر کیا...... یہ ہے اضافیت (Relativity)۔

اب ہم جب میٹافزکس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو وہ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ زمانے کا تعقل محض حواس کے ذریعے ممکن نہیں۔ میٹافزکس کے پاس تو یہ نظریہ شروع سے ہی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہندوؤں کا آواگون یعنی جنم کے سات چکر کا نظریہ کبھی نہ ہوتا۔ ہندوؤں کا سات جنم کا نظریہ جس نے بھی پیش کیا وہ فلسفی ہی تھا۔ ہم جوں جوں اُن مذاہب کا مطالعہ کرتے ہیں جو...... وما انزل من قبلک کے تحت نہیں آتے۔ یعنی اُن کے پاس کوئی آسمانی صحیفہ موجود نہیں تو ہمیں صاف پتا چلتا ہے کہ اُن کا میدان میٹافزکس ہے۔ اگرچہ یہ خیال بھی خاصا مضبوط ہے کہ قدیم مذاہب بھی وما انزل من

Marfat.com

قبلک کے تحت شمار کیے جا سکتے ہیں' مثلاً ہندو مت وغیرہ۔ بہرحال جدید زمانے میں نیٹشے نے جو ''نظریہ رجعت ابدی'' پیش کیا وہ ہندوؤں کے آواگون سے مختلف نہیں۔ مابعد الطبعیات یا میٹا فزکس مسلمانوں کے ہاتھ لگی تو اس کا رنگ ڈھنگ ہی بدل گیا۔ یہ شیخ الاشراق شیخ شہاب الدین سہروردی ہی تھے جنہوں نے سب سے پہلے کائنات کی ہر چیز کو غیر مطلق اور نور مجرد کو مطلق کہا۔ یہی وہ معیار ہے جس سے ہم زمان و مکاں کی پیمائش کر سکتے ہیں۔ بے شک شیخ الاشراقؒ کے پاس ایسے دلائل نہ تھے جو فزکس کے معیار پر پورے اُترتے لیکن نور کو ایک معیاری پیمانہ سب سے پہلے شیخ نے ہی قرار دیا۔ مسلمانوں نے مابعد الطبعیات میں اتنی ترقی کی کہ مغرب کبھی بھی اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہاں تک علامہ اقبالؒ نے جدید طبعیات کی موجودگی میں زمانے کا ایک ایسا تصور پیش کیا جسے جھٹلانا نہ تو سائنس کے بس کی بات ہے اور نہ ہی فلسفہ و مذہب کے۔ آئین سٹائن کے نظریات متعارف ہونے کے بعد اضافیت پر تیزی سے کام ہونے لگا۔ یہاں تک کہ عمومی نظریہ اضافیت (General theory of Relativity) آج سے صرف پندرہ سال قبل ثابت کیا گیا لیکن اس دوران اقلیدسی مکان پوری طرح مجروح ہوا اور نیوٹن کے کچھ نظریات کو کلاسیکل فزکس (Classical . Phsics) کی ردی میں پھینک دیا گیا۔ اقلیدسی مکان یعنی سہ بعدی (3d) مکان سے بڑھ کر دیگر ابعاد کا تعقل کیا جانے لگا اور ماڈرن فزکس نے اپنے نئے مفروضے کے تحت یہ تسلیم کر لیا کہ اقلیدسی مکان یعنی جیومیٹری کے ابعاد کافی نہیں۔ یہ ہمارے شعور کی ایک سطح ہے۔ ہمارا شعور اگر مزید ارتقاء کر جائے تو ہم تین ابعاد سے بڑھ کر مزید کئی ابعاد طے کر سکتے ہیں۔ اب ذرا قرآن کریم کی یہ آیت دیکھیے!...... لترکبن طبقاً عن طبق ......
اقلیدسی مکان تو محض ایک طبق ہے۔ جو، ہر وقت ہمارے سامنے روشن رہتا ہے۔ ہم

Marfat.com

عام طور پر ایک محاورہ بولتے ہیں کہ فلاں شخص کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ حالانکہ ہمہ وقت ہمارے سامنے صرف ایک طبق ہوتا ہے۔ یہ ظاہری طبق سہ بعدی (3d) مکان ہے۔ علامہ اقبالؒ کے زمانے کا وصف یہ ہے کہ اُس میں ایک طبق کے بعد ہم دوسرے طبق کا ادراک اور دوسرے کے بعد تیسرے طبق کا ادراک کر سکتے ہیں۔ یہاں تک ہم طبق در طبق مختلف زمان و مکاں کا تعقل کرتے چلے جاتے ہیں۔ ہم ماڈرن فزکس کی یہ بات نہیں مان سکتے کہ ہم ہر حال میں اسی مکان کے دیگر ابعاد کے طور پر زمانے کو دیکھنے پر مجبور ہوں۔ یہ زمان و مکان تو ایک مرحلہ ہے۔ جب ہم اپنے احساس کو روشن کرلیں گے تو یہ مرحلہ ہمارے لیے کوئی معنی نہیں رکھے گا اور ہم مرحلہ وار زمان و مکاں کے کئی تصورات قائم کرنے کے اہل ہو جائیں گے۔ یہ ہے علامہ اقبالؒ کا زمانہ یا نظریۂ ارتقائے خودی۔

مولانا شبلی نعمانیؒ کے متعلقین نظری طور پر علامہ اقبالؒ کے بہت نزدیک ہیں۔ سید سلمان ندویؒ بطورِ خاص علامہ اقبالؒ کے دوستوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ سید سلمان ندویؒ کے زیرِ ادارت ایک ماہنامہ نکلتا تھا جس کا نام تھا ''معارف''۔ دسمبر ۱۹۲۲ء کے ''معارف'' میں ''نظریہء اضافیت'' کے عنوان سے ''پروفیسر مولوی نصیر احمد ایم اے بی ایس سی'' جامعہ عثمانیہ کا ایک مضمون شائع ہوا۔ میں حیران ہوں کہ وہ دور جب آئین سٹائن کے پیش کردہ نظریہ اضافیت کو محض دو چار اشخاص ہی سمجھتے تھے اور جب ابھی باقی دنیا اتنا شعور ہی نہ رکھتی تھی کہ اضافیت کا تعقل کر سکے، جامعہ عثمانیہ کے مسلمان پروفیسر اس نظریہ کو نہ صرف سمجھ گئے بلکہ اُسے اردو میں بیان کرنے کی بھی کوشش کی۔ زیرِ نظر کتاب کی تکمیل کے دوران میں نے اضافیت کے موضوع پر اردو مین کچھ تلاش کرنا چاہا لیکن مجھے ناکامی کے ساتھ ساتھ دکھ بھی ہوا کہ ہم ابھی تک کتنے ناواقف اور کم علم ہیں

Marfat.com

کہ دنیا کے جدید ترین نظریہ کو اپنے قریب بھی نہیں آنے دیا لیکن مولانا سلمان ندوی کے رسالہ معارف میں اضافیت پر یہ دلکش مضمون دیکھ کر میری ساری کلفت دور ہوگئی۔

اب میں دسمبر ۱۹۲۲ء کے معارف میں شائع ہونے والا یہ مضمون آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ یاد رہے کہ ۱۹۲۲ء میں آئین سٹائن زندہ تھا اور ابھی تک اپنے آبائی وطن جرمنی میں ہی تھا۔ جہاں سے بہت بعد میں اُس نے ہجرت کی اور امریکہ منتقل ہو گیا۔ ہوسکتا ہے اس سے قبل کسی نے یہ مضمون دوبارہ شائع نہ کیا ہو۔ اسی خیال کے تحت میں اسے اپنی کتاب میں محفوظ کرنے پر مجبور ہوں۔ قارئین کی آسانی کے لیے میں نے اس مضمون کی تدوین نو کی۔ تاکہ اردو کی متروک اصطلاحات اور الفاظ کی جگہ مستعمل اصطلاحات اور الفاظ استعمال کر کے اسے قارئین کے لیے سہل کر دیا جائے۔

Marfat.com

ماہیتِ اشیاء

(از پروفیسر مولوی نصیر احمد صاحب ایم اے، بی ایس سی، پروفیسر طبیعات جامعہ عثمانیہ)

سولہ برس ہوئے کہ جرمنی کے پروفیسر آئین سٹائن نے ایک نئے نظریے کی بنیاد ڈالی جس کا موضوع اشیاء کی ماہیت تھا۔ اس نظریہ کی نسبت لوگوں کا یہ خیال تھا اور شاید اب بھی ہے کہ وہ نیوٹن اور اقلیدس کے پیش کردہ نظام کو باطل قرار دیتا ہے۔ اس مسئلے کا طرز بیان کچھ ایسا نرالا اور عام اندازِ بیاں سے اس قدر مختلف تھا کہ ماہرین فن میں سے شاید بارہ ہی نفوس اس کی تہ تک پہنچ سکے اور اُس کی حقیقی قدر و منزلت کا اندازہ کر سکے۔

آئین سٹائن کے اس نظریہ اضافیت میں زمان و مکاں اور تجاذب کی مناسبت سے بحث کی گئی ہے۔ مشہور انگریزی عالمِ سائنس سر اسحاق نیوٹن کے وقت سے اب تک علومِ طبیعیات میں جو ترقیاں ہوئیں اُن میں یہ نظریہ عظیم ترقی سے موسوم کیا گیا۔ کیونکہ طبیعیات کی بنیاد جن چیزوں پر ہے وہی اس کا موضوع ہیں۔ اخبارات اور رسائل نے اس نظریہ کو انقلاب انگیز قرار دیا۔ لوگوں کی نظریں اسی لیے اس کی طرف اُٹھیں اور یہ اسی لیے سب کی دلچسپی کا باعث بنا۔ کہ اخبارات کے مطابق دنیا میں صرف بارہ اشخاص ہی اس نظریے کو کماحقہ سمجھ سکے ہیں۔ اس نئے نظریے کی جتنی تشریح اب تک کی گئی اس کے باوجود ان بارہ افراد کے محدود دائرے میں کوئی وسعت یا اضافہ نہیں۔

شروع شروع میں اگر قارئین کو اس نظریہ کے سمجھنے میں دقت ہو تو ذرا صبر سے کام لیجیے گا۔ بہت جلد قطعی طور پر یہ بتانے کی کوشش کی جائے کہ آئین سٹائن کا نظریہ کیا ہے؟ اور اس سے کیا نتائج پیدا ہوتے ہیں لیکن یہ مضمون چونکہ کسی قدر نامانوس ہے۔ خصوصاً

Marfat.com

ہندوستان کی مشترک زبان اُردو کے جاننے والوں کے لیے۔ اس لیے مطلب سمجھانے کی غرض سے مزید تمہید کی ضرورت ہے۔

جب ہم کسی واقعہ یا مظہر قدرت کی توجیہ کرنا چاہیے ہیں تو یہ توجیہ چار حصوں پر مشتمل ہوگی:

۱- سب سے پہلے ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ وہ واقعہ کب پیش آیا؟
۲- اُس کی کیفیت کیا تھی؟
۳- اُس کی ماہیت کیا ہے؟
۴- وہ کیوں پیش آیا؟

مضمون کے سمجھنے میں سہولت پیدا کرنے کی غرض سے ہم نظریہ کی کیفیت پر زیادہ زور نہیں دیں گے، بلکہ کیا اور کیوں کا زیادہ لحاظ رکھیں گے اور درحقیقت جب ہم کسی امر پر غور کرتے ہیں کہ دنیا میں صرف بارہ اشخاص اس کی ریاضی کو سمجھ سکے تو ذہن انسانی کی قدر و منزلت ہماری نگاہوں میں بہت بڑھ جاتی ہے۔ بہرحال ہمارے مضمون کے لیے جو چیزیں زیادہ کارآمد ہیں وہ صرف وہی نتائج ہیں جو اس قدر ریاضی استعمال کرنے کے بعد حاصل ہوئے۔ نیز ہمارے بیان کا مطلب صرف یہ امر ہے کہ اس سے علوم طبیعیات اور اُس کے فروغ پر کیا اثر مرتب ہوتا ہے۔

نظریہ کا اثر

اگر ہوشیاری سے کام نہ لیا جائے تو نظریہ اضافیت کو عام زبان کا جامہ پہنانا بہت دشوار ہو جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ہم ریاضیات کو اس بنا پر نظر انداز کر دیں کہ اس سے عام عوام کو دلچسپی نہیں۔ عام لوگ تو اس بحث میں نہیں پڑتے کہ ایک مشین بنائی کیسے جاتی ہے۔ اس کے برعکس انہیں اس بات سے دلچسپی ہوتی ہے کہ کسی مشین سے تیار کیا

کیا چیز ہو سکتی ہے۔ ان کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ مشین کی ساخت کا اصول انہیں سمجھا دیا جائے۔ تفصیلات یا جزئیات سے اُن کو غرض نہیں ہوتی۔ ہمارا نظریہ بھی گویا ایک مشین ہے جو بنی بنائی ہمارے سامنے پڑی ہے۔ اب اگر ہم عامۃ الناس کے نقطۂ نظر سے اس کو دیکھتے ہیں تو واقعی اس عجیب وغریب اور انقلاب انگیز نظریہ نے (ابھی تک) کوئی عملی نتیجہ پیدا نہیں کیا اور اگر کچھ کیا بھی ہے تو اس قابل نہیں کہ شمار کیا جا سکے۔

نظریہ اضافیت کو اگر چند لفظوں میں بیان کرنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے کہ اس کا دعویٰ ہے کہ ہم طبیعیاتی تجربات کی مدد سے مکان میں کسی جسم کی رفتارِ مطلق دریافت نہیں کر سکتے۔ اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ رفتار کے دریافت کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی معیار نہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ طبیعیاتی نظریات میں ہم مکان مطلق سے بحث ہی نہیں کرتے بلکہ وہاں تو زیر بحث مظاہر فطرت کے بے شمار تعلقات میں سے مکان کو بھی ان تعلقات کا ایک پہلو سمجھا جاتا ہے۔

اس کی مثال کو یوں سمجھنا چاہیے کہ کسی دریا میں ایک کشتی تین میل فی گھنٹہ کی رفتار سے رواں ہے۔ تو اب ساحل کی اضافت سے تختے پر چلتے ہوئے آدمی کی رفتار کیا ہوگی۔ یعنی اگر ساحل پر دوسرا شخص کھڑا ہو تو اُس کے نزدیک اُس متحرک شخص کی رفتار کیا ہوگی؟ آپ جواب دیں گے کہ پانچ میل فی گھنٹہ لیکن آئن سٹائن کا ماننے والا یہ کہے گا کہ نہیں! پورے پانچ میل نہیں ہوگی...... پانچ میل سے ہمیشہ ایک آدھ انچ کم ہی رہے گی یعنی صرف ''4.9999999999'' میل فی گھنٹہ ہوگی۔ اب ایک دوسری مثال لیجیے!

ریلوے انجینئر اور ڈرائیور اپنی اپنی گھڑیاں سٹیشن کی گھڑی سے درست کرتے ہیں۔ سٹیشن کی گھڑی میں بارہ بجتے ہیں تو ڈرائیور اور انجینئر کی گھڑیوں میں کیا وقت

Marfat.com

ہوگا؟ آپ یہی کہیں گے کہ ٹھیک بارہ بجے ہوں گے لیکن اضافیت (Relativity) یہ کہتی ہے کہ نہیں۔ سٹیشن اور ڈرائیور کی گھڑیوں میں بہت قلیل سا فرق ہوگا۔ سٹیشن پر انجینئر موجود ہے جبکہ ڈرائیور ٹرین لے کر دور جا چکا ہے۔ یہ فرق معلوم کرنے کے لیے ہمیں ٹرین کی لمبائی اُس کی رفتار، سٹیشن سے اُس کا فاصلہ اور خود انجینئر کا مقام اور رفتار معلوم ہونی چاہیے۔ آپ کہیں گے کہ ان خرافات کا جواب سے کیا علاقہ؟ لیکن اضافیت کا یہ فتویٰ ہے کہ باہم ان میں تعلق ہے۔ اگرچہ یہ ضرور ہے کہ اس طرح صحت کے ساتھ ہم جو وقت معلوم کریں گے اور وہ وقت جب ہمارے سامنے آئے گا تو دونوں اوقات کے درمیان تفاوت بہت قلیل ہوگا۔ یعنی ایک سیکنڈ کا شاید کوئی کھربواں نہیں بلکہ سنکھواں حصہ۔

یہاں یہ امر ظاہر کر دینا بہت ضروری ہے کہ جب کسی مسئلہ میں رفتاروں کی مقدار وہ ہو جس سے ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں روشناس ہیں یا جس کو ہم اپنے علمی تجربات اور فلکی مشاہدات میں پاتے ہیں تو نظریہ اضافیت کا اثر ان پر قریب قریب نفی کے ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کی رو سے جو فرق پیدا ہوگا اس قدر قلیل کہ القلیل کالمعدوم ہوگا۔ اس کا شمار بھی ممکن نہ ہوگا لیکن جب ہم کو مادی اجسام کی اُن رفتاروں سے واسطہ پڑتا ہے جو روشنی کی رفتار یعنی ۳ لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ کے لگ بھگ ہیں تو اُس وقت نظریہ اضافیت ایک خاص اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ ماہرین فن جو تجربات کرتے رہتے ہیں اس قسم کی رفتاروں کا تعلق صرف اُن کے ساتھ ہے۔ اس مضمون کے مقاصد کا لحاظ کرتے ہوئے صرف اتنا کہہ دینا بھی کافی ہے کہ ایسے تجربات سے نظریہء اضافیت کی پوری تصدیق ہوتی ہے۔ مضمون کے آغاز میں یہ ذکر ہو چکا ہے کہ یہ نظریہ انقلاب انگیز ہے۔ اس کے بعد کسی قدر ہم نے اس کی ریاضیات کا بھی اشارہ دیا اس پر تنقید کی کہ اس کے عملی

نتائج...... قابل اتفاق نہیں۔ پس اب مناسب ہے کہ اس کی اصل اہمیت ذہن نشین کی جائے۔

نظریہ کی اہمیت

حسب ذیل طریقوں سے ہم اس کی اہمیت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

(۱) اگرچہ اس نظریہ کے اثرات جیسا کہ اوپر بیان ہوا عملی زندگیوں کے ان پہلوؤں میں جن کا اہل طبیعیات نے اچھی طرح سے مطالعہ کیا ہے نہایت ہی قلیل اور نا قابل التفات ہیں۔ تاہم ایک زمانہ ایسا آ سکتا ہے کہ اس قسم کے آلات ایجاد ہوں اور ایسے تجربے کیے جائیں کہ یہی قلیل اضافی اثرات کثیر معلوم ہونے لگیں[۱]۔ چنانچہ سائنسدانوں اور انجینئروں نے برقی صنعت کی جو عظیم الشان عمارت قائم کی ہے کیا آپ جانتے ہیں کہ اس کی بنیاد کیا تھی؟ محض یہ کہ جب کہربا[۲] کو رگڑتے ہیں تو اُس میں ہلکی چیزوں کو کھینچنے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ قدیم یونانیوں کو بھی اس واقعے کا علم تھا۔ جو بظاہر کتنا ادنیٰ معلوم ہوتا ہے۔

(۲) اس نظریہ کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ بہت سے مظاہر فطرت جواب تک نا قابل توجیہ تھے اب اس کی روشنی میں صاف نظر آنے لگے۔ مانا کہ یہ مظاہر عملی نقطہء نظر سے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ چنانچہ ان کے سمجھنے کے لیے بھی علم مناظرہ و برق کے مبادیات کا جاننا ضروری ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسے مظاہر کا وجود ہے اور اس نظریہ سے اُن کی توجیہ ہو جاتی ہے۔ علوم میں ترقی کا ہمیشہ یہی حال رہا ہے کہ اس کی ابتداء

۱۔ پروفیسر مولوی نصیر احمد کی پیشگوئی سچ ثابت ہوئی۔ ایٹمی توانائی اور کوانٹم کے نظریات اضافیت کے بعد قابل تجربہ ہو گئے ہیں۔

۲۔ (ایک قسم کا زرد گوندا سے کپڑے یا چمڑے سے رگڑ کر گھاس کے تنکے کے سامنے کریں تو اُسے اٹھا لیتا ہے)

Marfat.com

نہایت حقیر ہوتی ہے اور انتہا بہت عظیم الشان۔ دراصل چھوٹے چھوٹے اسباب ہی بڑے بڑے نتائج کی علت ہوا کرتے ہیں۔

(۳) اس کی اہمیت کا راز یہ ہے کہ اس کی روشنی میں وہ مظاہر فطرت جواب تک علیحدہ علیحدہ تصور کیے جاتے تھے سب کے سب ایک نظام میں منسلک نظر آتے ہیں۔ طبیعیات نے ہمیشہ اسی طرح ترقی کی ہے اور ہر کامیاب علمی نظریہ ہم کو فطرت کی وحدت سے قریب کر دیتا ہے۔ بے جا نہ ہوگا کہ اگر علمائے سائنس کو اُن سراغ رسانوں سے تشبیہ دی جائے جو شر پسندوں کے کسی گروہ کی کارروائیوں کی تحقیقات میں مصروف ہوں اور جن کی کوشش یہ ہو کہ وہ کسی طرح ''ابوالاشرار'' یعنی شر پسندوں کے سرغنہ کو گرفتار کر لیں۔ ان شر پسندوں میں جو زبردست ہوتے ہیں اُن کی کارروائیوں کو تفتیش کرنے والے صرف اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ ان سے اُن کے سرغنہ کا پتہ کیسے چل سکتا ہے۔ یہ سرغنے ہر کس وناکس کے قبضے میں تو آتے نہیں یہ بڑے ہوشیار ہوتے ہیں لیکن ایک ماہر تفتیش افسر صرف انگوٹھے کے نشان یا نقشِ قدم سے ہی بہت کچھ اخذ کر لیتا ہے اور جب کوئی ابوالاشرار گرفتار ہو جاتا ہے تو قانون اور امن کے علمبرداروں کو بہت سی عجیب لیکن خفیف باتوں کا بھید معلوم ہو جاتا ہے جو اس سے پیشتر کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔

یہی حال آئین سٹائن کا سمجھنا چاہیے۔ اس نے دیکھا کہ طبیعیات تمام مظاہر قدرت کی توجیہ وتشریح...... زمان ومکان، جمود، تجاذب، نور اور برق کے مفہومات کی اضافت کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ اس لیے نظریہء اضافت نے ہمیں یہ بتایا کہ زمان ومکان، جمود، تجاذب وغیرہ سب کو ہم حقیقت واحدہ کے مختلف رخوں سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس واحد حقیقت کو وہ مکان کہتا ہے۔ اس مکان میں بجائے ابعاد ثلاثہ

Marfat.com

کے وہ پانچ یا چھ بعد مانتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کا مفہوم ذہن میں قائم کرنا مشکل ہے لیکن فائدہ یہ ہے کہ بجائے چار حقیقتوں کے اب صرف ایک حقیقت رہ جاتی ہے اور اگر ریاضی میں کافی دخل ہو تو پھر اسی بناء پر نظریہ کی پوری عمارت قائم ہو سکتی ہے۔ مزید برآں آئین سٹائن نے مادۂ نور اور برق میں نئے نئے تعلقات ثابت کیے۔ تجربہ بظاہر اس کی تصدیق پر آمادہ ہے۔ آئین سٹائن کے نزدیک اس مکان میں نور بالکل خطِ مستقیم میں حرکت کرتا ہے۔ حالانکہ موجودہ نظریہءنور کے مطابق اُس کا راستہ خطِ مستقیم کے قریب قریب ہوتا ہے۔ حرکیات (علم الحرکت) جو متحرک مادہ کا علم ہے وہ صرف پانچ یا چھ بعد والا ہندسہ رہ جاتا ہے۔ جبکہ موجودہ یعنی اقلیدسی ہندسہ تین بعد کا مانا جاتا ہے۔ کمیت، زمانہ نیز فاصلوں کی پیائش میلوں میں ہو سکتی ہے۔ آئین سٹائن کا یہ دعویٰ ہے کہ زمانہ اور مکان کا وجود مادہ کے وجود سے وابستہ ہے۔

آئین سٹائن نے اضافیت سے جو معنی مراد لیے ہیں وہ یہ ہیں کہ زمانہ، کمیت اور فاصلوں کی پیائش ناممکن ہے۔ جب دو افراد ایک دوسرے کی اضافت سے حرکت کر رہے ہوں اور دونوں کسی ایک ہی واقعے کا مطالعہ کریں تو اُن کا ایک ہی نتیجہ پر پہنچنا ممکن نہیں۔ اسی بناء پر جیسا کہ پہلے بھی گزر چکا ہے طبیعیات میں زمانِ مطلق یا کمیت مطلق کے کچھ معنی نہیں رہے۔ زمان، کمیت اور فصل سب کا وجود شاہد کی اضافت سے ہے۔ اگرچہ فلسفہ میں اس اصول کو مدت سے پیش کیا جا رہا تھا لیکن آئین سٹائین کا کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے اضافیت کو قابل پیائش کر دکھایا۔ حتیٰ کہ اس کے عملی ثبوت کو بھی ممکن قرار دیا۔

مختصر تاریخ

البرٹ آئین سٹائن نے اضافیت پر سب سے پہلا مضمون رسالہ ''انا سنڈر

Marfat.com

فزکس'' ۱۹۰۵ء میں شائع کیا۔ پہلے وہ سوئٹزرلینڈ کے پیٹنٹ دفتر میں ملازم تھا۔ اب وہ برلن میں پروفیسر ہے۔ ۱۹۰۵ء سے اب تک اُس نے متعدد مضامین شائع کیے ہیں۔ ۱۹۱۰ء کے اوائل سے اُس نے اس نظریہ کو وسعت دینا شروع کیا۔ اب تک تو صرف زمان و فاصلہ سے بحث کرتا تھا۔ اب اُس نے کمیت (Mass) کو بھی شامل کرلیا ہے۔ کمیت اور جمود مادہ کی فطری خاصیتیں ہیں۔ جن کا تعلق تجاذب سے بہت قوی ہے۔ آئین سٹائن کے نظریہ ارتقاء کے تین دور ہیں۔

پہلا دور ۱۹۰۵ء سے قبل کا ہے۔ اُس وقت تک دوسرے محققین نے داغ بیل ڈال دی تھی جن کو مادہ کے برقناطیسی نظریے کی تلاش تھی۔ آئین سٹائن نے سب سے پہلا نظریہ ۱۹۰۵ء میں قائم کیا اور ۱۹۱۶ء میں اس کو وسعت دے کر ایک کلیہ کی صورت میں پیش کیا۔

نظریہ کی کیفیت:

آئین سٹائن کا اصل نظریہ اضافیت مکان و زماں کے شائع ہونے کے کچھ عرصہ بعد ''منکاوسکی'' (غالباً اوس پنسکی) نے یہ بتلایا کہ آئین سٹائن کا کارنامہ صرف یہ ہے کہ اُس نے زمانے کو مکان کا چوتھا بعد قرار دیا ہے۔ مکان کے ابعادِ ثلاثہ طول، عرض اور عمق (گہرائی) ہیں۔ اس کا ذکر ہر ہندسہ (جیومیٹری) کی کتاب میں ہے اور ہر شخص اس سے واقف ہے۔ ذہن انسانی دو بعدی مکان کا مفہوم بھی قائم کرسکتا ہے۔ چنانچہ ہندسہء ثنوی اس کی دلیل ہے۔ نیز یک بعدی مکان بھی قرین فہم ہے جس کی مثال خط مستقیم ہے لیکن ہمارا ذہن چار بعدی (4d) مکان کا مفہوم قائم کرنے سے قاصر ہے۔ مگر طبیعیات میں جو ریاضی کی مساواتیں استعمال کی جاتی ہیں اُن میں جہاں طول، عرض اور عمق کا استعمال ہوتا ہے وہاں زمانہ بھی شامل ہوتا ہے اور اُس کی وہی حیثیت ہوتی

ہے جو بقیہ تین بعدوں کی ہے۔ اس بنیاد پر ہم صرف ذہنی طور پر زمانے کو چوتھا بعد قرار دے سکتے ہیں۔

تمثیل:

اس کی تمثیل ہم کو متحرک تصاویر یعنی سینما میں ملتی ہے۔ سینما میں سکرین پر جو تصویریں دکھائی جاتی ہیں ان میں صرف دو بعد (2d) ہوتے ہیں۔ (یعنی وہ صرف Two dimentional ہوتی ہیں) لیکن ہم اُن کو ذہنی طور پر تین بعدی تصور کر سکتے ہیں۔ جیسے کسی کاغذ پر بنی تصویر میں صرف دو بعد ہی ہوتے ہیں اور اُس میں تیسرے بعد یعنی عمق کا پتا نہیں ہوتا لیکن ہم اُس میں عمق (Z Axis) کا تصور بھی کر سکتے ہیں۔

غور طلب امر یہ ہے کہ سینما میں تصویریں حرکت کرتی نظر آتی ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ وجہ یہ ہے کہ جو کچھ ہم دیکھتے ہیں وہ ایک ہی تصویر نہیں جو متحرک ہو۔ بلکہ وہ ایک سلسلہ تصاویر ہے جس میں معین چیزیں دکھلائی جاتی ہیں۔ ایک تصویر جب دوسری تصویر کی جگہ لیتی ہے تو اس تیزی کے ساتھ کہ ہم کو پتہ ہی نہیں چلتا۔ جب ہم ایک اکلوتی معمولی سی تصویر دیکھتے ہیں تو ہم مکان کا خیال تو قائم کر لیتے ہیں لیکن زمانے کا اس میں شائبہ تک نہیں ہوتا اور جب ہم ایک متحرک تصویر کو دیکھتے ہیں تو مکان کے ساتھ ساتھ زمانے کا بھی خیال ہمارے ذہن میں قائم ہو جاتا ہے۔ زمانے کا یہ احساس اُس فلم کی حرکت کی وجہ سے ہے جو عدسے (Lens) کے پیچھے مسلسل متحرک ہے۔ اس حرکت کا پردے پر یہی ثبوت ہے کہ ہم چلتی پھرتی اشیاء دیکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دیکھنے والے کو ایک تصویر کے بعد دوسری کا احساس نہیں ہوتا۔ دراصل فلم کی حرکت ایک اور بعد میں ہوتی ہے۔ جس کو بعد زمانی کہنا چاہیے۔ عرصہ ہوا یہ گمان پیش کیا گیا تھا کہ روزمرہ

Marfat.com

زندگی میں ہمیں زمانے کا جب احساس ہوتا ہے وہ ایک چوتھے فرض کیے گئے بعد میں غیر محسوس حرکت کا نتیجہ ہے۔ ہم ایسے لا انتہا جہانوں کا وجود مان سکتے ہیں جو ایک دوسرے کے قریب قریب متماثل ہوں۔ جب ہمارا شعور ایک ایسے عالم سے دوسرے عالم میں سلسلہ درسلسلہ منتقل ہوتا جائے گا تو اس فرق کو ہم اشیاء کی حرکت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ کسی ایک لمحہ میں ہم چار بعدی مکان والے عالم کا بالکلیہ شعور نہیں کر سکتے۔ ہم کو فقط سہ بعدی (3d) مکان کا شعور ہوتا ہے۔

اس کی وضاحت کے لیے ہم یہ تمثیل پیش کرتے ہیں...... فرض کیجیے کہ مکان میں صرف دو ہی بعد ہیں اور ایسے دو بعدی آدمی کا تصور کیجیے جو کسی حوض کے پانی کی سطح پر سکونت پذیر ہو، اور جس کو صاف انہی مظاہر کا شعور ہو جو اس سطح پر واقع ہوتے ہیں۔ تیسرے بعد یعنی گہرائی کا وہ شعور نہیں رکھتا۔ بالفرض اگر پانی کی سطح ایک خاص شرع سے بلند ہو رہی ہو تو ایسا آدمی کیا مشاہدہ کرے گا؟ اب ہم ایک سیدھا نیزا لیتے ہیں اور اُسے پانی میں اس طرح گاڑ دیتے ہیں کہ اُس کا آدھا حصہ پانی کے اندر اور آدھا باہر رہے۔ گویا ہم نے تیسرے بعد یعنی گہرائی میں نیزا گاڑ دیا۔ اب چونکہ دیکھنے والا آدمی دو بعدی (2d) ہے۔ اس لیے اُسے پانی کی سطح پر صرف وہ گول دائرہ ہی نظر آئے گا جو نیزے کے گردا گرد بن گیا۔ جوں جوں پانی کی سطح بلند ہوتی رہے گی دائرہ قائم رہے گا اور ایسی کوئی تبدیلی نہ ہوگی جو دو بعدی فرد کو نظر آئے۔ ہم پانی کی بلندی کو زمانے کی حرکت کے مترادف فرض کرتے ہیں۔ ایسے آدمی کو جو دو بعدی (2d) شعور رکھتا ہو پانی کی سطح کی بلندی کا علم نہیں ہو سکتا۔ پانی کی سطح تیسرے بعد میں بڑھ رہی ہے جو عمق ہے لیکن اگر نیزا جو بالکل سیدھا کھڑا تھا ذرا سا ٹیڑھا کر دیا جائے تو وہ آدمی فوراً بول اٹھے گا کہ پانی کا وہ دائرہ لمبوترا ہو کر حرکت کرنے لگا ہے۔ کیونکہ نیزا اور پانی کی

Marfat.com

سطح کا وہ مقام جہاں دونوں ایک دوسرے کو قطع کرتے ہیں۔ حرکت کے ساتھ ساتھ مسلسل بدلتا جائے گا۔ اب اُس دو بعدی شخص کو پانی کی سطح پر بننے والا دائرہ گول کی بجائے بیضوی دکھائی دینے لگے گا اور اس کو لامحالہ اس نتیجے پر پہنچنا پڑے گا کہ حرکت کی حالت میں اشیاء کی شکل بدل جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ یہ فیصلہ بھی کرے گا کہ متحرک نیزے سے وقت کا احساس نہیں ہوتا۔ جیسا کہ سیدھے نیزے سے ہوتا تھا۔ یعنی اگر اُس نیزے میں بھی کوئی آدمی رہتا ہے جو وقت کو نیزے میں پانی چڑھنے کی رفتار سے پیائش کرتا ہے تو اُس کے اور دو بعدی آدمی کے وقتوں میں فرق ہوگا۔

وقت بعد رابع:

اس تمثیل کو زیادہ طول دینے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ بعض ناظرین اسے سمجھ نہ پائیں اور محض لغویات خیال کرنے لگیں لیکن علمی معاملات میں کبھی کسی شے کو لغو نہیں کہنا چاہیے۔ بشرطیکہ وہ موضوع سے متعلق ہو۔ ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ زمانے کے ساتھ جو نسبت ہم کو ہے وہی نسبت اُس دو بعدی آدمی کو پانی کی سطح کی بلندی سے ہے۔ تب ہم اپنے مفروضہ سے نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔ اگر مشاہداتِ فطرت ان نتائج کی تصدیق کریں تو ہمارا مفروضہ درست ہوگا۔ فرض کریں ہماری رفتار اُس چوتھے بعد میں روشنی کی رفتار کے برابر ہے تو اس مفروضہ سے اخذ کردہ نتائج کی تصدیق مشاہدہ سے ہو جاتی ہے۔ ایک متحرک کرہ ایک دیکھنے والے کو بیضوی نظر آنے لگتا ہے۔ بالکل ویسے جیسے دو بعدی آدمی کو دائرہ بیضوی معلوم ہوا تھا۔

منکاوسکی نے جو ریاضی شرح لکھی ہے اس میں زمان (Time) کو ''خیالی'' مانا ہے جس طرح جبر و مقابلہ میں مقداریں خیالی تصور کی جاتی ہیں۔ اسی وجہ سے اگر کوئی شخص ہماری سطح آبی اور نیزہ والی تمثیل کو طول دے تو وہ ایسے نتائج پر پہنچے گا جو آئین

Marfat.com

سٹائن کے مشاہدات سے کسی قدر مختلف ہوں گے۔ اس کے باوجود یہ تمثیل ہمارے سامنے اضافیت کا اصل نقشہ ایک حد تک پیش کر دیتی ہے۔

اگر آئین سٹائن کے زمانی مکان کو ہم ایک طبیعیاتی حقیقت تسلیم کر لیں تو نہایت حیرت زا اور دلفریب تجربے ایجاد کیے جا سکتے ہیں۔ مگر افسوس کہ ایسے تجربات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے فی الحال مطلوبہ سامان موجود نہیں ہے۔ مثلاً اگر ایک شخص کو ایسی رفتار سے حرکت دی جائے جو روشنی کی رفتار کے مساوی ہو یا اس کے قریب قریب ہو (بشرطیکہ وہ ایسی رفتار کے ہوتے ہوئے زندہ بھی رہ سکے) تو اس کے علائق زمانی میں بہت بڑی تبدیلی واقع ہو جائے گی یعنی جو ہمارے لیے ''مستقبل'' ہے وہ اس کے لیے ''حال'' ہو جائے گا یا ہمارا حال اُس کے لیے مستقبل ہو جائے گا۔ (واقعہ معراج) نیز وہ ہمارے لحاظ سے ایک ہی وقت میں مختلف جگہوں پر موجود ہو سکتا ہے۔ مشہور انگریز افسانہ نویس ''ایچ جی ویلز'' نے ایک افسانہ لکھا ہے جس کا نام ہے...... ''وقت کی مشین'' اس میں ایک آدمی ایک ایسی مشین ایجاد کرتا ہے جس کے ذریعے وہ اپنی خواہش کے مطابق وقت میں سفر کر سکتا ہے۔ اس نظریہ کی رو سے یہ انوکھا افسانہ محض افسانہ نہیں رہتا بلکہ عالم تخیل سے نکل کر طبیعیاتی ممکنات میں آ جاتا ہے۔

نظریہء اضافیت کی ان عجیب و غریب پیچیدگیوں میں الجھنا کچھ زیادہ مفید نہیں۔ اس کی وجہ سے نظریہ کی حقیقی علمی وقعت کا اندازہ نہیں ہو سکے گا۔ یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ اس نظریہ کے بموجب اقلیدسی ہندسہ بالکل غلط قرار پاتا ہے۔ اگرچہ یہ ضرور ہے کہ اس ہندسہ میں زمان، طول اور کمیت مطلق کے وجود کو تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ اس نظریہ سے نیوٹن کا نظریہء تجاذب باطل قرار پاتا ہے یا یہ کہ زمانے کا جو مفہوم ہم نے قائم کر رکھا ہے اس کو یہ غلط ٹھہراتا ہے۔ اقلیدسی ہندسہ (جیومیٹری) اور نیوٹنی

Marfat.com

حرکیات اپنے اپنے موضوع مقاصد کو سر انجام دیتے ہیں لیکن وہ مکمل طور پر صادق نہیں آتے۔ اس نظریہ کے بارے میں خیال ہے کہ وہ ہر صورت میں صادق آتا ہے۔ ان مسئلوں میں جن میں رفتاروں کی مقدار عظیم ہو تو نظریہء اضافیت ان اثرات کا پتہ بتاتا ہے جو فطرت میں فی الحقیقت ظہور پذیر ہیں لیکن نیوٹنی حرکیات سے ان کا پتہ نہیں چلتا۔

تمام طبعیات دان اس نظریہ پر ایمان نہیں لائے ہیں اور نہ ابھی تک اکثر ماہرین فن نے اسے قبول کیا ہے لیکن اگر کبھی اس کو مقبولیت عام حاصل ہوگئی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دوسرے کامیاب طبیعی نظریات کی طرح اس نظریہ میں بھی نئے نئے مظاہر کی پیشینگوئی کرنے کی طاقت نظر آئے گی۔ اس طرح یہ نظریہ تمام علوم طبیعیہ پر صادق آتا ہے۔ اس میں زیادہ تر زمان و مکاں اور مادہ کی بحث ہے اور ضمنی طور پر روشنی اور برق کا بیان بھی آ جاتا ہے۔ اس کے ذریعے نیوٹن اور میکسویل دونوں کے کارنامے متحد ہو جاتے ہیں۔

یہ بات مشہور ہے کہ نیوٹن نے سیب کو درخت سے زمین پر گرتے ہوئے دیکھ کر اس سے سورج، چاند اور ستاروں کے طلوع و غروب کا اندازہ لگایا۔ اگر یہ خبر صحیح ہے تو آئین سٹائن نے ایک آدمی کو ایک بلند عمارت سے گرتے دیکھا اور بعد میں اُس سے گرتے وقت کی حالت کے احساسات کے بارے میں سوال کیا۔ اس طرح اُس نے نیوٹن سے بھی ایک قدم آگے بڑھا دیا۔ ہر وہ شے جس کی توجیہ نیوٹن کر سکتا تھا آئین سٹائن کے یہاں بھی ممکن ہے۔ اس کے علاوہ نیوٹن کے ماننے والے مریخ کے مدار کی ذرا سی تبدیلی کی توجیہ نہیں کر سکتے تھے، آین سٹائن کر سکتا ہے۔ روشنی کے راستے میں جو انحراف ہوتا ہے اور جس سے اب تک ہم بے خبر تھے آئین سٹائن نے ہی ہماری، اس کی طرف توجہ دلائی۔ قطع نظر اس امر کے یہ نظریہ زمان و مکاں و تجاذب جو آئین سٹائن

Marfat.com

نے ایجاد کیا ہے عام طریقے سے قبول کیا جائے یا نہ کیا جائے ہم اس جودتِ ذہنی پر تعجب کیے بغیر نہیں رہ سکتے جس نے ایک چھت سے گرتے ہوئے آدمی اور اُس روشنی کے درمیان جو ۱۹۱۹ء میں سورج کی طرف گرتی دکھائی دی تھی......ایک علاقہ ثابت کر دکھایا۔

یہ خبر دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ جاپان کے علماء نے پروفیسر آئین سٹائن کو مدعو کیا ہے اور اُس نے اس دعوت کو قبول بھی کر لیا ہے۔ ایک جاپانی عالم نے جو اس نظریہ کو باطل قرار دینا چاہتا ہے......اُس سے مناظرہ کا بھی ارادہ کیا ہے۔ یہ مناظرہ کبھی ہوا تو دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

Marfat.com

اختتامیہ

تمام تر بحثوں سے بالآخر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس دنیا میں جو کچھ ہمیں دکھائی دیتا ہے، اِن مظاہر کی اوٹ (حجاب) میں ایک ایسی زندہ و جاوید ہستی موجود ہے جو ہمہ وقت اپنی کھلی ہوئی آنکھوں اور کانوں (سمیع و بصیر) سے ہمارا مشاہدہ کر رہی ہے۔ ہماری زندگی کا کوئی لمحہ اُس ہستی کے دائرہء اختیار سے باہر نہیں۔ ہم اُس ذات مطلق کو تلاش کر کے اُس تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں اور یہ صرف احساس کے راستے ممکن ہے، کیونکہ آخری اور حتمی حقیقت کے طور پر ہمارے پاس صرف ''احساس'' ہے جو ہمارے ''قلب'' (Mind) میں پیدا ہوتا ہے۔

جن لوگوں کو اس حقیقت کا پتہ چل گیا انھوں نے سب اطراف سے ذہن ہٹا کر اپنے قلب کی پرورش اور نشو و نما کو مقصد بنا لیا کیونکہ قلب کی اطلاعات تمام اطلاعات سے زیادہ پائیدار اور قوی ثابت ہوتی ہیں۔ وہی لوگ ختم نبوت سے پہلے انبیاء علیہم السلام کہلائے اور بعد میں صوفیاء۔

قلب کی پرورش، مسلسل عمل اور مشق سے ممکن ہے۔ معاشرے کے بیچوں بیچ رہتے ہوئے کام کرنا جو انسانیت کی فلاح کے لیے ہو، نیکی کہلاتا ہے۔ چاہے اس نیکی کے لیے دنیاوی زندگی کا کتنا ہی نقصان کیوں نہ

Marfat.com

برداشت کرنا پڑے۔ اور یہ سب کچھ محض اس لیے کرنا ہے کہ ہمارا احساس بلند ہو جائے۔ احساس کی بلندی کے ساتھ ہی ''تصور خدا'' بلند ترین ہو جاتا ہے۔ جس کا خدا جتنا بڑا ہے، وہ اتنا بڑا انسان ہے اور جس کا خدا جتنا چھوٹا ہے، وہ اتنا ہی چھوٹا انسان ہے۔

خدا تو بہت بڑا ہے، اتنا کہ ہم کبھی اس کی ذات کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ لیکن احساس کی پرورش ایک ایسی چیز ہے جو ہمارے ''قلب'' کو وہ آنکھیں عطا کر دیتی ہے، جس سے ہم خدا کی تجلی دیکھ سکتے ہیں، لیکن رویت کے اس عمل میں زمان و مکان کے ظاہری پیمانوں کو مطلق دخل نہیں۔

الغرض حضرت علامہ اقبالؒ کے افکار کی روشنی میں دیکھا جائے تو تصوف، سائنس اور قرآن سے ثابت ہے۔

Marfat.com

Marfat.com